

فہرست میں شعور کا بیان

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۴	اردو ناولٹیکہ پیریا		خطبات
۱۸۰	زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ	۱	خطبہ صدارت جس میں شیعہ نعتی اردو کا
۱۹۳	ہوم ننگو بچے (ملکی زبان)		بنا بساط کچھ شاعری کا نفرین معقدہ پودہ
۱۹۹	انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا اثر	۱۹	بند دوستی میں ہندوستانی
۲۰۱	نجین اردو سے معنی کے چند سوالات	۵۵	خطبہ صدارت ہندوستانی ایک وی
	کا جواب	۱۰۰	سجاری زبان کا نام
۲۲۶	ہاشمی کا مجموعہ مرثیہ	۱۱۳	سجاری زبان ہسین صدیقی میں
۲۴۲	اردو کیونکر پیدا ہوئی		مقالات
۲۵۹	بہار کے فوجیان اور ادب		اکبر کا ظرفیہ کا نام
	کی خدمت	۱۶۶	

فہرستِ کاتبین نقوشِ سلیمانی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۷۴	اردو انسائیکلو پیڈیا،		خطبات
۱۸۰	زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ،	۱	خطبہ صدارت اجلاس شعبہ ترقی اردو آل
۱۹۳	ہوم لنگویج (ملکی زبان)		انڈیا مسلم لیجیشن کا نفرس منعقدہ پونہ،
۱۹۹	انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ	۱۹	ہندوستان میں ہندوستانی،
۲۱۱	انجمن اردو سوسائٹی کے چند سوال	۷۷	خطبہ صدارت ہندوستانی ایکادیمی،
	کا جواب،	۱۰۰	ہندی زبان کا نام،
۲۲۶	ہاشمی کا مجموعہ مرثی،	۱۱۳	ہندی زبان بیسویں صدی میں،
۲۴۲	اردو کی نوک پیدائش،	✓	
۲۵۹	بہار کے نوجوان اور ادب		مقالات
	کی خدمت،	۱۶۲	اکبر کا ظرفیہ کلام،

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۹۴	کلامِ شاد،	۲۷۰	سفرِ گجرات کی چند یادگارین،
۴۰۱	کلیاتِ عشق،	۲۸۹	بعض پرانے نقون کی نئی تحقیق (۱)
۴۲۶	شعلہ طور،	۳۱۳	بعض پرانے نقون کی نئی تحقیق (۲)
۴۳۲	خمتان،	۳۲۹	تہنید،
۴۴۴	مدرسِ حالی،	۳۵۰	ہماری زبان،
۴۵۴	خیابان،	۳۶۰	جواہرِ الاسرار میں کبیر کی بات چیت،
۴۶۳	عطرِ سخن،		مقدمات
۴۶۹	”حقیقتِ علمی شاعری“	۳۶۴	مکاتیبِ شبلی،
الف، ب	استدراک،	۳۷۵	مکاتیبِ مدنی،
		۳۹۱	گلستانِ امجد،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

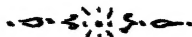
دیباچہ

اُجکل ملک میں زبان کے مسئلہ سے جس دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جو تقریریں میری زبان سے اور جو تحریریں میرے قلم سے نکلی ہیں ان کو ایک جگہ شائع کر دیا جائے، تاکہ لوگوں کو اس مسئلہ کے ہر پہلو کے سمجھنے میں مدد ملے، بعد کو جب مجموعہ چھپنے لگا تو مجموعہ کے خیال سے کچھ اور چیزیں بھی اس میں بڑھادی گئیں، امید ہے کہ یہ اوراق دلچسپی سے پڑھے جائیں گے،

سید سلیمان ندوی

۲۷ اپریل ۱۹۳۹ء

دارالمصنفین غنیمت گڑھ



خطبہ صدر اجلان شیعہ ترقی اُردو آل انیاسلم انجمن تفسیر

مینقذہ پونا تالیخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء

(منقول از رودادہ انفس نکوریا تہ اجلاس ۱۹۱۵ء پونا)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

رَبِّ السَّامٰوٰتِ السَّبعِیْنَ وَرَبِّ اَرْضِ الْعِزِّ وَرَبِّ عَرْشِ الْمَلٰٓئِکَہِ
یَفْقَهُوْا اَقْرَبَ لٰی

کَلَّمَ فِی مَوْتُ الْکَلْبَاءِ | حضرات! آج مجھے ہندوستان کی ایک عظیم انسان تعلیمی مجلس کے ایک علمی
شعبہ کی صدارت کی عزت ملی ہے، یہ بظاہر میرے لئے مسرت کا دیا ہے تھا، لیکن آہ اس دنیا
میں بدبختی اور شومی نصیب کے کتنے ابواب اور فصول ہیں، اب سے صرف دو تیرہ سال پہلے اس اعزاز
کے لئے کئی اکابر کے نام پیش کئے جاسکتے تھے، حضرت الاستاذ علامہ شبلی شمس العلماء مولانا حالی، خواجہ
غلام ثقلین ہامری زبان کے وہ ارباب علم اور ہندوستان کے وہ سحر نگار تھے جنکا وجود ہمیشہ قوموں
اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوتا ہے، لیکن بد نصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے دامن کا ایک ایک موتی

اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک جواہر ہم سے کھو چکا ہے، اور اسلامی ہند کے غلط فہم میں فضل و کمال کا کوئی چراغ نظر نہیں آتا، مع
افسوس کر قبیلہ مجنون کسے ناند،

آج کی صحبت کی نشہ رینی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم میں فضل و کمال کی کمی کتنی ہے، اور آپا
علم و ہنر کا قحط کمان تک ہے، نظامیہ بغداد کے ایک عالم نے سب سے پہلی دفعہ جب درس کے منبر پر
قدم رکھا تو کہا،

خَلَّتِ الدِّيارُ فسدت غيرةُ مسودٍ ومن البلاء تقصّدي بالسود

(مک خالی ہو گیا اور بن بزرگ کے بغیر بزرگ بن گیا، اور میرا اس بزرگی کے ساتھ کتنا ہونا ایک قسم کی مصیبت ہے)

آج بھی وہی موقع ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور کہا جائے کہ

کبرئی موت الکبراء بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنایا ہے

پہل آپ لوگوں کی اس عزت بخشی کا ممنون ہوں،

اُردو | حضرات! اردو زبان کی تاریخ سید انشا کے زمانہ سے لے کر شمس العلما، آزاد کے عہد تک

بار بار اتنی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اب وہ پرانی کمائی بنگلی ہے، پھر بھی میں اس پر ایک دوسری
حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں،

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کے گھرانے، سآمی، تورانی، ایرانی، تین مستقل خاندانوں میں

تین مستقل زبانوں میں بٹے تھے، اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملانا اور جوڑنا ہے، اس کا تمدن، مہر

وشام و عجم اور روم و یونان کے تمدنوں کا خلاصہ ہے، اس کے علوم و فنون، ہندوستان، بابل

فارس، یونان اور اسکندریہ کے تجربہ خاں اور درگاہوں کا عطر ہیں، اس کی نسل تو لڑائی، آریا
اور سامی قوموں کا مجموعہ ہے، اس کی زبان میں سنسکرت، پہلوی، قبطی، سریانی، لاطینی اور یونانی
الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ ہے، اسلام کی دنیا میں نسل و وطن اور زبان کی کوئی تفریق نہیں جس
طرح دنیا کا ہر گوشہ اس کا وطن ہے، دنیا کا ہر لغت اس کی زبان ہے،

عرب کے بادیہ نشین جب فاتحانہ پرچم کے سایہ میں عرب کے ریگستان سے باہر نکلے تو جس طرح
ایران کا فرش کاویانی چین کی دیوار مصر کے اہرام، افریقہ کے صحارا اور اندلس کا دریاؤں کو
سیاہی زور و قوت کو کونے سے عاجز تھا اسی طرح اُن کی عربی زبان کے معنوی استیلا و اقتدار
سے بھی بچاؤ ان کے لیے ناممکن تھا، ایران کی پہلوی، شام کی سریانی، مصر کی قبطی، افریقہ کی بربری
اور اندلس کی اسپینی زبانیں دفعہ پرودہ عالم سے گم تھیں، ایوان حکومت عرب سپہ سالاروں کے
ماتحت تھے، تو معبدوں اور کلیساؤں کی درگاہیں عربوں کے ادبیات و علوم کی سرپرستی
تھیں، سندھ کے کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا چکر لاتی
کر رہی تھی، اور وہ قرآن کی زبان تھی،

ان ملکوں کی دینی زبانوں کا یہ تغیر اور انقلاب عربوں کی زبردستی اور حکومت کے
زور کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ خود عربی زبان کی سہولت، اس کے الفاظ کی ثروت، اُس کے علوم کی کثرت
کو اس میں دخل تھا، عبدالملک کے زمانہ تک اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی ملکی ہی زبان
وہاں کی سرکاری اور دفتری زبان تھی، ایران کی پہلوی زبان گومٹ گئی لیکن عربی آمیز فارسی
نے دفعہ ظہور کیا اور تو بغداد کا خلیفہ اعظم مامون الرشید اس کا مرتبی بن گیا، پروفیسر براؤن نے

طریری ہسٹری آف پریشیا میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ پہلی زبان و خط کے بدل جانے اور استعمال سے جاتے رہنے کا اصلی سبب عربی زبان و خط کی شیرینی اور سہولت تھی، تاہم زبان نے اس زور شور سے اسلام پر حملہ کیا کہ خوارزم سے لیکر بغداد تک صرف خاک کا ڈھیر ہو گیا، لیکن ان کی ترکی و تاتاری زبانیں عربی کا مقابلہ نہ کر سکیں، اور آخر فاتح کو مقتوح کے آگے جھک جانا پڑا، اور اب ترکی و تاتاری زبانوں کے حُسن و رونق کا سبب صرف عربی الفاظ کا جائزہ عاریت ہے، عرب جس ملک میں گئے یا تو وہاں کی زبان بدل گئی، اور بدل نہ گئی تو ان کی زبان کے الفاظ نے ویسی ملکوں کے الفاظ سے مل جل کر ایک نئی زبان کا ہیوٹی تیار کر دیا، نئی فارسی نئی ترکی، نئی ملائی، نئی بربری، اور نئی ہندوستانی نے اسی طرح جنم لیا،

عرب و ہند کا تعلق اسلام سے بہت پہلے سے اور نہایت پرانا ہے، خاص کر عرب اور ہندوستان کے اس خطہ میں جہاں خوش قسمتی سے اس وقت ہم جمع ہیں، ہندوستان کی تمام مصنوعات اور پیداوار اپنی سواہل سے عرب کو اور عرب کی راہ سے یورپ تک پہنچتی تھی، اس بنا پر سائے اور خوشبودار چیزوں اور کپڑوں کے سنسکرت اور ہندی نام قدیم عربی زبان میں بھی دخل ہو گئے ہیں، زنجبیل، فلفل، نیلوفر، مشک، صندل، سنسکرت یا کم از کم ہندی ہی زبان کے الفاظ ہیں، مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے، اور یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اس حملہ کی ابتداء مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی ہے، اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظ و اقدم کے طویل پر سندھ پر قبضہ ہے، تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب مغرب و خیر

سلیقی بڑوں
کے اطراف

سے گذر کر ہالیہ کے پانچ دریاؤں میں آکر مل گیا، یہ اُردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہی
ہندوستان کی زمانہ میں بھی ایک نہ تھا اور ملکہ نظر نہیں آتا، یہاں کا ہر صوبہ ایک
نئی راجدھانی، ایک نئی زبان، ایک الگ تہذیب یعنی ایک ایک نیا ملک تھا، جو اپنے لئے
مخصوص خصوصیات رکھتا تھا، سنسکرت زبان یہاں کی مشترک مقدس زبان ضرور نظر آتی ہے لیکن
تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ یہ کسی زمانہ میں تمام ہندوستان کی مشترک گفتگو کی زبان تھی ہندوستان
کا میدان داخلی اقوام کے علاوہ خارجی حملہ آور قوموں کا بھی ہمیشہ جو لانگھا رہا ہے پستہیں یعنی ایک
تورانی نسل شاخ، پھر آریں، پھر یونانی، پھر عرب، ترک، پٹھان، ہفل، اقوام یکے با دیگرے ہندو
میں داخل ہوئے، سولہویں صدی میں اہل یورپ کا یہاں کے سواہل پر گذر ہوا جن میں سب سے
پیشرو ترکمانی اور ان کے بعد فرنگ اور سب سے آخرین انگریز تھے، ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں
مختلف قوموں مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے، کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان
پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اُردو ہے،

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُردو زبان صرف فارسی، عربی، سنسکرت، اور بھاشا
کا مجموعہ ہے، حالانکہ ترکی اور ترکمانی الفاظ بھی اس میں کم نہیں، چنانچہ قدیم شاہانہ شان و شکوہ
اور جنگی اصطلاحات و آلات کے متعلق اکثر الفاظ ترکی سے آئے ہیں، جو محمد شاہ کے زمانہ تک اہل
شاہی کی زبان تھی، اسی طرح ابتدائی یورپین چیرمین جو ہندوستان میں آئے جن کی اصل انگریزی

۱۔ اُردو کی تاریخ کی نسبت یہ چند اشارے ۲۲ برس پہلے کئے گئے تھے، اُردو کی تاریخ کے محققوں کی کوششوں
سے آج پوری طرح وہ ثابت ہو گئی ہے،
سید سلیمان، ۱۹ اگست ۱۹۵۷ء

میں موجود نہیں وہ اکثر پرنگالی ہیں، مثلاً نیلام، یا پون جس کو ڈبل روٹی کہتے ہیں جسکو غلطی سے کبھی پاؤ روٹی سمجھا جاتا ہے کہ شاید وہ روٹی پاؤ بھر کٹے کی مٹی ہو بعض شستہ لوگ جو اپنی فارسی دانی کا دینا چاہتے ہیں وہ نان پیسہ کہتے ہیں، کہ یہ روٹی کی طرح نرم ہوتی ہے، حالانکہ یہ پون لفظ جو پرنگالی میں روٹی کو کہتے ہیں بہر حال اس تفصیل سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو زبان تنہا کسی قوم کی زبان نہیں ہے اس میں ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانوں کا ذخیرہ ہے اور اس لئے اس کی ملکیت کا تمام باشندگان ہند بجا طور سے دعویٰ کر سکتے ہیں، اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے جس میں پنجابی بولنے والا بنگالی سے، اور مرہٹی بولنے والا گجراتی سب سے تامل اظہار مطلب کر سکتا ہے،

ہندوستان میں تقریباً تین سو بولیاں اور زبانیں ہیں جو پہاڑیوں اور صحراؤں کے چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد قبائل سے لیکر بڑی بڑی قوموں پر محیط ہیں، اگر ہندوستان ایک ملک بننا چاہتا ہے اور اس کے قومی تعلیمی اور سیاسی خیالات کو بحیثیت ایک قوم اور ایک ملک کے ترقی کرنا ہے تو ایک مشترک زبان کے بغیر چارہ نہیں،

اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہیں، بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے، اور اس کا پیدا ہونا ضرورۃً اور مجبوراً تھا، مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے اس پر دوسو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہو گئی، اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غریلوں غلیوں اور غفلتوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی چند کوئی کی تاریخ جو پر تھی راج کے حال میں تھی

اور جس کی تصنیف کا زمانہ غریزوں کا عہد بتایا جاتا ہے، عربی اور فارسی الفاظ سے مالا مال ہے۔ اس کے بعد امیر خسرو کی زبان میں ہندی الفاظ اور کبیر داس کی زبان میں جو سکندر لودی کے عہد میں تھا، عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش اردو کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتی ہے، رفتہ رفتہ یہ آمیزش بڑھتی گئی، اور فوجی معسکرون میں جو ہندوستان کی مختلف اقوام کا سب سے زیادہ مخلوط مجموعہ تھا، یہ بولی زبان بن گئی، اور اسی لئے عام لوگ اس کو اردو کہنے لگے، اردو ترکی زبان میں منعکس (فوجی پڑاؤ) کو کہتے ہیں اسی بنا پر ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا، میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے، اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اس کا نام ہندوستانی ہے،

میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی مشترک زبان کا یہی مخلوط اقوام کے میل جول کے موقع پیدا ہونا قوموں کے میل جول کی تاریخ کا مسئلہ نتیجہ ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے جب ہم خاص اس سرزمین پر غور کرتے ہیں جہاں ہم اس وقت اکٹھے ہیں شمالی ہندوستان اگر ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شامع عام رہا ہے، تو جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو انہوں نے قوموں کیلئے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لئے بجا رہا ہے، نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی ہندوستان سے اپنی پیش رو قوم کو ڈھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لئے جاپناہ بنی ہیں، یہی سبب ہے

یہ نظریہ کہ یہ کتاب غریزوں کے زمانہ میں لکھی گئی، اب قطعی طور سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہان کے عہد سے پہلے نہیں لکھی گئی، اس کتاب پر حافظہ محمود خاں شیرانی کے فاضلانہ تبصرے نے جو ادب کا برج میگزین میں چھپا ہے، اس بھید کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا ہے، سید لیان ندوی، ۱۹۳۷ء، اگست ۱۹۳۷ء

کہ آج جنوبی ہندوستان قدیم سے قدیم قوموں سے نیکر آخری دور جدید کی قوموں تک کا تماشہ خانہ اور جلوہ گاہ ہے، شمالی ہندوستان بین پشاور سے مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اُردو زبان کی مکمل ہے، گو بیچ بیچ میں پشتو، پنجابی اور بنگالی زبانیں بھی آڑے آجاتی ہیں، لیکن یہاں ہندی اور مدراس کے احاطہ میں ہر قومیں ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، تامل، ملنگو، انڈوی خدا جانے کتنی زبانیں ہیں، بین سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اُردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی، اور دکنی اور مراٹھ دکنی وغیرہ اُردو کے بچا یہاں سب سے پہلے پیدا ہوئے،

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اُردو ملک ہندوستان کی عالمگیر زبان کا نام ہے، اور اسی لئے ہندوستان کی تمام قوموں کو اس کی ترقی و اشاعت میں برابر کا حصہ لینا چاہئے اور اصل یہ ہے کہ خود ہندوستانی اقوام سے زیادہ انگلش گورنمنٹ اس نو زائیدہ بچہ کی تولیت کا حق سب سے زیادہ رکھتی ہے کہ اس کو بولی سے زبان تک پہنچانا اسی کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے لئے تھا، پھر سب سفر کی آسانی نے ہندوستان کے تمام دور و دراز صوبوں کو ایک ہی گھر کے چند صحن بنا دیئے ہیں، اسی بنا پر قومی تعصبات کے باوجود وہ ہندوستان کے کونے کونے اور گوشہ گوشہ میں اور سمجھی جانے لگی ہے، اور ہر روز اس کی ترقی کا قدم آگے ہے، یہاں تک کہ آج ایک مرہٹہ ملک میں، بین اُردو بول رہا ہوں، اور پورا مجمع ابھی طرح سا را مطلب آسانی سے سمجھ رہا ہے، بلکہ اس

لے دکھنی زبان کی نئی تحقیقات نے اس سے بھی مٹھال پہلے کا کھوج لگایا ہے، اور اس میں بایں برس عرضتہ دکن میں اردو شاعری کی تاریخ کا سراغ سیکڑوں سال آگے کو بڑھ گیا ہے، سید جان ندوی۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء

کے کناروں سے گذر کر جزیرہ برما اور سواہلِ عدن تک پہنچ چکی ہے،

اردو کے قواعد پہلے انگریزوں | اردو زبان اپنے قواعد و لغت کی تدوین میں سب سے زیادہ انگریزوں
نے لکھے یا کھولے کی ممنون ہے، کیونکہ کسی زبان کے سکھنے کی وقت سب سے پہلے غیر ملکی ہی

محسوس کرتے ہیں، انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی، عربی زبان کے قواعد
اور لغت کی تالیف سب سے پہلے خنش بیہویہ صمعی، ابوعلی فارسی وغیرہ نے کی، جو سب کے سب عجیب تھے
اس بنا پر اگر فائن صاحب نے اردو کی سب سے پہلی ڈکشنری لکھی، یا جان گلگرسٹ صاحب نے ہندوستانی
قواعد کی کتابیں یا ڈی ٹامی نے اردو ادبیات کی سب سے پہلی علمی تاریخ مرتب
کی تو تعجب کی بات نہیں،

سادہ اردو | عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کو تکلفات اور تصنیفات سے بری کر کے

علمی و تحریری زبان بنانا انگریزوں کی رہنمائی سے ہوا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو سادہ اور سب سے تکلف
تحریری زبان بنانے کا فخر امام احمد شاہ ولی اللہ کے خالو دہلی کی قسمت میں تھا مولانا سخیل ^{۱۱۹۳}ؒ

۱۲۴۴ھ کی زبان جو تقریرۃ الایمان میں نظر آتی ہے، آج بھی فصاحت اور زبان کی سادگی کا

بہترین نمونہ ہی، شاہ عبدالحق اور صاحب کی موضح القرآن بھی بیان کی صفائی میں کم نہیں، اس کے

بعد مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کے خطوط کی زبان ہے، جو غالب کے بقائے نام کا ان کے اردو

اور فارسی دیوانوں سے زیادہ محفوظ ذریعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا

حقیقی مصنف جس نے زبان کو ہر قسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی، اور اخلاقی مباحث و مضامین کے

قابل بنایا، سرسید کی ذات تھی، اور اس کے بعد بہت سے دوسرے ہندو اور مسلمان مصنفوں

کا درجہ ہے،

گئی زبان | اردو زبان چونکہ قومی نہیں بلکہ ملکی زبان ہے، اس لئے اس کی تحریری ترقی و اشاعت
 میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا برابر کا حصہ رہا ہے، تاہم انیسویں صدی کے اختتام پر بعض
 نا فہم حکام کی بدولت اردو اور ہندی کا ناگوار تقصیم پیدا ہوا، اور اسی کے لئے ۱۹۰۲ء میں انجمن
 ترقی اردو کی بنیاد ڈالی گئی کہ زبان اردو کے حقوق کی حفاظت ہو سکے، اردو زبان ہندوستان
 کے ہر صوبہ میں ایک حرفیت مقابل سمجھی جاتی ہے، پنجاب میں اس کو پنجابی سے مقابلہ، سندھ
 اور بہار میں ایک بے معنی نام ہندی زبان سے اڑیسہ میں اڑیا زبان اس کی حرفیت، ہونڈی
 میں مڑٹی، سندھی، گجراتی اور کٹھری چار پہلو انوں سے اس کا معرکہ ہے، مدراس میں تامل، تملنگو
 اور آرومی سے وہ دوچار ہے، تاہم دلی کے قلعہ معلیٰ کا پہلو ان پنجاب کے شیر کو زیر کر چکا ہے، ہندی
 زبان اس سے جدا نہ تھی ایک ہی حقیقت کے دو نام تھے، اب اصل معرکہ گاہ بھٹی اور مدراس
 کے سوال اور پہاڑیان ہیں، لیکن یہاں بھی وہ بول چال کی حیثیت سے نہایت تیزی اور
 سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے، ایک بڑا سوال یہاں کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں
 میں اس کا داخلہ تھا اور احمد علیہ کہ چند سال ہوئے یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا اور وہ مدراس اور بھٹی
 کی یونیورسٹیوں میں اختیاری زبان کی حیثیت سے قبول کجا چکی، لیکن اب بھی حقیقت میں
 مشکلات کا پورا اہل نہیں ہوا ہے،

قومی زبان | حقیقی خواہش تو یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی تمام قوموں اور باشندوں کی
 مشترک زبان قرار دی جائے، اگر قبضہ بندی یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ تمام ہندو

کے مسلمانوں کی مشترک زبان بن جائے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو علمی، مذہبی، قومی ہمسایہ اور تعلیمی ہر حیثیت سے ایک متحد قوم کی حیثیت سے کام کرنا ہے، ہندوستان کی تمام اسلامی آبادیاں جو مختلف صوبوں میں رہتی ہیں، اور مختلف زبانیں بولتی ہیں، اگر مشترک زبان اختیار کریں تو ان کی متحدہ قومیت اپنی متحدہ جامعیت کے لئے کیا نئے پیش کرے گی صوبوں کی چھوٹی چھوٹی زبانیں اور بولیاں جہاں مسلمانوں کی ایک تعداد آباد ہے ان کے لئے مذہبی، علمی، تعلیمی سرمایہ مستقل طور پر مہیا نہیں کر سکتی ہیں، حالانکہ قومیت کی تعمیر کے لئے یہ اساس و بنیاد ہیں، اس بنا پر اس سے چار نہیں کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی علمی و مذہبی و تعلیمی ضروریات کے لئے ایک مشترک زبان قرار دی جائے،

تعلیمی زبان | لیکن سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ بنگال اور جنوبی ہند کے جن جن صوبوں میں مسلمان آباد ہیں، اردو کے علاوہ وہاں کی ایک ملکی زبان بھی ہے اور اصول حکومت اور آئین عدل کی رو سے گورنمنٹ نے ہر احاطہ کی سرکاری اور دفتری زبان کو اس احاطہ کی عام ملکی زبان قرار دیا ہے، جو کہیں بنگالی ہے کہیں مرہٹی ہے کہیں گجراتی ہے اور یہی وہاں کے سرکاری مدرسوں کی اہم ورنیکولر زبانیں ہیں اس حالت میں مسلمان لڑکے تنہا اردو لین تو سرکاری دفتر میں وہ کارآمد نہیں رہتے اور اس لئے وہاں ان کے لئے جگہ نہیں نکل سکتی، اور اگر نہیں لیتے تو وہ اپنی قومیت کو فنا کرتے ہیں اور اگر اردو اور دوسری دیسی زبان دونوں ساتھ لیں تو وہ اپنے مقابل کے عموطن طالب علموں کے مقابلہ میں کمزور رہتے ہیں، جنوبی ہندوستان میں اردو کو تعلیمی زبان قرار دینے میں اس وقت یہی سب سے بڑی دقت پیش آ رہی ہے پچھلے دنوں ہند

گورنمنٹ نے مسلمان ممبروں اور اردو کے حامیوں کی ایک کمیٹی ان مشکوٰۃ پر غور کرنے کیلئے مقرر کی تھی، نتیجہ بحث یہ تھا کہ تمام فنون مسلمانوں کو اسکو لون میں اردو کے ذریعہ سے سکھائے جائیں۔ اس تجویز پر تقریباً عمل شروع ہو چکا ہے، قصبات میں اردو مکاتب قائم کر دیئے گئے ہیں، اردو محققین کے پیدا کرنے کے لئے احمد آباد ٹریننگ کالج میں ایک اردو کلاس گورنمنٹ نے جاری کر دیا ہے، اردو مدارس کے لئے مسلمان انسپکٹر بھی مقرر ہیں، پھر بھی اُس وقت تک پوری کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک اردو کے لئے خاص ٹریننگ کالج گورنمنٹ قائم نہ کرے، ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہے لیکن جب غور کی نظر سے خود اردو کے علمی سرمایہ کو پرکھا جائے تو افسوس ہوگا کہ اتنے شور و غل کے بعد بھی ہم ابھی تک منزل مقصود سے بہت دور ہیں۔

طاؤس راز نقش و نگار سے کہتے خلق

تجہیں کند و انخل از پازشت خویش

ہماری علمی محتاجی | ملک کے علمی نقرو بے نوائی کا ماتم آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہے، علمی مذاق کی کمی کا یہ عالم ہے کہ برسوں گزر جاتے ہیں اور ملک میں کوئی اچھی تصنیف پیدا نہیں ہوتی اور اگر خوش قسمتی سے ایک آدھ کتاب نکل بھی آتی ہے تو ناقدری سے رولج نہیں پاتی، اردو زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان کی جاتی ہے، ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں میں وہ شاہی زبان تسلیم ہوتی ہے، پھر بھی ہندوستان کی دوسری صوبہ وار زبانوں کے مقابلہ میں ابھی اسکی جھولی کم مایہ ہے، اس کے پکچول میں اگر کچھ ہے تو شاعری اور افسانوں کے خرف ریزہ ہیں جن سے ایک عظیم انسان قوم کے لئے زندگی کا سامان میسر نہیں آسکتا، علوم و فنون

طرف، کیا اسلام کی کوئی جامع تاریخ موجود ہے،

قوموں کی ترقی صرف خیالات کی بلندی اور اصلاح پر منحصر ہے لیکن خیالات کا تغیر
والعلاپ کس کے ہاتھ میں ہے، صرف تصنیفات اور ملک کے علمی کارناموں کے ہاتھ میں، اس
بنا پر مسلمانوں کی ترقی کو ان کے لٹریچر کی ترقی پر منحصر سمجھنا چاہئے، ملک میں آج جا بجا اصلاحی
جلسیں قائم ہیں جو سال بسال اصلاحی تقریروں کا ایک انبار لیٹج پر لگا دیتی ہیں، لیکن یہ
پادر ہوا ہستی ان جنکا وجود صرف ہوا کی چند موجوں سے ہے کہیں کوئی پائدار مستقل اور مسلسل اثر قائم
رکھ سکتی ہیں، اگر ان کی نصف کوشش بھی مفید تصنیفات کی اشاعت میں صرف ہوتی تو ہم قوم
میں ایک پائدار اور مستحکم تاثیر کا وجود پاتے، ہر گھر میں ایک دائی اور غیر فانی خطیب موجود ہوتا
جو ہر خطہ قوم کو صحیح راستہ کی ہدایت کر سکتا،

مسلمانوں کی سعی و کوشش کو چالیس برس ہوئے، لیکن یہ سنکر افسوس ہوگا کہ مسلمانوں کی
چھل سالہ جدوجہد کے بعد اتنا سرمایہ بھی ابھی میسر نہ آسکا ہے جو تنہا ایک الماری کی زینت کا
بھی باعث ہو سکے لیکن اس وقت اور زیادہ افسوس ہوگا جب ہم الماری کے ایک ایک
خانہ کو کھول کر دیکھیں گے کہ یہ پیداوار کی کس جنس سے بھرا ہے تو تاریخ، مذہب اور افسانہ کے
سوا ہر علم کا خانہ خالی بلکہ متعدد دو قین ہیں جو زمانہ کی اسی مدت میں اپنے خزانوں کو اتنا مال
کر چکی ہیں کہ اب ہر سکہ کے قرض خواہ ان ہی کی طرف رخ کر رہے ہیں،

مادری زبان تعلیمی تحریک کی چھل سالہ چنچ پکار نے تعلیم کا احساس پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے
کہ صحیح اور عمومی تعلیم ملکی زبان میں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، دنیا کے گذشتہ اور موجودہ مین

سینکڑوں توہین عروج و کمال تک پہنچ چکی ہیں لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیر ملکی زبان کی تعلیم قوموں کے عروج و ارتقاء کا باعث ہوئی ہے،

لیکن جب ملکی زبان میں تعلیم کا مسئلہ پیش آئیگا تو کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی لکسال ایسی نظر آئے گی جہاں سے تعلیمی نصاب کی کتابیں ڈھل ڈھل کر باہر آئیں گی، یہ مقصد اس وقت تک ممکن الحصول نہیں ہو سکتا جب تک ملک کی زبان میں کثرت سے علمی تصنیفات موجود نہ ہوں، ہائی ایجوکیشن اور اس کے لئے کورس کی تکمیل تو بڑی چیز ہے ابتدائی مکاتب جو مسلمانوں کے اہتمام میں اب تک ہیں کیا ان کی ضرورت کے مطابق بھی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے؟

اشخاص کا قحط | زمانہ جدید نے اپنے انقلاب کے ساتھ ہمیں چند نفوس عطا کئے تھے جنھوں نے اپنے امکان بھران میں سے بعض ضرورتوں کو ایک حد تک پورا کیا، میر سید، نذیر احمد، آزاد، حالی اور شبلی ہماری جدید نشاۃِ علیہ کے کارپرداز تھے، ان کی زندگی ہماری علمی ضرورتوں کی ضامن تھی لیکن موت کے باد صرصر کا ہاتھ جب ان چرخوں کو گول کر چکا ہے تو مستقبل کا منظر کس قدر جھل اور بھیاں ک نظر آتا ہے اور علمی کوششوں کے لئے پہلے سے کتنی زیادہ ضرورت بڑھ گئی ہے ان ضرورتوں کے پوری نہ ہونے کی زیادہ تر ذمہ دار صرف دو چیزیں ہیں، مصنفین کی پریشان حالی اور تصنیفی سلیقہ کی تعلیم کے لئے کسی تربیت گاہ کا نہ ہونا۔

حقیقی مصنف ہر زمانہ میں پریشان حال رہے ہیں، پھر بھی موجودہ زمانہ نے ان کو اور زیادہ

پریشان بنا رکھا ہے، ان شاذ و نادرستیوں کے لئے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف علم کی خدمت قرار دینا چاہتی ہیں، ہندوستان کی کئی ہزار میل کی وسعت میں امن و اطمینان کا ایک گوشہ بھی، غیر ملکی حکومت ملکی مصنفوں کی دستگیری کے لئے تیار نہیں، کوئی قومی کتب خانہ ہماری ضرورت کے مطابق ملک میں موجود نہیں، اُن کی علمی ہمانداری کے لئے کوئی فنڈ نہیں، جو ان کے دل و دماغ کو افکار سے فارغ کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مصنف جب ہرقلم کی کریڈن جھیل کر، اور ہر طرح کی مصیبتیں اٹھا کر جب اپنی تصنیف کے چند اجزاء فراہم کر لیتا ہے تو صدمہ دیتا ہے،

من تاش فروشِ دل صد پارہ خوشم،

لیکن افسوس کی انتہا نہیں ہوتی جب کرہ ارضی اور فضاۓ آسمانی سے ایک آواز بھی ان جگر پاروں کی خریداری کے لئے نہیں اُٹھتی،

اگلے مصنفوں کا کام کتاب کا آخری صفحہ لکھ کر ختم ہو جاتا تھا، شائقین خود اس کے نسخہ ہاتھ ہاتھ نقل کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہنچا دیتے تھے لیکن حال کے مصنفوں کا کام ختم تصنیف کے بعد شروع ہوتا ہے، کتاب کو کسی مطبع کے حوالے کرنا، کاپیوں کی تصحیح، پروفوں کی ترمیم، روپیہ کی کافی مقدار کی فراہمی، اور پھر رولویو اور اشتہار کے لئے اخباروں کی خوشامد اور چاپلوسی، اور ان ساری مصیبتوں کے بعد کتاب کے نسخوں کو بغل میں دبا دبا کر خریدنے کی تلاش میں گلی کوچہ کی آوارہ گردی، کیا یہ قابلِ رحم حالت اس انسانی طبقہ کے مناسب حال ہے، جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم اور صرف علم کیلئے ہونا چاہئے تھا،

پبلک کی ناقد رشتناسی کا جہان گلہ ہے خود مصنفوں کی نسبت بھی کچھ کہنے کی حاجت ہے

جسم کے مختلف اعضاء جس طرح اس کی زندگی کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، قوم کی مختلف کارکن جماعتیں بھی اسی طرح اس کی زندگی کے ضروری آلاتِ حیات ہیں، قوم کے اربابِ علم طبقہ کا کام جسم قومی کے لئے مقوی اور صحت بخش غذا کی فراہمی اور صحیح فون کی پیدائش ہے اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ یہ طبقہ مختلف علمی غذاؤں کے انتخاب کا سلیقہ، کیمیاوی ترکیب و تحلیل کا طریقہ، موقع اور ضرورت کا علم، اور غذاؤں کی قوت اور ضعف کا فیصلہ اُسی حیثیت سے کر سکے جس طرح ایک جسمانی ڈاکٹر مادی جسم کے لئے ہر روز کرتا ہے، گاؤں کا ہر جاہل عطائی اس رائق نہیں کہ وہ جسم کے صحیح پرداخت کے لئے اپنی مختصر دکان کی بوسیدہ جڑی بوٹیوں سے کوئی نسخہ ترتیب دے سکے، اسی طرح ہر شخص جو ہاتھ میں قلم پکڑ سکتا ہے، تصنیف کی بلند سطح پر جگہ پانے کے لائق نہیں،

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہندوستان کے بعض صوبے جس فرائضی کے ساتھ ایک طرف جسمانی امراض کے لئے عطائی شہتہاری نیچے ترتیب دے رہے ہیں، دوسری طرف علمی تندرستی کے لئے چھپے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر لگا رہے ہیں، اس پر نظر کرتے ہوئے کون اس ضرورت کا کہ اردو کی ایک باقاعدہ انجمن کی ضرورت ہو انکار کرے گا،

اردو کا سرمایہ زبان کو زبان بنانے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، اول اصولِ لغت کی

تدوین دوم علمی تصنیفات اور تیسرے تراجم، ہم کو ان میں سے ہر ایک پر غور کرنا چاہئے کہ ایک

کیا ہو چکا ہے،

تدوین اصولِ لغت | کسی زبان کو زبان بنانے کے لئے سب سے پہلے اس کے اصول و قواعد کی تدوین اور اس کے لئے قاموس و لغات اور ڈکشنریوں کی تالیف کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ایک جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں جان گلکرسٹ نے قواعد اردو لکھی اسی زمانہ میں سید انشانے بھی اردو کے قواعد لکھے، اُس وقت سے یکسر اس وقت تک ساری مدارس اور انگریز افسروں کی تعلیم کے لئے متعدد رسالے لکھے جا چکے ہیں میرضامن علی جلالپوری، غلام غلام آبادی، اور حافظ جلیل حسن جلیل کے رسالے بھی کام کے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ قابلِ قدر مولوی فتح محمد صاحب جالندھری اور مولوی عبدالحق صاحب کے قواعد اردو ہے، اور ان کتابوں سے ایک حد تک یہ کام تکمیل کو پہنچ رہا ہے، لیکن اردو کے لغت کا کام ابھی بہت پیچھے ہے، مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ کے سوا کوئی کامل کتاب اس فن میں نظر نہیں آتی، منشی امیر احمد صاحب کی امیر اللغات اب تک ناتمام ہے اور خدا جانے اس کی تکمیل کی کب تک نوبت آئے، بہر حال یہ چیز ابھی ہمارے التفات کی محتاج تصنیفات | اردو زبان کی مستقل ادبی تصنیفات سرسید، نواب محسن الملک، مولانا میر احمد، مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی اور مولوی عبدالرزاق صاحب کی تصنیفات اور انجمن ترقی اردو کی بعض شائع کی ہوئی کتابوں کے سوا اور کچھ نہیں جو ان کتابوں کی اگر ایک ایک فن کی حیثیت سے تقسیم کی جائے تو مذہب، تاریخ، اور شاعری کے سوا ہر فن صفر یا قریب صفر کے نظر آئے گا، تاریخ کا یہ حال ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اسلام کی جامع تاریخ جانی چاہئے، لیکن مولوی ابو الفضل عباسی کی تاریخ الاسلام کے علاوہ کوئی کتاب نہیں، یا پنجاب اور آگرہ کے بعض اشخاص

کی پریشان اور نامعتبر کتابیں ہیں، مسلمانوں کے نقطہ خیال سے محقق ماخذوں کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سیاسی اور علمی دونوں حیثیت سے نہایت ضروری ہے، مولوی ذکار اللہ صاحب مرحوم کی تاریخ ہندوستان، انگریزی فکر و دماغ کا بالکل عکس ہے،

علوم عقلیہ کا تذکرہ اردو تاریخ میں ایک افسوس ناک یاد ہے، علوم طبعی و ریاضی کا سب سے قدیم سلسلہ لکھنؤ کے شاہی دربار کے ایک دو مختصر رسالے ہیں، اور قدیم سلسلہ میں سب سے مفصل رسالے حیدرآباد کے نواب شمس الامراء کے مختلف علوم میں چھ رسالے ہیں، جدید کوششوں میں نا انصافی ہوگی اگر پنجاب یونیورسٹی کے ابتدائی طبعی رسالوں کا ذکر نہ کیا جائے، انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے مبادی سائنس اور فلسفہ جذبات دو کتابیں خاص اہمیت کے قابل ہیں، چند کتابوں کے سوا اردو کا دامن افسوس ہے کہ ہر قسم کے علم و فن سے خالی ہے،

ترجمہ | تراجم کے دو حصے ہیں، عربی زبان اور مغربی زبانیں، ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں عربی جاننے والے عالموں نے سب سے زیادہ خدمتیں انجام دی ہیں، قرآن پاک، احادیث اور فقہ کی کتابوں کے علاوہ تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابن خلکان، تاریخ اسد الغابہ وغیرہ کی کثیر تعداد اور ضخیم جلدیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں، مغربی زبانوں سے لیبا کی تمدن عرب، بجل کی ہسٹری آف سویٹیرین، ڈریسپر کی معرکہ مذہب و سائنس کے سوا اور کوئی ممتاز چیز ہم کو نظر نہیں آتی،

اردو زبان کی اس مختصر علمی پیمائش سے یہ ثابت ہو گا کہ ہم نے کس حد تک کام کیا ہے اور آگے ہم کو کیا کرنا ہے،

ہندون میں ہندوئی

یہ مقالہ نجمین اردو مجلے کی مسلم نیوسٹری علی گڑھ

میں ۱۹۳۳ء کو پڑھایا گیا

شکریہ یا شکوہ | عزیزانِ گرامی! آج مدت کے بعد آپ کے سامنے اظہارِ خیال کا موقع ہاتھ آیا ہے اس کے لئے آپ کے استاد و محترم رشید صدیقی صاحبِ کرم کے متقی یا شکایت کے مستوجبین کہ انھوں نے مجھے کچھ کہنے اور آپ کو اس کے سنے پر مجبور کیا، گو حضرت داعی کی طرف سے مضمون کی تخصیص نہیں تھی، لیکن ”اردو دوسے“ کی تقریب سے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مجلس کا موضوع ”ہندوستان میں ہندوستانی“ ہو،

ہندوستان | اس زمانہ میں جبکہ ہر ملک میں یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہل ملک کے ہندوستانی، ہاتھوں میں دیدیا جائے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں ایرانی اور مصر میں مصری

اور عراق میں عراقی کی طرح ”ہندوستان میں ہندوستانی“ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں صرف ہندوستانی ہوں، لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ ”ہندوستانی“ سے میری مراد

”ہندوستانی باشندے“ نہیں ”ہندوستانی بھاشا ہے، اور میری تقریر کا مقصد سیاسی سوراخ“
 نہیں بلکہ زبانِ سوراخ ہے“ آجکل بعض دوستوں نے ”پنجاب میں اردو“ اور ”دکن میں اردو“ لکھی
 اور ایک عزیز نے ”گجرات میں اردو“ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ”غزنیہ“ میں
 میں اردو کی داستان بھی کچھ سنائی جائے، خدا کے فضل سے اس میدان میں صوبہ متحدہ، پنجاب
 اور دکن کے علمائے ادب نے اتنی تحقیقات کی ہے کہ ”آبجیات“ کا قصہ اب افسانہ ہو کر رہ گیا ہے
 ہندوستان میں مسلمانوں | عزیزانِ اسلام! جس ملک میں ہم آپ آباد ہیں یہاں ہمارے اسلام
 کے برکات جن اغراض اور اسباب سے بھی آئے ہوں بہر حال اب ہم کو اسی دین میں
 رہنا اور اسی زمین میں جینا اور مرنے ہے، آئیے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے اس پر غور کریں کہ اس
 ملک کو ہمارے بزرگوں کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی،

ہندوستان میں وحدت | ہندوستان کو اسلام کے داخلہ سے جو علمی، تمدنی، تجارتی، صنعتی، تعمیراتی
 کا خیال، سیاسی فائدے پہنچے، ان کو یہاں شمار کرنا ناممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع

کے دائرہ کے اندر ہے لیکن یہاں صرف ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے، ہندوستان
 مسلمانوں کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بے شمار ملکوں اور ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا
 جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے تھے، یہاں مسلمانوں کی آمد کا وہ زمانہ تھا، جب
 اس ملک میں بودھ مت اور ویدک دھرم ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لیے دست
 گیریاں تھے، وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے بودھ مت کی سیاسی طاقت کو توڑا اور ویدک دھرم
 کو ترقی دے کر پورے ملک میں ایک مذہب کو اکثریت کا موقع عنایت کیا،

ہندوستان جیسا کہ اُس وقت کی تاریخوں سے ظاہر ہے سینکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں اور مملکتوں میں بٹا ہوا تھا، سلطان غزنوی کے فتوحات کے عہد میں اس ملک میں دو اسلامی اسماعیلی ریاستیں قائم تھیں ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ (یعنی بھکر واقع سندھ) میں ان کے علاوہ صوبہ سرحد میں شاہی حکومت تھی جس کا پایہ تخت دیہند تھا، کشمیر، اجمیر، دہلی، قنوج، مگدھ، بہار، بنگال، بکرت، مالوہ وغیرہ سینکڑوں ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے سے باہم دست و گریبان رہتی تھیں، مسلمانوں نے اگر ان ملکوں کو ایک ملک اور ان ریاستوں کو ایک سلطنت بنایا جس میں پشاور سے لیکر سورت تک ایک حکومت قائم تھی،

ہندوستان میں زبانوں کی کثرت | زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور میں، چنانچہ پائش، سانی کے محققین کے نزدیک سین آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروج ہیں ان بولیوں کو چھوڑ کر میان کی صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو بھی یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی،

مسلمانوں نے جب سے اس ملک میں قدم رکھا وہ یہاں کی زبانوں اور بولیوں کی کثرت کے شاکِ نظر آئے ۱۲۴۴ء میں جب کہ سندھ کی اسلامی عربی حکومت پر پونے دو سو برس گزر چکے تھے، منصورہ (بھکر واقع سندھ) میں ایک ایسا عاتی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف تھا، اور اس نے الرا (اور سندھ) کے راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاہ سندھ کی کسی بولی) میں کیا تھا، مسعودی جو ۳۴۴ھ میں ہندوستان آیا تھا، ہندوستان کی

لے عجائب الہند بزرگ بن شہر مارصت پیرس،

”ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے، ان کے مشہور رسم خط کا نام سندھ ماترک ہے، جو کشمیری طرف عموماً منسوب ہے، اور یہی بنارس میں جاری ہے اور یہی مدھ دیس یعنی صوبہ متوسطہ میں جو نوجو کے اطراف کا نام ہے، جس کو آریا ورت کہتے ہیں چلتا ہے، مالوہ کے حرود میں ایک خط جاری ہے جس کو ناگر کہتے ہیں، اور اسی کے بعد راند ناگری خط ہے، یعنی آدھا ناگر کیونکہ یہ ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے، اور یہ بھارت اور کچھ سندھ میں مروج ہے، اس کے بعد طواری خط ہے جو ’لوٹا یعنی جنوبی سندھ میں رائج ہے، اور کشمیری کرناٹک میں اور اتتری (دندھری) انتر (اندھم) میں، اور دراوڑی دراوڑیش میں اور لاری لارویش گجرات و کاٹھیاواڑ میں اور گوڑی (دبکا) پوربیش میں اور بیکٹک اور دپور میں اور یہ بودھوں کا خط ہے“ (ص ۸۲)

رسم خط کے اختلاف سے ہر صوبہ کی زبانوں کا اختلاف بھی ظاہر ہوتا ہے،

یہ تو عربوں کے بیانات تھے اب فارسی والوں کے لیجئے، امیر خسرو نے جو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں صدی کے شروع میں تھے، اپنی فتویٰ نہ پہلے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں گنائی ہیں، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، واقع بنگال، گجراتی، تنگی، معبری، (کٹری) دھور سمندری (کا رومنڈل) اوڈھی اور دہلوی،

امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی یہی بولیاں تھیں، ابوالفضل ابن عربی میں ان زبانوں کے یہ نام گنتا ہے،

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شمالی دھور سمندھ کاہل اور قندھار کے پنج میں ہر (بلوچستانی، کشمیری، یہ زبانیں آج بھی موجود اور بولی

جاتی ہیں، صرف ایک بلٹی کے احاطہ میں گجراتی، مرہٹی، کچھی، کٹھری، اُردو اور سندھی، چھ زبانیں
 رُخ میں اُردو میں آڈیا، ٹال، تنگو، ملیاٹم اور اُردو پانچ زبانوں کا رواج ہے، ایک حیدر
 کی ریاست میں مرہٹی، کٹھری، ٹال، تنگی اور اُردو پانچ زبانیں ایک ساتھ ہیں، بہار اور سیہ میں
 آڈیا، اُردو، ہندی، ترہتی اور بھوجپوری بولی ہیں پنجاب میں پنجابی اور اُردو کا میل ہے اور
 صوبہ سرحد میں پشتو، پنجابی اور اُردو تین زبانیں دوں بدوش ہیں،

ابھی حال میں ہماہوا پادھیائے گوری شکر میرا چند اوجھانے "قرون وسطیٰ میں ہندو
 تہذیب" کے عنوان سے چند خطے دیئے ہیں جنکو ہندوستانی اکاڈمی نے اردو میں ترجمہ کے
 شائع کیا ہے، فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی
 پر اکرت زبانوں کا کچھ کچھ حال بیان کیا ہے، اور ان کی حسب ذیل چھ تین بتائی ہیں، مگدھی،
 شورسینی، ہمارا شتری، پیشاچی، اونٹک اور آپ بھرنش،

مگدھی | مگدھ اور اس کے قرب وجوار کے عوام کی زبان تھی، قدیم مگدھی اشوک کے کتبوں
 میں ملتی ہے، عام طور پر سنسکرت کے نالکون کے چھوٹے ملازم مثلاً دھیور، سپاہی، بدیسی، ہین سا
 اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں،

شورسینی | شورسین یا تھرا کے قرب وجوار کے علاقہ کی زبان تھی، سنسکرت نالکون میں عورتوں
 اور مخرون کی بات چیت میں اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے،

ہمارا شتری | ہمارا شتری مرہٹی زبان اس کا استعمال بالخصوص پر اکرت زبان کی شاعرانہ
 کے لئے کیا جاتا تھا،

اسی وجہ سے شبہ ناشی ہوا
 کہ چڑھ پڑھ کے اسکو باسپا چنہ
 لکھیگا وہ قسریطاس پر ضرور
 برا اعتراض ایک ہو گا یہی
 تو ہے اس کی نسبت یہ میرا جواب
 کہ جب کو یہ دیتا ہے رتبہ خدا
 تو اُسکی خوشامد ہر اک کرتا ہے
 سلف سے ہے رسم زمانہ یہی
 قصاید کتب نظم یا نثر ہو
 یہ تصنیف پیری خوشامد سہی
 میرا فرض ہی میں منکح ازہون

مناسب ہر اظہار جس شجہ کا
 کرے گا پسند ایک اک ناپسند
 کہ ثابت ہو بد نیستی یا قصور
 کہ لگسی خوشامد میں یشنوی
 لصد عاجزی اور بطور صواب
 کہ مرجع ہو وہ قوم یا ملک کا
 ہر اک جان شاری کا دم ہر تاج
 ہو عہد وزارت کہ عہد شہی
 دیا کرتے ہیں لکھ کے سلطان کو
 تو کی بنے اس میں خطا کو نہی
 ثنا کرنے کا میں سرا اور ہون

کی نیرنگی اور بھاشاؤن کی کثرت کو دیکھ کر متحیر رہ گئے، جیسے جیسے اُن کا قدم اندرون ملک میں آگے بڑھتا گیا اُن کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا، وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا، سندھ کے حکمران گو عرب تھے، مگر ایران کے قرب اور فارسی تاجروں اور بھارتیوں کی آمد و رفت کے سبب عربی آمیز فارسی کی ہر جگہ کثرت تھی اور ادھر درہ خیر سے جو قومیں آئیں اُن کی مادری زبان کچھ بھی ہو مگر ان کی سلطنت کی شاہی اور دفتری زبان فارسی ہی تھی، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان فارسی ہی رہی،

دوبی زبانوں میں سہانی | لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان
لفظون کہ میل | کی زبان فارسی کر دیا جائے، اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبے

کی زبان کو اختیار کر کے اُس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی ساتھ ہی مذہبی سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اسی طرح اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

مذہبی مصطلحات، اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعا، خیرات، صدقات، رسول، پیغمبر و حجتی، کتاب الہی، دوزخ، بہشت وغیرہ بیشمار الفاظ ہیں جنکے بغیر ہندوستان کی ہر ملکی بولی میں وہ اضافہ پر مجبور ہوئے،

اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر، عدل، صدر، جہان، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ

سینکڑوں سیاسی اصطلاحات تھے، جو ان کی سلطنت کے روزمرہ میں جاری تھے، وہ ہندوستان کی ان مختلف ملکی بولیوں میں بھی جاری ہو گئے، کچل کی زمینداری میں خواہ وہ ہندوؤں کی یا مسلمانوں کی جس قدر عمدے اور مالی اصطلاحات ہیں وہ عموماً عربی فارسی آمیز ہیں مثلاً دیوانہ نائب، تحصیلدار، صلحہ لاکا زندہ، گمانتہ، سیاہہ نویس، تجویدار، واصل باقی نویس، خزانچی، مقصدی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ و فراتحریر وغیرہ، اب اصطلاحات کو لیجئے واصل باقی، جمع بندی، مالکذبحہ خرچ، گوشوارہ، فردا بند، روزنامہ، یادداشت، خلاصہ کیفیت، جسوار، پروانہ، تیرنج وغیرہ لفظ نہ صرف اردو اور سادہ ہندی میں بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں بھی بعینہ یا ان کے دوسرے مرادف متعل ہیں، مرہٹی بولنے والے مرہٹے اپنے وزیروں کو پشیوا اور عام ہندو ریاستیں ان کو آج تک دیوان کہتی ہیں اور یہ دونوں فارسی ہیں، اسی طرح مرہٹی گجراتی، اور بنگالی میں معاملہ مقدمہ کے بھی اکثر الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی ہیں، ہم اپنے صوبہ میں دیہاتی کسانوں کے سردار کو چوہدری کہتے ہیں، لیکن ہمارا شٹر میں اس کا نام مقدم ہے، کلرک کے لئے آپ محترم بولتے ہیں، مگر وہ ان اس کو کارکن کہتے ہیں،

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا مسلمانوں نے اگر اس پیشہ کو فن کی حیثیت سے جو ترقی دی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مختصر تا کننا ہے کہ بالترکستان اور ایران کے میسون میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے، اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی آئے اور یہ سارے ہندوستان میں ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں پر بعینہ چڑھ گئے، انگور، آنا، سیب، جی، انجیر، نارنگی، خربوزہ، تربزہ، سرودہ، بادام، مٹھی، کشمش، پتہ، شفا لو، ناشپاتی، آجوش، خوبانی چلوخڑا

فدتی کے مزون سے اہل ہند ایسے افس ہوئے کہ ان پھلون کے ساتھ ساتھ ان کے ناموں سے بھی اپنی زبان کوئی لذت بخشی، پھولوں کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے مثلاً گلاب، تسون، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، زکس، نسرین، نترن، گل طرہ، (گولڈ ہیرا) گل شببو، (گل شب بو) گل نخل وغیرہ آج یہ واقعہ تعجب سے سنا جائے گا کہ تعلقون کے زمانہ میں دہلی اور اس کے نواح میں باڑہ سوباغ تھے جن میں ان قوم کے انکور تھے، (دایخ فیروز شاہی)

میسوں کی تمید سے مسلمانوں کے دسترخوان کے اوانِ نعمت یاد آئے، خشک، پلاؤ، قبوتی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، بختی، دم بخت، قیمہ، کوئمہ، مرغفر، مطخن، جلوآ وغیرہ مسلمانوں نے پیش کیا، اور پورے ملک کے کام و زمین نے ان کے ناموں سے لذت پائی مثلاً چکنو، تربت، نانودہ اور پرف کا بجورہ سامنے رکھا، ہندوستان کی ایک روٹی کو کبھی نان بنایا، کبھی سیرا کبھی آبی، اور کبھی باقر خانی، اور کبھی روغنی اور کبھی چپاتی اور کبھی کاک اور کبھی کچھ، مٹھائی ہندوستان کی چیز ہے، مگر صورت اور مادہ کے ساتھ ناموں کا تنوع اسلامی تہذیب نے بخشا، یہاں تک کہ مٹھائی بنانے والے کے لئے عربی نام حلوائی، ہما برہن کی پاک اور پوتر زبان کو کبھی مجبوراً چھولیتا ہوا اور حلوائی کے ”خونچہ“ پر باتو شاہی جس کی اصل شاید دالاشاہی ہو، قلاقند یا برنی، شکر پائے، نمک پائے، جوئے، نقل، گلاب چاہن جتنی، زعفرانی وغیرہ ملین گے،

کپڑوں کی نئی نئی صنعت کاریوں کی ایجادات کے ساتھ ان کے ناموں کو بھی ہندوستان کی زبانوں میں فروغ دیا، نخل، قائم، کاشانی، زرقبت، طاس، مہیش، شروانی، ہشہر، کجواب، دیبا، اطلس، تافہ، بانفہ، مشرور، زری، گبدن، تن زیب، شال باف، جاتمہ دار، محمودی، علی قلی خانی

زرتار، چارخانہ، جامدانی، تھامانی، برہنہ تن ہندوستان کو ان کپڑوں کی بدولت کرتہ اکچن، چکچن،
 پیشوار، میرزائی، نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوخا، قرغل، ککلاہ، دستار، کتفی، شال، دوشالہ، چادر، پستین
 شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، بحاف، فرش، قالین، سند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر
 رومال، منڈیل، نموزے، آزار بند، کمر بند، کے نام عربی فارسی اور ترکی سے آئے، پان ہندوستان
 کی چیز تھی، مگر اس کے لئے، پاندان، خاقدان اور گالدان اسلامی تہذیب نے پیش کئے، کھانا کس
 ملک میں پکایا اور کھایا نہیں جاتا، مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کی ہانڈیوں اور کپے
 کے تپوں سے آگے نہیں بڑھی، مسلمان آئے تو دیگ، دیچی، کنگھی، چھپر، رکابی، پیالہ، بادیا، قاب
 وستر خوان، آفتابہ، رنجورہ، سیلابچی، صابون، خال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساں، اپنے
 ساتھ لائے، مسلمان جب یہاں آئے تو سر شام یہاں دیا اور دیگ جلتا پایا، انھوں نے بر
 محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی، اور جابجا فانوس، دیوار گیر لالہ، مردنگ اور قتیلہ سوز رکھے،
 اور ان سے شعل چلی نے شعل جلا کر راستہ کو پر نور کیا، ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک تھا، مگر شہر
 لگا کر اور پہاڑوں سے برت مٹکا کر گرمی میں پانی کو ٹھنڈا مسلمانوں نے کیا اور چچی، چلن اور پر
 لٹکا کر کمروں کو محفوظ کیا، اور ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو "خش" لک کر پکارا، اور اس کی ٹیٹن
 بنو کر کھڑکی لیں،

گھوڑے کی سواری کہاں تھی، مگر جب مسلمان یہاں آئے تو لگام، زین، تنگ، جوڑ
 رکاب، بعل، گتہ، جل جس کی خرابی بھول ہے، سکیں، سوار، شہسوار، تازیانہ، تچی، سب اپنے
 لے اس کی تفصیلات بابر کی ترک میں ملین گی،

ساتھ لائے،

جواہرات میں دُرِ عافانی، عقیقہ، یمنی، نعل، بدخشان، زمرد، زبرجد، شیش، فیروزہ، سنگ تمارہ،
سب اُن کے لائے ہوئے ہیں، تعمیری پتھروں میں سنگ مرمر، سنگ موسیٰ، سنگ سرخ، سنگ
ساق، سنگ لہزان، سنگ خارا، سب اُن کے نکالے ہوئے ہیں، زیوروں میں سر پہنچ، مرزا
بے پردا، کلنئی، طرہ کا لون میں درہ، گوشوارے، ہاتھوں میں دست بند، جہانگیری، بازو بند، نونگے،
جوشن، پرتی بند، گلے میں نیگل، طوق، تنوید، گلو بند، بختیہ، کمرین، کمر تزیں، اور پاؤں میں پاؤ تزیں،
مسیون ناموں کو چھوڑ کر جو ہندی میں وضع کئے،

خوشبوؤں میں عطر اُن کی ایجاد ہے، اور غود عطر اور اس کے مسیون ہندی، فارسی اور عربی
نام ان کے وضع کئے، اور وہی ملک کی ہر زبان میں پھیلے ہوئے ہیں،

ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن
و معاشرت، ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے، اور
ان سب کے لئے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل
نئی چیزیں تھیں اس لئے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی اور وہی
الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے،

زبان کی ترتیب کے | زبان کی ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے، اسم، فعل اور حرف، مسلمانوں نے یہاں
تین عناصر | اگر جو زبان اختیار کی اس کے تمام فعل اور حرف ہندوستان ہی کی بولیوں کے
اختیار کئے، البتہ اُسے اسماء جن میں بڑا حصہ نئی چیزوں اور نئے ناموں کا تھا، وہ اپنی زبان سے لائے

بقیہ اسار بھی ہندوستان ہی کے ہیں، ایسی حالت میں ہندو مسلمانوں کے مسئلہ اصول تقیم حقوق میں فیصدی سے زیادہ قبضہ تو مسلمانوں کا اس زبان پر نہیں، پھر کیا یہ ظلم نہیں کہ اس سے بھی دست بردار ہونے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے،

سندھ کی وادی ہماری سمجھ گچھکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، ہندو زبان کا پہلا گواڑ

آج اردو کہتے ہیں، اس کا بھولی اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، ہند، راجستھان اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندرون سے گذر کر گجرات، بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے، آخر پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا، یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا، چیکے یہ متنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کے بعد جو سوداگر اور تاجریان آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی و فارسی بولتے تھے، جہا زانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی، خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی، خصوصاً جب ۱۳۳ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا، اور سندھ کے پٹنوں نے بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی بن کر ان کے ترجموں میں مدد دی، اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصبوں پر فائز ہونے لگے، اس زمانہ میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے، مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارہ ہے، پلنگ جس کی عربی صورت بلنچہ ہے، جہاز کے خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے، اسی طرح خوشبوؤں

میں سندن (چندن) کا فور (کپور) قرض (کرن پھول) وغیرہ لفظ ہیں، دو اولین میں سب سے عجیب نام
 مجھے "بہط" معلوم ہوتا ہے، جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، مغایع العلوم میں نقل کیا ہے،
 جو ہمارے "بھات" کی خرابی ہے جو مرصیون کی غذا جوڑ کی گئی تھی، پھلون میں اٹیج (انب) آم، او
 لیون میں، جنکا ذکر ۳۳۰ میں مسعودی نے کیا ہے، سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں تھیں
 سو برس تک قائم رہیں، اور آخر سلطان محمود الملک فی ۳۲۰ھ کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں
 کا خاتمہ ہوا، ان ریاستوں کا بڑی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان، عراق، ہین، ایران اور مصر
 یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے
 کہ سندھ اور ملتان میں ایسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہا ہے، اور ان کی
 مرکب بولی کا ہیوٹی تیار ہو، خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود
 ہیں جن سے کچھ نہ کچھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے، بزرگ بن شہر یاہد ملابج ۳۳۰ھ میں بحرہ
 کے سوال سے گزرتا ہوتا تھا، اُس نے اپنے بحری سفر نامہ میں جس کا نام عجائب الہند ہے، کہی سندھ
 لفظ استعمال کئے ہیں وہ ۳۲۰ھ کا ایک قصہ ہم کو سنا ہے، شہر اُور واقع سندھ کے ایک ہند
 راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے سلطان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی
 جو اُس کو اُس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے، بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب
 کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا، چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت
 میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا، اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا، بغداد کا سیاح اصطخری ۳۳۰ھ میں
 سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا، وہ کہتا ہے،

”منصورہ دہلی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف
کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہو۔“
(صفحہ ۷، طبع لائڈن)

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جسکی سندھ اور ملتان میں سیاحت کا زمانہ
۳۵۰ھ ہے یہی کہتا ہے کہ

”منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اسکے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہو“ (سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۳۳۲)
اس کے چند سال کے بعد ۳۵۷ھ میں بشاری مقدسی ملتان آیا، وہ لکھتا ہے،
”اور یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔“ (سفرنامہ بشاری صفحہ ۸۴ لائڈن)

پھر دیل یعنی ٹھٹھہ واقع سندھ کے حال میں کہتا ہے،

”دیل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے اس کے چاروں طرف تنوگافون کے قریب ہیں
اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے اکر ٹکراتا ہے، یہ سب اگر
ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے“ (ایضاً صفحہ ۷۹)

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان
کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہی جس کی حد اُس زمانہ میں ملتان سے لیکر بھکر
ٹھٹھہ کے سوا جل تک پہنچی تھی، اس زمانہ میں ایران ترکستان اور خراسان سے ہندوستان
کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا
ہے، اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کمال اور شعروادب کے ماہر اسی راستہ سے آکر

ہندوستان کے جس پہلے شہر میں وہ داخل ہوتے تھے وہ ملتان تھا، چنانچہ سلطان ناصر الدین تہجد کے زمانہ تک جو سلطان آتش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز و اسلامی تعلیم کی درس گاہ تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز نقل ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا،

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی، وہ سندھی اور ملتان ہی ہے، پھر پنجابی اور بھارتی دہلوی، سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے، چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرا بنا رہا ہے، اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیک عربی نسخ ہے، اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں، مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں،

سندھی، ملتان اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں، تیوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے، تیوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے، صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی سنگین ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی، اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی، علامہ بیرونی

المؤنیؒ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ جمیا کیا ہے، اس نے اپنی اس کتاب میں جس لہجہ اور طرزِ ادب میں ہندی الفاظ لکھے ہیں اُن سے ماہرِ ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتان اور سندھ ہی نکل میں ہیں،

غزنوی دین بھلا ابے زمانہ جو جب غزنین میں آلیسکینگین کی حکومت قائم ہو اور سکینگین اور سکاں مؤوزند ہندوستان پر پے درپے حملے کرتے ہیں، ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی گمرطی وادی و سرکاری زبان فارسی تھی، سلطان محمود غزنوی المتونی سلمہ نے گوگجرات تک دھاوا کیا، مگر اس کی سلطنت یا آخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہی، جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی اس میں جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران، اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آکر بس گئے، اور ہزاروں ہندوستانی اُن ملکوں میں چاہنے اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوان ہوئی، غزنویوں کی فوج میں بہت سے ہندو افسر اور سپاہی نوکر تھے اور وہ حدودِ سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے،

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم ملک نام ایک ہندو تھا جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں ہوئی تھی، اور اصفہان جا کر اس نے فارسی سیکھی تھی، سلطان محمود کے زمانہ میں جوہاں میں تخت پر بیٹھا تھا، اس عہدہ پر ایک ہندو میر علی نام سرفراز تھا، سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے، فضلا سے ہند بھی ان کے پہلو پہ پہلو تھے، کالجبر کے راجہ انند نے ۱۱۱۳ھ میں ہندو سیو میں بادشاہ کے لئے مدحیہ شعر لکھے :

۱۷ علاوہ تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ ”پندہ خیرین“

”انڈازبان ہندی در مح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آن را بقضلاے

ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہنگی تحسین و آفرین کردند (فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندی
کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ جائیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض اُن شعراء کی زبانوں
سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کا منہ مک بھی نہیں دیکھا تھا، حکیم سنائی
غزنوی (۴۶۳ھ - ۵۰۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے وہ اپنے ایک قصیدہ میں زبان
کے اختلاف کو غیر اہم بتا کر فرماتے ہیں،

تو بے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی ز نکت لغتتاے اینی و آنی

اسامی درین عالم است از نہ حاشا چہ بے چہ نام و چہ میدہ چہ پانی

عہد غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا، اس کی نسبت
عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا، اور اس زبان
میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا، اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے،

برآمد از پس دیوار حصن مار مار

ان شعروں میں پانی اور مار مار اور شائید میدہ ہندی لفظ ہیں جو اہل ولایت کی زبانوں

سے کلیات سنائی، بیہی صفحہ ۹۶، بحوالہ پنجاب میں اردو، ۳۵۰ نقطہ میدہ فارسی لغات میں گولت ہو (مؤید الفضل) مگر
خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے، کیونکہ یہاں شاعر نے آب اور پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ایسے ہی نام اور
میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے بطور لغت و نشر غیر مرتب،

پر چڑھ گئے تھے، اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں غوریوں کا دور شروع ہوا، جنہوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا، اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا، ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہوئی اور اس پورے ملک میں جہاں کہیں کبھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی ایک مشترکہ زبان ہند کا ہیڈی تیار ہو گیا، قاضی سراج منہاج جو ۶۲۲ھ میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

”دین راز زبان دیگر است میان لغت ہند و تبت“ (صفحہ ۱۵۲ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لیکر بنگال تک پیدا ہوئی تھی، جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان کے بیچ میں تھی، یہیں خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں:-

”آب بنگتی گویند چوں بدریاے ہندوستان درآید اور ابلغت ہندوی سمند“

گویند“ (صفحہ ۱۵۲ طبقات ناصری سراج منہاج کلکتہ)

دہلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جو دو کرم کے صلہ میں ”نخشب“ کا خطاب دیا تھا، (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳) یعنی ”لاکھوں کا دینے والا“ اس کے زمانہ کی تعریف میں اہل ہند ”کال قطب الدین“ کہتے تھے، ”کال زمانہ“ راگویند“ (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ نول کشور) اس عہد کے سکون پر بادشاہ کے نام کے ساتھ ”شری امیر“ لکھا جاتا ہے، شری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں شری امرج کی ترکیب میں مستعمل ہے، مگر اُس وقت کی اس ترکیب

”شری امیر برادر خور کیجئے،

مٹان سے دہلی | شمس الدین لٹش نے اپنے خواجہ تاش، لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو ۱۵۷۱ء میں شکست دے کر مٹان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ”مٹانیان“ کا لفظ اس زمانہ میں ”سوداگرانِ پارچہ“ کے ہم معنی ہو گیا تھا، اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب مٹان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں، اس کی سند میں ایک ایسی بزرگ دستی کا نام لینا ہے، جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت تو مٹان اور سندھ میں ہوئی، مگر روحانی اکتساب دہلی میں فرمایا، اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی، یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ،

ہندوستان کے | جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ روحانی فاتح کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان میں غزنین اور غور کے سلاطین، ملکی فتوحات کے لئے جہان جہان بڑھتے تھے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے، اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہو کہ ہندوستان کی روح کو خانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا، یہ ایک خود مستقل موضوع ہے اور کبھی فرصت سے یہ بڑی داستان بھی سننے کے لائق ہے،

یہ دیکھو تاریخ فیروز شاہی،

یہ روحانی فاتح عوام | ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو محسوس
سے ملتے ہیں ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ عوام کو اور ان سے زیادہ صوفیوں کو جو

ہونے کے انسانوں تک پہنچنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب تک اردو کی تاریخ میں اکبر اور شاہجہان
اور ان کے مینا بازار اور اردوئے معلیٰ کو اہمیت دی گئی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے کہیں
زیادہ صوفیہ کو حاصل ہے، جن کو ہندوستان کے عوام کی زبان کو اختیار کرنے میں یہ سلطنت
کے بعبے داب کا خیال مانع آسکتا تھا، اور نہ ظلم ظاہر کے جتہ و دستار کے وقار کا، بلکہ عوام
کی اصلاح اور حق کی تبلیغ کی خاطر ان کو ہندوستان کے عوام کی ایسی زبان کو قبول کرنے میں
کوئی تامل نہ تھا، ٹھیک جس طرح مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کے عوام کی زبان کو بودھ
نے اپنے دھرم کے پرچار کے خاطر اختیار کیا، اور اسی میں اپنا پیدائش دیا، اور جس طرح مسلمانوں
کے بعد عیسائی پادریوں اور مشنریوں نے میان کے عوام کی بولیوں کو بے تامل استعمال کیا، اسی
طرح ان صوفیہ نے اُس وقت کے عوام کی ایسی زبان کو بولنے میں پیشدستی کی،

حضرت صوفیہ اور یہ | اس وقت تک اردو کے جتنے قدیم فقرے مل سکتے ہیں، وہ عموماً صوفیوں
نئی زبان کے ملفوظات ہیں، اور اردو کی پرانی تصنیفیں خواہ وہ دکنی ہوں یا گجراتی

وہ سب صوفیوں کی لکھی ہیں، جس طرح سہ سہ کے انقلاب سے کچھ پہلے دہلی کے علم و عرفان کے
مشہور خانوادہ نے وقت کی اردو زبان کو جس کو اس وقت ہندی زبان کہتے تھے اپنے اصلا
رسالوں اور تصنیفوں اور قرآن و احادیث کے ترجموں کے لئے فارسی کے بجائے پسند کیا،
عوام تک پہنچنے کی خاطر اردو ہی کو جس میں اس وقت تک شمالی ہند میں لکھنا پڑھا عیسائی

تھا، بے تکلف قبول کیا، اور اصلاح دین اور روایات کا بڑا ذخیرہ اردو میں جمع کر دیا جس نے رفتہ رفتہ اہل علم سے اس نئی زبان میں لکھنے پڑھنے کا حجاب اٹھا دیا،

خواجہ فرید شکر گنج | خانوادہ چشت کے فرد فرید شکرستان معرفت کے مشہور گنج شکر سے کو
ملتان واقف نہیں حضرت خواجہ فرید گنج شکر کا خاندان اگرچہ کابل کا تھا، مگر شہید الدین

خوری کے زمانہ میں ملتان آکر بس گیا تھا، اور خواجہ کی ولایت میں قصبہ کنی دال مضافات ملتان میں ۸۴۷ھ میں ہوئی، خواجہ کا نشو و نما اور اُن کی تعلیم و تربیت ملتان میں ہوئی، اٹھارہ برس کی عمر تھی، ملتان کے مدرسہ میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ میں کتاب نافع کا درس لے رہے تھے، کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا گذر ہوا، اور ایک ہی نظر کیا اُس نے ان کو کمان سے کمان پہنچا دیا، بہر حال ملتان سے نکل کر قندھار اور دوسرے ممالک سے اخذ فیض کے بعد پھر اپنے وطن واپس آئے، اور بعد کو اپنے پیر کے حضور میں دئی آئے، اور یہاں سے پنجاب کے شہر اجودھن میں جا کر اقامت اختیار کی، اور وہیں ۸۷۷ھ میں آسودۂ خاک ہوئے،

اس وقت تک اس زبان کی ابتدائی تاریخ کا جہان تہہ لگ سکا ہے، اس سے پہلی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیرین دہن جن کے منہ سے مصری کی یہ ڈیوان پہلے نکلیں، خواجہ فرید گنج شکر ہیں، چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابوں میں موصوف کے چند فقرے ملتے ہیں،

۱۔ پہلا فقرہ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانوسی کی بیوہ کے درمیان ہوا، خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خود و سال بچہ برہان الدین کو اُن کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقہ بیعت میں لے لیا، اس پر ان کی والدہ نے کہا "خو جا برہان الدین

بالا ہے۔ خواجہ نے فرمایا ”پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے“ یہ بالا وہی لفظ ہے جو لڑکے بالے اور بچوں کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے،

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ میں عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے، خواجہ ^{پہلے} شخص ^{پہلے} جن جنھوں نے ان کو ہندوستانی زبان میں ادا فرمایا، ہمارے کتب خانہ میں اُردو ادب و تصوف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت کے یہ فقرے مذکور ہیں، فرمایا:-

۲۔ در راستا بگوئی ”اوہی ہی“ و در چپا بگوئی ”یہی ہی“، در دل بگوئی ”نہی ہی“۔
دیگر زبان ہندی،

۳۔ در راستا ”ہمہ تون“ و در چپا ”ہی تون“ و در دل ”ہمہ تون“
۴۔ دیگر گوید از طرف ”ل“ ہون تون“ و طرف آسمان ”تون تون“ ہون کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ انا انت کا ترجمہ ہے،

تصوف کے اذکار کے ایک اور رسالہ میں جبکہ نام ”خواجہ خمسہ“ ہے، اور جبکہ ۱۰۹۷ھ کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں ہے یہ مذکور ہے،

بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس اللہ سرہ ذکر زبان ہندی
وضع فرمودہ اندر دغل آورده اند، در باب دین اندا، اہونہ تون، اہونہ تون، اہین تون
سوے آسمان نگر سیتہ زبان گوید اہونہ، تون باز صے سوی زمین
کردہ بہان طریق این زبان گوید اہونہ تون بعدہ نظر ابرو دار و بر خود گماڑ

لے سیر لاویا بجوال پنجاب میں اردو، ۱۷ رسالہ شیخ بہار الدین بن ابراہیم عطاء اللہ قادری، قلمی دارالمصنفین،

پیالے سے کرت یا ہفت کرت، انہیں تون“
 شیخ اپنے ایک دوست کو بھتیجا کہا کرتے تھے، آپسے پوچھا گیا کہ ذہن کا مقام کہاں ہے
 تو فرمایا بیچ سڑک کے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے تھے، ان کے پیرو خواجہ
 قطب الدین بختیار کاکی نے سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا ”آنکھ آئی تیر
 شیخ نے فرمایا اگر آئی ہے ”چراستہ اید“

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے کچھ لوگ ان کے رستہ
 میں چھپ کر بیٹھ گئے، جب آپ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے اور ہندی میں فرمایا ”سرسہ
 کبھی سرسہ کبھی نرسہ“

ق
 ہمارے وطن (دیس ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتب خانہ ہے، اس میں چند پریشان اور
 کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں ان
 ساتھ ہی ذیل کی ایک نظم بھی ہے،

خیزد ران وقت کہ یرکات ہو	وقت سحر وقت مناجات ہو
خسپ چہ خیزی کہ بھی رات ہو	نفس مبسدا کہ بگوید ترا
صحبت اغیار بورسی بات ہو	بادم خود ہمدوم ہیشا رہا بش
نیک عمل کن کہ وہی سات ہو	باتن تنہا چہ روی زریں زمیں

لے تاریخ اردو قدیم بحوالہ اسرار الاولیاء صفحہ ۳۷۷ ایضاً بحوالہ خواجہ فریدی صفحہ ۲۰۸ تہ پنجاب میں اردو، بحوالہ خواجہ فریدی،

پندشکر گنج بدل و جاں شنو ضائع کن عمر کہ ہیمات ہے
 اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے
 حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی
 ہے، اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھا تعجب انگیز ہے، ظاہر ہے کہ خود حضرت
 اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے، اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبانِ مبارک سے بعض ہندی
 دوہرے ادا ہوئے ہیں، جن میں سے مقدم اور مستند وہ ہے جو سیر خور دہلوی نے سیر الاولیاء
 میں نقل کیا ہے،

”ایں دوہرہ کہ بزبانِ مبارک حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است
 مناسب این معنی است“

گنت نہوین کا رُری ناکان ست مگ
 بس کند سے مدھن گر ہو رین لُمائے

بہر حال اس نظم سے قطع نظر کر کے اوپر کے فقرے میں ”کا“ اور ”کے“ اضافت کی ^{مت} ^{کلا}
 ہوتا ہے اور آئی ہے ”فل اور ہون“ ”تون“ ”اوی“ ”ہی“ ضمیر اور ”نہی“ اور ”ہوان“ اور ”یچ“
 طرف اور ”بالا“ ”چاند“ ”آنکھ“ ”بھیا“ اسماء اس میں موجود ہیں،

حضرت نظام الدین خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء المتوفی
 ۷۲۵ھ کے ملفوظات فوائد الفوائد میں جس میں حضرت کے ۲۲ کتب کے
 ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کئے ہیں حسب ذیل ہندوی لفظ

ان کی زبان مبارک سے بے تحلف ادا ہوئے ہیں، پیار (صفحہ ۹) لنگوٹ (صفحہ ۹) کھٹ (صفحہ ۹) یعنی کھاٹ (صفحہ ۵) کندوری (عس صفحہ ۵۵) چچہ (صفحہ ۶۸) لنگھن (فاقہ ۸۶) دھاری (یعنی دھاری) (صفحہ ۱۲۸) آٹ (صفحہ ۱۴۳) حضرت سلطان الاولیا کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے،

لنگھت گر کند ترا فر بہ سیر خوردن ترا ز لنگھن پلے

حضرت سلطان الاولیاؒ فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے، ”ہندو یہاں خوش گفتہ“ و ہندوی می گفت ”یعنی ہندی گایا کرتے تھے، جامع مسجد الجمیر کے امام، فقیہ مادھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ اُن کا ہندی گانا سن کر فرمایا ”چنین آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سر و دہندی خرچ کنی۔“ شیخ احمد نے اسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کر دیا (صفحہ ۴۲، مطبع اودھ اخبار)

شیخ نصیر الدین اودھی | شیخ نظام الدین اولیا کے مرید شیخ نصیر الدین اودھی جبرغ دہلی (دستوفی) ۸۵۲ھ نے جب اپنے ایک ساتھی شیخ فی سراج کو بنگالہ رخصت کیا تو انھوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاء الدین قل سرفراز ہیں، فرمایا ”تم او پر قل تلے۔“

خواجہ بندہ نواز | شیخ نصیر الدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں، ۸۱۵ھ میں دہلی سے بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آ گئے، اور ۸۲۵ھ

میں وفات پائی اُن کا ایک فقرہ اُن کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے۔ ”بھو کون موے خدا کچھ اپڑتا ہے خدا کون اپڑنے کی استعداد ہو رہی، اُنچا پورا ہندی رسالہ معراج النشتمین چھپ چکا ہے،

سے فوائد اخذ صفحہ ۷۶ سے تاریخ و شمسہ ۱۰۰۰ نوکشتہ، ۳۷۷ تاریخ زبان اردو قدیم نوکشتہ صفحہ ۲۳ بحوالہ غنی نامہ عبد اللہ بن عبد الرحمن

ان بزرگوں کے ان مسلسل فقروں کو سکراب اس میں شک کی کیا گنجائش رہتی ہے کہ
کہ اس زبان کی عمر بچی سمجھی جاتی ہے، اس سے کتنی زیادہ ہے، یہ حقیقت میں ہندوستان ہی کی
زبان تھی جس کو ان بزرگوں نے قبول کی نظر سے دیکھا، اور محبت کی شکر میں گھولا،

خلجی اور تغلق دور میں | یحییٰ اور تغلق سلاطین کا دور ہے، ان بادشاہوں کے زمانہ کی دویا دگارتار

ہمارے سامنے ہیں، تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی، اور تاریخ فیروز شاہی سراج عقیف، ان
دونوں تاریخوں میں جن میں سے پہلی دہائی میں چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے
اوائل میں اور دوسری ساتویں صدی کے پنج میں تصنیف ہوئی ہے، بہت سے ہندی
لفظا اور مصطلحات ملتے ہیں، اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہیں،

تجیرہ لکھ (لاکھ) کمار (صفحہ ۸۶) ٹھگت (صفحہ ۱۸۹) ٹونڈی (صفحہ ۱۹۲) ٹیکہ ہندوان (صفحہ ۲۲۰)

منڈل (صفحہ ۲۱۶) گھٹی (صفحہ ۲۲۰) بٹی پٹوریاں (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۴۵) چتورہ (صفحہ ۳۲۰)

مٹھ (صفحہ ۳۴۴) بسوہ، چرائی، ڈیہہ تصبات (صفحہ ۲۸۸) منڈہ، منڈی غلہ (صفحہ ۳۰۴) ماش، مو

(صفحہ ۳۵۰) منڈی (صفحہ ۳۰۴) مین (صفحہ ۳۱۰) ریوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۳۰) دھاوگا

(جمع فارسی دھاوا یعنی ڈاک دوڑیہ (صفحہ ۳۳۱) موڑہ (موڑھا صفحہ ۲۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸)

تی بی (صفحہ ۳۷۳) بھٹی (صفحہ ۳۱۶) تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی) بی بی (صفحہ ۳۹) لک (لاکھ)

صفحہ ۴۸) لکھوگ (جمع لاکھ) (صفحہ ۳۳۱) چوہ نہ (چوہ نہ بچانے والا) راج (معمار) سوندھار (سونہا)

صفحہ ۳۳۱) تجیر، چتر (صفحہ ۱۰۸) کنگرہ (کٹوہ صفحہ ۳۷۱) چودھریاں (صفحہ ۳۷) لت (لاٹ)

بھر کر (صفحہ ۳۹۳) گھڑ پال (صفحہ ۳۷) گھڑ پال خانہ (صفحہ ۲۷۱) درخت سنبھل (صفحہ ۳۱۱) چوہ (صفحہ ۳۳۱)

(سراجِ عقیف)

تاتار خانِ اعظم نے عورتوں کی پردہ دار سواری کے لئے گرد و نہار است کنا نیدہ بود کہ
 آنرا بزبانِ ہندی بھر کر ”گوئید“ (۳۹۳ سراجِ عقیف) محمد تعلق کی زبان سے ایک دفعہ ایک بیٹی
 کا فقرہ نکلتا ہے ”مولانا عابد پر سر دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں ”کہ مخور“ (اجرا لاخیار صفحہ ۸۷)
 فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے ”چہ نام داری“
 ملک قبول بزبانِ ہندی گفت ”تورا باند“ اب اس کو ”تورا بند ہو“ سمجھئے یا ”تورا بندہ“ (شمس سراج
 عقیف صفحہ ۱۶۰)

سلطان محمد تعلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام
 حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے کہا،
 ”برکت شیخ بھیا، ایک موا ایک نہا“ (شمس سراجِ عقیف صفحہ ۲۳۱)

امیر خسرو کا عہد | اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک دہلی کے علم کے نیچے جمع ہو گیا
 تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متحدہ زبان کا پیکر تیار تھا جس نے عوام کے باز ارون سے
 اہل علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ جیسے ہمہ گیر سلطانِ آد
 نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی، امیر کی فارسی
 شہزیوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال پائے ہیں، ان کی ہندی نظمیں
 جو پسیلیوں اور مکر نیوں کی صورت میں ہیں، بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس ان کی
 ان ہندی منظومات کا کوئی مستند حصہ نہیں ہے، تاہم انھوں نے اپنے دیوان غزۃ الکمال کے

آب اور کیفیت مرہا گیا

اسی سے یہ سب کو ضرورت ہوئی

کمی آب کی فصل کی ہو کمی

یہ سمجھے کہ وہ اصل ہو کون ٹھو

لکھتا ہو اس کا نتیجہ یہ ہے

اور اس سے پڑا کرتے ہیں دوا

تو یہ امر واجب ہے سرکار پر

اگر اس سے کیجا دے قطع نظر

اسی وجہ سے اسکا تہا بندوبست

مگر بندوبست آگے اچھا نہ تھا

نہ تھی فکر اس کی کسی حال میں

دیا پانی اور رنگ پر آگیا

کہ پانی کی ہونے نہ پاوے کمی

کمی فصل کی اصل کی ہو کمی

کھلی بات ہے وہ زرق ہوا

کمی آب کی ہو روپے کی کمی

میرا برعایا دس سرکار پر

کہ اسکے تیار رک یہ رکھے نظر

تو ہو گا محاصل پر اسکا اثر

کہ تالاب ہونے نہ پاوے شکست

زراعت میں ہو تانہ تحافا

کہ پانی رہے جمع ہر تال میں

امیر نے اپنی سنوئی نہ پھر میں ہندوستان کی ایک فیصلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے،

ہست دوم آنکہ زہند آدمیان جملہ بگویند زبان ہا یہ بیان
 ایک از اقصائے دگر ہر کسے گفت نیار دسخن ہند بے
 ہست خطا مغل و ترک و عرب در سخن ہندوی ماد و ختہ لب
 غرض ہر جگہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں، اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندو زبان اس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں تھی،

شیخ شرف الدین مینری حضرت شیخ شرف الدین احمد مینری (المتوفی ۷۸۷ھ) جن کا وطن اول مسکن بہار ہے، اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی، اور سب سے پہلی جا کر حاصل کی تھی، ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں جن میں بعض بیماریوں کی مجرب دوا بتائی گئی ہیں، مثلاً

لودھ پھنکری مرد اسنگ ہلدی زیر ایک ایک ٹانگ
 ایفون چنہ بھر مرچیں چاند ارد پھر موٹھا اس میں ڈال
 پوست کے پانی پوٹلی کرے نینا پیرا پل میں ہرے

(شفار الامراض حکیم محمدی دینوی مرحوم قلمی دیسنہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے اُن کی زندگی ہی میں

زین ہدوعربی نے فارسی میں لکھ کر تندرگند را نی تھی، اس میں ایک موقع پر اردو کے دو شعر استعمال ہوئے ہیں، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی،

بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی پرسانہ کرے"۔

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا،

بعد ازاں بندگی مخدوم عظیم اللہ بزبان مبارک "راند" دیں بھلا پر دور" (معدن المعانی

مطبوعہ شرف الاخبار بہار ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۸ء جلد اول صفحہ ۲۰۳)

ہمارے وطن (دیس نہ ضلع پٹنہ) کے کتب خانہ اصلاح میں ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہیں جن میں اسی زبان میں مختلف اعداد کے جوابات بتائے گئے ہیں، اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے، اس میں کل ستائیس فقرے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں،

جو من کی منی کیا ہوئی سو ہوئی، ۱۱۱

ناہین کچھ کرو نصیب لاگی بات ہو، ۱۱۳

ایہین، ابھین ناہین، ۱۳۱

ابھین ناہین، سوت رہو جائے، ۳۱۱

راج پاٹ چل کے دیا تھکون، ۳۳۱

آگے برے دن گئے اب سکھ پاوہ گے، ۲۳۲

ابھین ناہین آگو ہو چکا، ۳۳۲

۳۱۱ تورے دن کے اب سکھ سو جاناہیں،

مخدوم اشرف کچھ چھوی | اسی طرح حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (المتوفی ۹۷۰ھ)
اودھی ہیں انکا بڑا حصہ بنگال، بہار اور اودھ میں پسر ہوا اور کچھ چھو صلح فیض آباد

میں مدفون ہوئے ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعہ لطائف اشرفی میں الفاظ دعائیں اور منتر اردو ناہندی میں ملتے ہیں، اس کے مولف نظام حاجی غریب مینی سہ ماہی میں ان کے مرید ہوئے تھے، اس مجموعہ میں ایک حکایت ہے کہ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ دہلی کے پاس سے گزے اسی کے قریب ایک گاؤں میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے، سید موصوف ان سے ملنے کے لئے چلے، کسی نے مولانا کو جا کر اطلاع دی، انھوں نے یہ خبر سکر خاکساری کی راہ سے فرمایا، مثل ہندوی فرمودند چھیری کے منہ کھنڈا سمانے، چھیری مشرقی اضلاع کے دیہاتوں میں بکری کو کہتے ہیں، اور کھنڈا چادرون کے چورا کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ بکری کو کھنڈا کھانے کو ملے یہ اس کی عزت افزائی ہے، سید اشرف کی زبان اس میں مانپ اور بچھو کے کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں، جو نسخ و کتابت کی غلطیوں سے مسخ ہوئے ہیں، بچھو کے کاٹنے کا ایک منتر صاف ہے، ”دھر بند ہون، دھر کند ہون، سوا لاکھ سپاری بند ہون اپنے جگت گرو کے سکت، ہون یکہ جو اگین (آگے) چڑھے، دوسری اینکی لکڑی، پانی پرانی، انکس بند ہون نریس پرانی، مری یکہ جو اگین (آگے) جائے، دوسری کالی کوئی جھل کے کاہل دھکانا تھ پانچ چیز الخ...“

لے لطائف اشرفی صفحہ ۳۸۴ نصرت المطالع دہلی، ۲۰ ایضاً صفحہ ۳۹۶،

شیخ علاء الدین لاہوری ہندوی بنگالی المتوفی ۸۱۳ھ اور شیخ نورالحق ہندوی
بنگالی المتوفی ۸۱۳ھ باپ بیٹے تھے، یہ تھے تو لاہوری مگر سکونت بنگال
جا کر اختیار کی، شیخ نورالحق اپنے مکتوبات میں ایک فارسی شعر لکھ کر اُس کے ہم معنی ہندی شعر
لکھتے ہیں،

ہم شب بزمِ شہد کہ صبا نداد بوے ندید صبح بختمِ گمستہ ہم صبار
دین سبائی سویا سچ، ندھا تھا نون پیونو چھ پاتری مجھ سہاگن ناون
(صفو، - قلمی وار آئین)

اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے شیخ
امین الدین لکھنوی المتوفی ۸۲۹ھ ہیں، یہ دونوں ہندی کے شاعر تھے، ان کے مکتوبات
میں ہندی الفاظ، دوہے اور ہنڈولنے ملتے ہیں، لکھتے ہیں،

”در شبِ روزِ تحریرِ جگری“ بنیال گذشتہ بنشتہ شدہ است ذوقِ خواہند گرفت
جگری مذکور اینست ہندوی،

کون پراجت دیا کیستون شہ کل با نہ نہ دنی گرسوتون

عمرہ

مجھ برہا، دین جگا وے ہو ر مرتین چال بتا وے
جی ہون پنہیون بھول کنڈھیا جو بھنج تن جرٹ کانٹ کیناے

عقدہ

جی ہوں سعد پیائے حسینوں سکھ دکھ پی کے بات کھیتوں

ابن الدین ماضی جو دی پیو شہ کے درشن واری جیو

مخدوم عبدالحق | مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردو لوی المتوفی ۹۳۵ھ کے ملفوظات میں بہتیرے فقرے
ردو لوی

ملے ہیں شیخ نے کچھ زمانہ ستم پنجاب میں بسر کیا تھا، فرماتے ہیں کہ وہاں
ایک نے ابدہ بی بی رہتی تھیں جو بڑی عبادت گزار تھیں، رات کو تہجد میں شیخ سے پہلے اٹھیں اور
”ابن فقیر الملطفی فرمودند بزبان ہندی، بیٹا احمد آب گرم موجود است نیاید کہ

از آب سرد وضو کنی“، (۱۹)

شیخ کا ایک مرید شب و روز یہ چنتا تھا،

آہ شیخ احمد مار یو مار یو، (صفحہ ۱۰۰)

شیخ نے ایک دفعہ یہ ہندی دوہرہ زبان مبارک سے ادا فرمایا،

کنو! ہو تو پاٹون ہمندر کہ پاٹن جائے بارا ہو بر جوں جھیل کہ برجن جائے

شیخ احمد عبدالحق ردو لوی کے ملفوظات، شیخ عبدالقدوس گنگوہی المتوفی ۹۴۵ھ نے

جمع کئے ہیں ردو لوی اور گنگوہ ہمارے صوبہ کے ابتدائی اور انتہائی کنارے کے جاسکتے ہیں

اس مجموعہ میں حسب ذیل الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، بہت ذولہ (صفحہ

۳۷) پنگت (صفحہ ۳۸) اور اس سے بڑھ کر جھلنگہ چارپائی (صفحہ ۴۰) چوترا (صفحہ ۴۰) جھل (صفحہ

۴۷) کچھڑی (صفحہ ۴۳) دھکا (صفحہ ۴۲) کٹاڑ (صفحہ ۸۷) دب (دبانے سے صفحہ ۹۰) پالکی (صفحہ ۹۰)

دیکھ (صفحہ ۹۹) کندھوری (کھانا صفحہ ۱۰۰) ہماجن (صفحہ ۱۲۳)

دکھنی اور گوجری وغیرہ | اب ہم اس زمانہ میں پہنچ گئے ہیں جب ہندوستان کی اس متحدہ زبان نے نظم کی زمین پر قبضہ کیا، شروع شروع میں یہ مذاقہ اور تفریحی منظومات میں اسی طرح کام میں لائی گئی ہے، جیسے ہمارے عہد میں اکبر مرحوم نے انگریزی لفظوں اور جملوں کا استعمال اردو شعروں میں کیا، مگر یہ طرافت بہت جلد سنجیدگی سے بدل گئی، مگر تعلق نے ہندوستان و دکن کو ایک کر دیا اور دولت آباد و دکن کو اپنی حکومت کا دارالسلطنت اور دکنی آباد کر اہل دہلی کو دولت آباد میں لیجا کر بسایا، یہ پہلا دن تھا جس میں اس زبان کا تخم دکن کی سرزمین میں بویا گیا، یہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی راس آئی کہ تخم بڑھ کر پودا ہوا، اور پودا ایک عظیم الشان درخت بن گیا، اور حیرت سے سنا جائے گا کہ اس درخت نے شمال سے پہلے دکن میں پھل دیئے، تصوف اور عوام کے مذہبی جذبات نے اس زبان کو اپنے فیوض سے مالا مال کرنا شروع کر دیا جس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ دکن کے بہمنی بادشاہوں نے آٹھویں صدی ہجری میں دہلی سے الگ ہو کر گجرات میں جب اپنی نئی خود مختار حکومت قائم کی تو اپنا سرکاری دفتر فارسی کے بجائے ملک کی دیسی زبان میں رکھا اس کے قدرتی نتیجہ دو ہوئے، ایک تو یہ کہ بہمنوں نے سرکاری دفاتر میں جگہ پائی، اور دوسرا یہ کہ دیسی زبان نے ترقی شروع کی، بہمنی مٹ کر جب عادل شاہی و قطب شاہی وغیرہ پیدا ہوئے تو انھوں نے بھی اسی زبان کی سرپرستی کی، اور چونکہ شمالی ملک کے سلاطین کی طرح ان کے کابل و ایران سے تازہ بہ تازہ تعلقات نہ تھے، اور نہ وہ خود اپنی نسل و وطن پر فخر کرتے تھے، اسلئے

ان کے دربار کی زبان فارسی کے بجائے ہندوستانی ہو گئی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کی مادری زبان تھی،

ہندوستانی مسلمانوں کی | ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ - ۱۰۱۴ھ) جو تخت نشینی کے وقت تک جاہل رہا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس نے پڑھنا سیکھا اور فارسی پڑھی،

اس کے حال میں اس کے معاصر مورخ فرشتہ نے لکھا ہے :-

”فارسی خوان گردید و بنوع فارسی را خوب می گفت کہ تا ہندوستانی مستقیم نشد،
بیچ کس نمی توانست فہمید کہ غیر از فارسی زبان دیگر آشنائی دارد“ (رج ہفتمہ نو لکھنؤ)
اس اہم فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو ہندوستانی زبان کا وجود اور دوسری یہ کہ ان بادشاہوں کی عام بول چال کی مادری زبان ہی ہندوستانی تھی، حسین ان کے عہد کی تصانیف ملتی ہیں،

موجودہ صوبہ جات متحدہ کی مادری زبان بھی اس عہد میں اسی قسم کی ہندوئی یا ہندوستانی تھی، بدایون جو مغلوں سے پہلے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے عبدالقادر بدایونی جنھوں نے ۱۰۴۰ھ میں اپنی تاریخ لکھی ہے اس وقت کے ایک نوڈس لکھ (۱۰۹۰ھ کی ولادت) استاد شیخ عبداللہ بدایونی کا حال لکھتے ہیں کہ بچپن میں وہ استاد بوستان پڑھ رہے تھے شعر یہ آیا،

حال است سعدی کہ راہ صفا تو ان یافت جز از پے مصطفیٰ

”پرسید کہ معنی میں بیت چیست، از زبان ہندی بیان کیند.... چو معنی آن گفتہ....“ (رج ۵۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی مادری زبان ہندوی ہو چکی تھی، اگر کی زبان میں ملا بدایونی وغیرہ نے پنڈتوں کی مدد سے جس ہندی سے فارسی میں سنسکرت کتابوں کے ترجمے کئے تھے اس سے مراد یہی اُس وقت کی اردو ہے، پنڈت سنسکرت سے اُس وقت کی ہندوی میں اور ملا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ملا نے ہندی کا کلمین دعویٰ نہیں کیا ہے،

شیخ عبدالوہاب متقی جنکا وطن مالوہ تھا، ۹۶۳ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہاں مالکِ اسلامی کے طلبہ کو درس دیتے تھے، اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر ملک کے طالب علموں سے ان ہی کی زبان میں تقریر فرماتے تھے، اس سلسلہ میں ہندیوں کو وہ ہندی میں سبق پڑھاتے تھے، شیخ عبدالحق دہلوی جو ان کے شاگرد خاص تھے، اُن کے حال میں لکھتے ہیں۔

”وہا ہندیان در تقریر فارسی تکلف نکلند و ہم بہ زبان ہندی اکتفا فرمایند“

یہ واقعہ بھی اس دعوے کی شہادت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان ایک ستارے سے ہندوستانی ہو چکی تھی،

شیخ عبدالوہاب متقی کے استاد شیخ علی متقی مشہور محدث ہیں، ان کا آبائی وطن تونجو تھا، لیکن پیدائش برہان پور میں ہوئی اور ابتدائی ملازمت شاہانِ مالوہ کے ہاں منڈو میں کی، شیخ باجن کے مرید اور ان کے لڑکے سے حشمتی خر قہ پہنا، پھر ملتان جا کر شیخ حسام الدین خاں، دوئے قدیم حکیم شمس اللہ درویش، نقلاً از زوائد المتقین الی طریق سلوک العین شیخ عبدالحق دہلوی قلمی،

کی صحبت اٹھائی پھر ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ چلے گئے، کبھی کبھی سلطان گجرات کے اصرار سے احمد آباد گجرات آجاتے تھے، ۱۷۹۵ء میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، غور کیجئے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں سے رہا، جو پور (پورب) برہانپور (خاندیس) منڈو (مالوہ) ملتان (سندھ و پنجاب) اور احمد آباد (گجرات) با اینہم جوان کی زبان تھی وہ اس دور سے ظاہر ہے جسکو انھوں نے اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے مرض الموت کی حالت میں پڑھا تھا، کہ کھانے کو پیس ڈالو،

آن چنان سخی کن کہ ہمہ یکے شود دوی ناند، چنانچہ این دوہرہ خبری دہ دوی گوید، دو
سُن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی جیون دودھ بناتا
دیکھئے کہ اردو کی پوری شان اس شعر میں موجود ہے،

تاہم اس میں شک نہیں کہ جب تک شمالی ہند میں حکومت کا رعب و داب قائم رہا اس نادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور تصنیف و تالیف معیوب رہی اور اس کے برخلاف دکن اور گجرات میں خود صوفیہ نے اور شیعہ بادشاہوں نے پہل کی صوفیہ نے اس زبان میں صوفیانہ رسالے لکھے اور بیجا پور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں نے اس میں امام حسین علیہ السلام کے مرثیے اور مناقب لکھے اور رفتہ رفتہ شاعری کے دوسرے مضامین بھی بندھنے لگے، اور اس طرح نثر کے ساتھ نظم نے بھی دکن اور گجرات میں ترتیب و تدوین کی عزت پائی، ہم سب کو بخشن ترقی اردو اور دکن کے بعض دوسرے اہل قلم کا ممنون ہونا چاہئے،

جنون نے اس عہد کی دکھنی نظم و نثر کو لبون کو حلیہ طبع سے آراستہ کرنا شروع کر دیا ہے، یہ وہی ہندوستانی زبان ہے جس کو لوگ بعد میں دکھنی کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں،

اس کے صوبہ وار نام | حقیقت یہ ہے کہ نئی قوم کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور

اس طرح اس نئی زبان کو بھی مقامی اور صوبہ وار اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیوں میں منقسم کر دیا، دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی، ہر صوبہ کی ہندوستانی بولی میں علاحدہ علاحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے، اور اس لئے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ الگ مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی، یہ سب تفاوت اسی ایک کے نام ہیں،

اردو نام | تاہم یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے لے کر اب تک اس

زبان کا نام اب تک ”اردو“ سننے میں نہیں آیا، حالانکہ ہم نے آج اس نام کے سوا اس کے اور سب نام بھلا دیئے ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی شکر شاہی یعنی شکر گاہ اور کیمپ کے ہیں اور اس معنی میں اس کا استعمال بہت قدیم ہے، یہاں تک کہ لغتوں کی تاریخ میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بولا گیا ہے، پھر تمیزیوں اور خصوصاً شاجہان کے عہد میں ”اردوئے معلیٰ“ شاہی شکر گاہ اور دہلی کے قلعہ معلیٰ کو کہنے لگے، مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ

ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا، اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھرتی تھی، عام بازاروں، گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا اس لئے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے ”زبان اردوئے معلیٰ“ کا خطاب دیا، چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرۃ نکات الشعراء (میر صفحہ ۱) اور ذکر میر (صفحہ ۲)

اور نو طرزِ مرتع رقم تحمین میں یہ نام یعنی "زبان اردو" کے معنی کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پاتا ہے،

تیسرے صدی کے اوائل سے کثرتِ استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور "زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے، تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۰ھ کی تالیف ہے، مرزا مظہر حجازی کے حال میں ہے،

"در زبان ہندی کہ مراد از اردو است خیال فصیح و بلیغ بود"

باغ و بہار وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور سے بولا گیا ہے، ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نام کے طور پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے،

دہلی کے اردوئے معلیٰ پر جب تباہی آئی تو گو دہلی کے علم و ادب اور شعر و سخن کا ترجمان لٹ گیا، مگر اس کا اتنا فائدہ ہوا کہ حسبِ استعداد حصہ رُسدری کے مطابق، تمام صوبوں میں جہاں چھوٹی جھوٹی نوایاں قائم ہو گئی تھیں، بزرگوں کا یہ اندوختہ سرمایہ بٹ گیا، اہل علم دہلی سے نکل نکل کر پہلی منزل لکھنؤ میں، دوسری عظیم آباد میں اور تیسری مرشد آباد بنگال میں کرتے تھے، اور آخر میں ایک اور منزل فورٹ ولیم کلکتہ میں قائم ہوئی، بہت سے عزم و ارادہ والے ایسے بھی تھے جو دکن و اراکٹ جا کر پناہ گزین ہوئے، اور اس طرح پورے ملک میں اردوئے معلیٰ کی زبان نے اشاعت پائی، ع

عبد شود سبب خیر گر خدا خواہ،

یہ اس زبان کی مختصر تاریخ ہے جو آج ہماری ملکی اور قومی زبان ہے بلکہ جو آج اس پورے ملک کی واحد متحدہ زبان ہے،

چونکہ مسلمانوں سے پہلے یہ ملک بہت سی راجدھانیوں میں بٹا ہوا تھا اسلئے نہ ہین کوئی ایک متحدہ زبان تھی اور نہ کسی متحدہ قومیت کا وجود تھا، اور نہ ایک متحدہ مملکت تھی مسلمانوں نے اگر اس بڑے علم کو ایک علم کے نیچے ایک مرکز کے ماتحت، ایک ملک بنایا جس کا نام پہلے ہند اور پھر ہندوستان رکھا، اور ایک زبان پیدا کی جس کا نام زبان ہند، لغت ہند، ہندو ہندی زبان ہندوستان اور ہندوستانی رکھا،

ہندی فقط | آج کل جسکو "ہندی" کہتے ہیں وہ پورب کی ایک صوبہ دار بولی ہے جس کیلئے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے، مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے، خود بدیسی ہے، پھر بھی اسکے لئے ایسا نام اختیار کرنا اس لئے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے، ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جزیراتی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے،

اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو "ہندی" یا "ہندیہ" کہتے تھے؟
شکرت بابائی، سندھی، مثنائی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق ۳۲۰ء میں جس زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا تھا اس کا نام اس مصنف نے "ہندیہ" بتایا ہے،

ان یفسر لہو شریعتہ کا مکمل شریعت اسلام کا ہندی میں حال لکھے،

بالہندی لہو (عجائب الہندیہ صفحہ ۳)

ان یفسر لہو القرآن بالہندی قرآن کا ہندی میں مطلب بیان

(عجائب الہندیہ صفحہ ۳) کرے،

اسی طرح افرست میں جو شریعت کی تصنیف ہے، ہندوستان کی جس زبان سے عربی میں طب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اس کے بیان میں ہندوستان کی زبان کا نام ہندی ہی رکھا گیا ہو،

نقل من الہندی الی الفارسی (صفحہ ۲۲۸) ہندی سے فارسی میں نقل ہوا،

اس لئے مسلمانوں نے اپنی حکومت کے بعد اس زبان کو جس کو ہندوستان میں آکر انھوں نے اختیار کیا، ہندی کا نام بخشا انتہا یہ ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ فرمایا، اس کو بھی ہندی ہی فرمایا، اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندی کی وسعت کہاں تک تھی اور ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہ تھا، ایک ہی زبان تھی جو پورے ملک پر ایک سر سے سے دوسرے سر سے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی،

لیکن انگریزوں نے دہلی کے اردو سے معنی کو اچاڑ کر جب ملکیت کے

فورٹ ولیم میں اپنا نیا اردو سے معنی بنا کر کھڑا کیا تو ان کو اپنے ہم قوم

عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی، مگر ساتھ ہی

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے تحت
 پر جو صدیوں کی خونریزی سے سنبھلنے والے ہندوؤں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کھڑی مانا
 ضروری ہے اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو
 جس قدر ممکن ہو بھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم
 ہوئے ایک مسلمانوں کے سرپرستوں پر اور دوسرے کو ہندوؤں کے سرپرستوں پر اور اس کا نام ملی
 قدردانی اور ادب نوازی رکھا، اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھو لکھو کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں،
 یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے مابین بھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے
 شاید آج لوگوں کو وہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق اس عظیم انسان درگاہ کے پہلے
 بانی سے ہے، ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے، اسی سال بنارس میں بعض
 سربراہان ہندوؤں نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور
 فارسی خط موقوف ہو کر ہندی بھاشا اور دیوناگری خط جاری ہو، سرسید اس وقت سے لیکر
 مرنے سے نو دن پہلے تک اس کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے اور ان ہی کی مخالفت
 کا اثر تھا کہ ان کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی، ان کی وفات کے چند
 سال بعد، غالباً ۱۹۰۲ء میں سر میگنٹل صاحب فٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اس صوبہ میں
 ہندی کو قانوناً ممتاز حیثیت بخشی، اور اردو ہندی کی ناگوار بحث کا وہ تخم اس سرزمین میں بویا
 جس کو اس سے پہلے وہ ہمارے میں بوجھ تھے، لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورملا لائبریری ہال میں سیر
 کے جانشین اور اس درگاہ کے سکریٹری نواب محمد الملک مرحوم کی صدارت میں اردو

کے ماتم کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مرحوم نے ایک دلگداز و مؤثر تقریر کے بعد اردو کے لئے یہ مصرع پڑھا تھا،

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نچے

اور یہی وہ فضا ہے جس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ہندی بھی پیٹت مالوی کی گوشین کے زیر سرپرستی روز بروز ترقی پانے لگی، ہندی اخبارات اور رسائل اور تصنیفات کا انتظام ہوا اور پورے ملک میں اردو اور ہندی دو حرفت کی حیثیت سے صف آرا ہوئیں اور اہلین اور اب انھوں نے ہندو مسلمان دونوں کی دو الگ الگ زبانوں کی شکل اختیار کر لی ہے، جو حد درجہ افسوسناک ہے۔

علی گڑھ کی تحریک کا حصہ | اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں نئی تحریک اور اردو زبان کی ترقی میں نئے تعلیمی و ادبی انقلاب کی آواز اسی درس گاہ کی چار دیواری سے

ایک مولوی محمد حسین صاحب آزاد کو چھوڑ کر جو ایک مستقل ادبی ریاست کے بانی ہیں، باقی اردو کے تمام علمبردار اسی کی ہمہ گیر سلطنت سے وابستہ تھے، اردو زبان کو قصص و حکایات اور قصائد و غزلیات کے تنگ کوپہ سے علوم و فنون کی شاہراہ پر جو لایا وہ سرسید مرحوم ہی تھے اردو کے معنی اور عہد ہندی والے غالب کے بعد جس نے عروس اردو کو سادگی کا گناہ نہا کر تکلف و لطائف کی گرانبازی سے آزاد کیا، وہ اسی درس گاہ کا بانی اول تھا، سرسید مرحوم کی اردو کی پہلی تصنیف آثار الصنادید ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے مسجع و مرصع عبارت میں لکھی گئی تھی، مگر بعد دوبارہ اٹویشن صاف و روان عبارت میں شائع ہوا،

گو یہ سچ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے سرسید کیا بلکہ کتنا سے بھی پہلے سادہ نگاری کا آغاز کیا، مگر وہ تحریک صرف مذہبی دائرہ میں سمٹ کر رہ گئی، اسی طرح حیدر آباد میں نواب شمس الامراء بہادر نے جدید علوم میں ششہ شمسہ نام اُردو رسالے تصنیف کئے اور دہلی کالج کے ماسٹر راجندر نے پولیٹیکل اکادمی کے ترجمے کئے، مگر یہ افراد کی محدود کوششیں سرسید نے ۱۸۵۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے باقاعدہ ایک علمی انجمن اس نوع سے قائم کی کہ علوم و فنون کی نئی نئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں آج جو مسلم یونیورسٹی پریس ہے اس کی بنیاد اول اسی سائنٹفک سوسائٹی کا پریس ہے، جو پہلے سرسید کا ذاتی پریس تھا، اس سوسائٹی کی طرف سے چالینر کتابیں چھوٹی بڑی، تاریخ اور سائنس کی چھپ کر شائع ہوئیں،

سرسید نے اپنی کوشش اقبال سے علم و ادب کے ایسے متعدد استادوں کو اپنے گرو جمع کر لیا تھا جن میں سے ہر ایک بچے خود ایک نظام شمسی تھا، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ندیم احمد، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور بہت سے اہل قلم کیجئے ہو گئے جنہوں نے اپنی کوششوں سے اس بولی کو زبان کا درجہ دیدیا، اور ہر قسم کی ادائے مطلب کا اہل دنیا علی گڑھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی کی تاریخ میں بہت سے اولیات حاصل ہیں

۱۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے اس زبان کے لئے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا،

۲۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ میں اس زبان کے مسلم و مستند مصنف اور اہل قلم

پیدا ہوئے،

۳۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور نقیصہ کے لئے فراہم کیا علی گڑھ کالج بکڈپو آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا، جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں،

۴۔ اور سب سے آخری یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان اور زبان دان شہری اور تھباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا، اور جس طرح یہ زبان خود ایک مشترکہ زبان کی حقیقت کی مدعی ہے، اسی طرح علی گڑھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزانہ دار بنایا، اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعویٰ کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زبان دانی کا معیار قرار دیا، اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی، جس میں ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر شہر کے اہل قلم اور اہل علم برابر کے شریک ٹھہرے، سرسید دہلی کے تھے، محسن الملک اٹاواہ کے، مولانا حالی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی نعمانی کے، ملتان کے سب کی تصنیفات نے مل کر اس زبان کا ایک متحد معیار مقرر کر دیا، سرسید موم نے جس دن مولانا شبلی کی المامون پر یہ فقرے لکھے:-

”یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ

دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا“ (دیباچہ طبع دوم المامون)

تو درحقیقت انھوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خط فرمان لکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہل قلم کو زبان کھولنے کی جرأت اور اپنی اپنی بات کے مطابق عرض و مدعا کی ہمت ہوئی، اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی

سامانوں اور ذخیروں سے مالا مال ہونے لگا،

موانع کے باوجود اس انقلاب نے ملک میں علوم و فنون اور سنجیدہ علوم کی تصانیف کا وزن افزون ذخیرہ فراہم کر دیا، اور وہ زبان جو پہلے صرف چند دیوانوں اور کتابوں

کی مالک تھی، وہ ہر قسم کے علم و ہنر سے معمور ہوتی جاتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں حکومت و سلطنت کی ذرا بھی مدد شریک نہیں ہے بلکہ توکل سلف گورنمنٹ کی تعلیمات کا جہان تک تعلق ہے اردو کو اپنی اشاعت میں ایک انگلی کا اثنا بھی نہیں مل رہا ہے، حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہندی پر چارنی سبھانہ صرف اس صوبہ کی گورنمنٹ کی مالی امداد سے بار بار مستفید ہوئی ہے، بلکہ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلیٹیوں کے تعلیمی نصابوں کے وسیع سلسلہ کے ذریعہ ہندی دیہاتی اور شہری رقبوں پر روز بروز قبضہ کرتی چلی جاتی ہے، شاید یہ بیان تعجب سے سنا جائے کہ ہندو پبلشرز اور کتابوں کے انتخاب کی کمی میں ہندو مبزون کی کثرت کے سبب سے نصاب میں کسی ایسی کتاب کا داخل ہونا اور چلن ممکن نہیں جس کی اردو ہندی نہ ہو،

یہ واقعات شکایت کے طور پر نہیں کہے جا رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کہ ہماری زبان کو گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے کسی ادارہ سے کسی قسم کی امداد نہیں مل رہی ہے، پھر بھی اس کی ترقی جاری ہے،

اردو ایک اور امداد سے بھی قدرۃً محروم ہے اس بات کی پر زور کوشش کیا رہی ہے کہ آئندہ ”ہندی قومیت“ کی مشترکہ قومی زبان ہندی ہو جائے، اس خواہش کی تکمیل میں کانگریس

سے لے کر ناگری پر چارنی سبھا تک یکساں شریک ہے، کانگریس اور دوسرے پولیٹیکل جلسوں میں جن میں گوہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں، ہندو نوجوان اپنی تقریر ایسی زبان میں کریں گے جن کو جلسہ کے نصف حاضرین نہیں سمجھ سکتے، اکثر ایسی تجویزوں کی تائیدوں کی عزت مسلمانوں کو حاصل کنی پڑی اور کرنی پڑتی ہے جن کی ”ہندی پرست“ کا ترجمہ اردو میں کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات ایک اور چل گئی ہے کہ اردو نے جن ہندی لفظوں کو اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے کینڈے کا بنا لیا ہے، کوشش کی جا رہی ہے کہ اب ان کو اصل ہندی تلفظ کے مطابق ادا کیا جائے،

دوسری طرف ہندو ریاستوں نے ایک ایک کر کے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنانا شروع کر دیا ہے، گجراتی والی ریاست برودہ اور اردو والی ریاست آلوہ سے لیکر اڑکھمیر اور بچو تک یہ تحریک عام ہو رہی ہے، ان سب کے جواب میں ہمارے پاس صرف ایک تیز ہے، وہ سرکار نظام خداداد ملکہ لیکن میری پیشین گوئی یہ ہے کہ ان سب حالات کے باوجود ہندوستان کا مستقبل اردو کے ہاتھ میں ہے، ہندوستان میں جب تک مختلف قومیں باقی ہیں اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات قائم ہیں، اس میں ایک ایسی زبان کا وجود یہی کہ اردو ہے ناگزیر ہے،

ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے میں تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا، وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت میں گیل و بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمران ہے، اور دوسری طرف

سواحل عرب و افریقہ سے لے کر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہے، ان تمام بیرونی قوموں کے لیے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اردو ہے، یہی سبب ہے کہ یہ زبان ان تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے، جہاں ہندوستانیوں کی آمد و رفت ہو، برما، آسام، سیلو، مالدیپ، انڈمان، لاکشس، سنگا پور، پورٹ بلیئر اور افریقہ کے ان مختلف ملکوں میں جہاں جا کر ہندوستانی بسے ہیں، اس زبان کو اپنے سینوں سے لگا کر ساتھ لے گئے ہیں، اور سواحل عرب میں عدن، جدہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے، انتہایا ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحقین اور مصر کے بازاروں تک میں اس کے بولنے والے ملتے ہیں، کیا اس پر آپ کو حیرت نہ ہوگی کہ قسطنطنیہ میں اردو سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہ وغیرہ کے ترجمے براہ راست ترکی میں ہوئے مکہ معظمہ میں مجھے ماسکو کے ایک عالم موسیٰ جبار اللہ سے ملاقات ہوئی جو اردو تصنیف ارض انوار کو ہندوستانیوں سے پڑھتے تھے اور عربی درگاہوں اور مسافروں اور تاجروں کے ذریعہ زیان یا غستان، افغانستان، بخارا بلکہ چینی کا شتر تک اپنا سلسلہ ملا چکی ہے، ہندوستان میں پشاور سے کسی ریل پر بیٹھ کر آپ ہندوستان کے جس گوشہ میں بھی جائیں، قلی، اہل سٹیشن، خواجہ فروش، مسافر، صحاف، سہمی تو جو ٹوٹی بھوٹی زبان وہ بولتے چالتے اور سمجھتے آپ کو سنانی دینگے وہ یہی زبان ہوگی،

ہندوستان کے پورے طول و عرض میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں، خواہ ان کی مادری زبان کچھ ہو اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور ان صوبوں میں اردو کی تعلیم کے مکتب اور اسکول قائم ہیں، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان

اس موقع پر ناشکری ہوگی اگر پنجاب کے اُن خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو اس نے اس زبان کی اشاعت میں انجام دیں، لاہور ہی وہ سرخسہ ہے جس سے مولانا حالی مرحوم سب سے پہلے میرا ہوسے اور گوشتس العلماء حسین آزاد دتی کے تھے، مگر اُن کے ادبی فضل و کمال کی شہرت کی خوشبو اسی مشک زار سے نکل کر پورے ملک میں پھیلی، اگر اعلیٰ گدھ کا تہذیب الاخلاق اردو کا پہلا معیار ^{ری} رسالہ ہے جس کو پرانے بزرگوں کے تجربہ کار قلم نے وجود بخشا تھا تو لاہور کا مخزن پہلا معیار ^{ری} رسالہ ہے، جس کو جدید تعلیم یافتوں کے پر زور دوست و بازو نے نکالا اور چمکایا اور جس کے بعد دوسرے ادبی رسالے نکلے اور بڑھے یہاں تک کہ آج اس وسیع ملک کا کوئی ممتاز شہر ایسا نہیں جس کی اردو کے کسی ادبی رسالہ کا مولد نہ ہو تو مدفن بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو،

اردو اخبارات نے بھی اس زبان کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، اور کس قدر خوشی اور مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ آج پشاور کی پہاڑیوں سے لیکر بمبئی، رنگون، مدراس اور کراچی کے سوا اہل تک اردو اخبارات پھیلے ہیں، اور اکثر صوبوں سے روزانہ اخبارات نکل رہے ہیں، اور ہفتہ وار صحیفے اور ماہوار رسالوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے، بلکہ ہندوستان سے باہر جہاں بھی ہندوستانی آباد ہیں، اس زبان کے پیغامبر موجود ہیں، اور آج ہندوستان کے جس شہر میں کوئی خطیب چاہے، اپنے لئے سامعین کا گروہ پاسکتا ہے، ایسے بھی موقع آئے ہیں کہ انگلستان اور امریکہ تک سے کبھی نو اے کیمبرج اور کبھی صد اے وطن سنائی دی ہے،

ہندوستان کی اس زبان نے یہاں تک وسعت پائی ہے کہ یورپ کی یونیورسٹیوں اور

لابریونین اس نے اپنی جگہ حاصل کر لی ہے، کیا ہمارے لئے یہ فخر کی بات نہیں کہ ہماری زبان سے انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی میں تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں، چند ہفتے ہوئے کہ پوسٹم واقع جرمنی سے میرے پاس ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایک جرمن ڈاکٹر کا خط موصول ہوا۔

ہندی کی اشاعت اردو کیلئے

مفید بھی ہے

رانج ہے، جیسے مدراس اور بنگال، اگر وہاں ہندی کا رواج دوسری

زبان کی حیثیت سے ہو جائے تو میرے خیال میں یہ بھی ہندوستان کے لئے نہایت مفید ہے، اول یہ کہ کم از کم کوئی ایک زبان تو ہندوستان کے منہ میں ہوگی، دوسرے یہ کہ ہندی اردو کا ایک درمیانی زینہ ہے، مجھے ایک دفعہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا، ریل میں ایک مرتبہ ہندو بزرگ کے سوا کوئی رفیق نہ تھا، وہ ناگری پر چارنی سبھا کی مدراسی شاخ کے ذریعہ ہندی سیکھ رہے تھے، اتنے سہارے پر یہ ممکن ہو سکا کہ ہم انگریزی کی مدد لئے بغیر ایک دوسرے کی کچھ سمجھ قوموں کے بنائے ہیں

اصل یہ ہے کہ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس تکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی پیدائش اور ترقی میں اس کی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہو

زبان کا درجہ

انسان جانوروں کو تو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں، لیکن جب ایک انسانی قوم دوسری انسانی قوم کو اپنی تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منہ میں لوہے کی لگام نہیں لگاتی، تاہم اس کے منہ میں ایک لگام لگا دیتی ہے، جس کا نام "ہندی زبان" ہے، انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں، خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے، الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں اس لئے کسی دوسری قوم کی زبان کے معنی اس قوم کا تمدن تاریخ

مذہب، جذبات ہر چیز ہیں،

آپ جب انگریزی پڑھتے ہیں، یا انگریزی بولتے ہیں، تو نادانستہ طور سے آپ کے جسم و جان اور ارادہ و روح انگریز کی صورت اختیار کر لیتی ہے، زبان کے الفاظ، محاورات، طرز استعارات، ہر چیز اس زبان کی قومیت کی جیسی جاگتی تاریخ ہوتی ہے، اور یہ تاریخ اس قوم کی زندگی کی بھلیوں کا خزانہ ہوتی ہے، جب آپ انگریزی بول رہے ہوتے ہیں، غور کیجیگا کہ اس وقت آپ اپنے اندر انگریزی تاریخ، انگریزی جذبات، انگریزی احساسات، انگریزی خیالات کا ستر یا مجسمہ بنجاتے ہیں، اور خود اپنی تاریخ، اپنے قومی جذبات، اپنے مذہبی احساسات، اپنے ادبی خیالات سے یکسر عاری ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے آداب و معاشرت، طرز تمدن، لباس و پوشاک، لب و لہجہ ہر چیز میں اس بدیسی قوم کی نقالی کرنی پڑتی ہے، اب ایسی قوم جو قلباً و قالباً، روح و جسم، ظاہر و باطن دونوں میں دوسری قوم کی نقالی کر رہی ہے، خود اپنی قومیت کا وجود اس کے اندر کھان رہا، اب وہ ایسے افراد بن گئے ہیں جو اپنی قومیت کے عناصر کو تو قفا کر چکے ہیں، مگر دوسری قوم جس کی وہ نقالی کر رہے ہیں وہ اپنے اندر ان کو شمار کرنے سے رہی، اس لئے ان کی حیثیت "معزز اچھوت" سے بڑھ کر نہیں اس مختصر بیان سے اس نتیجہ کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہئے کہ قومیت کی تخلیق میں زبان کا درجہ مذہب کے بعد سب سے بڑھ کر ہے، اگر اس نکتہ کو ہم اب تک نہیں سمجھ سکے ہیں تو یقین کرنا چاہئے کہ ہم اب تک قومی حقیقت کی معرفت سے کوسوں دور ہیں، ہم غیر زبانوں کے سکھنے میں عمر برباد کرتے ہیں، اور بدیسی جذبات و خیالات کی نقالی

سے اپنی قومی ترقی کا مجنونانہ خواب دیکھتے ہیں،

مادی زبان میں تعلیم | آج دنیا کے وسیع عرصہ کائنات میں ہزاروں قومیں آباد ہیں، کیا کسی ایک

قوم کا بھی نشان دیا جاسکتا ہے جس نے غیر مادی زبان میں تعلیم کے ذریعہ ترقی کی منزل مقصود

کو پایا ہے، خود مسلمانوں نے اپنے عقلی علوم و فنون کا بڑا حصہ یونانیوں، مصریوں، ہندوؤں اور

ایرانیوں سے حاصل کیا، مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے دمشق و بغداد، اور شیراز و قرطبہ میں بد

زبانوں کی درسگاہیں کھول دی ہوں بلکہ اس طرح کہ تمام زبانوں کے علمی خزائن ان کو ان

زبانوں سے لے کر اپنی زبان میں منتقل کر لیا، بے شبہ دوسری علمی زبانوں کا سیکھنا بھی تیر

و تشریح کے لئے قومی ترقی کے سفر کی ابتدائی منزل ہوتی ہے، مگر وہ خود قومی ترقی کے ہر

سفر کی منزل مقصود نہیں ہوتی، وہ ایک عارضی گزرگاہ ہے، دائمی قیام گاہ نہیں،

خوشی کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے بہادرانہ اقدام نے ہندوستانیوں کے اس بزدلانہ

عقیدہ کو زائل کر دیا ہے کہ دیسی زبان تعلیم کا ذریعہ نہیں بن سکتی، اور حوصلہ دلایا ہے کہ حیدرآبادیوں

کی پیروی میں پورا ہندوستان اپنا سفر شروع کرے، ہندوستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی کلکتہ

یونیورسٹی نے بھی اپنا چوالا بدلتے پرآبادگی ظاہر کی ہے، اور میٹرک تک دیسی زبان ذریعہ تعلیم

بنا دی ہے،

ہمارے صوبہ کی دوسری قومی درسگاہ ہندو یونیورسٹی بھی ہندی کو میٹرک تک ذریعہ

تعلیم بنانے کا اعلان کر چکی ہے، اس سے ہندی زبان کی ترقی و اشاعت اور ہندو قومیت

کی تخلیق کا جو فائدہ اس قوم کو پہنچے گا اس کا اندازہ آسان ہے، کیا ہماری قومی درسگاہ اس

مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرے گی، ۹

اگر کبھی مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اس درسگاہ کی تعلیمی زبان اردو ہوگی، تو آپ کو چند سال میں معلوم ہو جائے گا کہ اردو زبان کمان سے کمان پہنچ گئی، واقعات کی بنا پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے اپنی پندرہ سال کی زندگی میں علوم و فنون اور زبان اور قوم کو جو فائدہ پہنچایا ہے، وہ ہماری بدیسی یونیورسٹیوں نے ساٹھ اور ستر سال کی زندگیوں میں بھی نہیں پہنچایا، حیدر آباد میں علی انقلاب ہو گیا ہے، تصانیف، تحقیقات اور جدت خیالات کی نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے، اور پیدا ہونے کی اُمید ہے،

آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کا وائس چانسلر حیدر آباد کی اس تعلیمی شہر کا ناخدا تھا اگر وہ ہمت کرے تو کول کی سرزمین میں بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو دکن کی سرزمین میں ہو رہا ہے، اصطلاحات کی تشکیل ختم ہو چکی ہیں، علوم کی قابلِ نصاب کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، اور ہو سکتی ہیں، اور اب اچھے سے اچھے زبان دان اور مستند پروفیسر ہاتھ آسکتے ہیں،

بیشک بعض نئی کتابوں کے ترجمہ کی دقت اٹھانی پڑے گی، لیکن اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اردو کے موجودہ اداروں سے امداد و اعانت لی جائے، اور باہمی اشتراکِ عمل سے اس کام کو انجام دیا جائے، خود جامعہ عثمانیہ نے اپنی بہت سی کتابیں انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ اور دارالمصنفین کے بعض ممبروں سے ترجمہ کرائی ہیں، اور وہ پسند کی گئی ہیں،

اردو کے موجودہ ادارے

اس وقت اردو کی خدمت کے لئے ملک میں متعدد مجلسین قائم ہیں، اور ہر ایک اپنی اپنی بساط بھرا اپنے فرائض انجام دے رہی ہے، اردو کی خدمت

کی سب سے پرانی مجلس انجمن ترقی اُردو و ہجو تیس سال سے برابر اپنے کام میں لگی ہے، اور اس وقت تک تقریباً ستر کتابیں جنہیں زیادہ حصہ ادبیات کا اور پھر سائنس کا ہر وہ شائع کر چکی ہے اس کے بعد دارالمصنفین ہے جس نے اپنی اٹھارہ سال کی عمر میں پچاس کتابیں شائع کی ہیں جن میں بڑا حصہ اسلامی تاریخ، اسلامی علوم اور جدید فلسفہ کا ہے، عمر میں تیسرا اور کام میں سب سے پہلا درجہ عثمینیہ کے دارالترجمہ کا ہے جس نے اپنی سولہ سترہ سال کی محنت میں سائنس، ریاضیات، سیاسیات، فلسفہ، طبعیات، تاریخ اور مختلف علوم و فنون کی درسی کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈمی کا نام بھی لینا چاہئے جس نے بعض فلسفیانہ تراجم اور اقتصادیات کی اور بچوں کی تعلیم و تدریس اور مطالعہ کے لئے تاریخی، مذہبی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں، آخر میں ہم ایک اور ادارہ کا نام لینا چاہتے ہیں جو کاشمار اب تک اردو کے مسنون میں نہیں، حالانکہ حق یہ ہے کہ ہم اس کے خدمات کا کم از کم اعتراف کریں، یہ اسلامیہ کالج پشاور ہے جس کے بعض اساتذہ نے ہماری زبان میں سائنس اور خصوصاً فلکیات پر متعدد کتابیں پیش کی ہیں، آئینسٹن کے نظریۂ اضافیت اور ریڈیو پر ضخیم کتابوں کا معاوضہ اور اجرت کی توقع کے بغیر لکھنا اور چھاپ کر شائع کرنا، ہمارے خالص شکریہ کا مستحق ہے،

جی چاہتا تھا کہ اس موقع پر مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی ہوتا، جہاں کے اساتذہ بھی انفراداً کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، مگر سوال اردو کا ہے؟ میری ایک ذہنی تحریک ہے کہ مسلم یونیورسٹی سیریز کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے، اور جو باہتمام مولانا مقتدا خان شروانی، چھپ کر ملک کو اپنے کارناموں سے روشناس کرائے، میر ولایت حسین

صاحبِ خدا ان کی عمر میں برکت دے گا وہی دینگے کہ جب علی گڑھ کالج بکڑ پو اور دو کی مستند
تصانیف کا تنہا ذخیرہ تھا، وہ کالج کے لئے ذریعہ امداد تھا، یا بارودش بہر حال مسلم یونیورسٹی
میکرین، حیوانیات اور طبیہ کالج میگزین اس یونیورسٹی میں ہماری امیدوں کا سہارا ہیں،
عزیزانِ جامیہ اہلین! آپ کی تعلیم گاہ پچاس سال تک مسلمانوں کی اُمیدوں کا قبلہ
رہی ہے، اور اب بھی ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ یہ قبلہ اپنا منہ مغرب کے پھیر کر مشرق کی طرف
کر لے، اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھے، یہ درس گاہ تمام
ہندوستان کے اسلامی صوبوں کا نچوڑ ہے، اگر اس زبان کی اہمیت نے اس درس گاہ کے دل
پر قبضہ پالیا، تو پورے ہندوستان کا میدان اس کے ہاتھ میں ہوگا، دیکھنے والوں کو
ہندوستان کے تعلیمی مطلعین عظیم انسان انقلاب کا غبار اڑا دکھائی دے رہا ہے، اس کیلئے
ابھی سے تیاری کرنا ہے،

ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہیگا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائیگا
اتنا ہی اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا
کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہشیار رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا
رہے ہیں، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے، مگر
ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا
ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکیگا،

عزیزو! ملک کے سیاسی لیڈر سیاسی سوراخ کے لئے لڑ رہے ہیں، آؤ ہم تم ملک کے ”زبانی سوراخ“

کے لئے اپنی جدوجہد شرمع کریں، ہمارے وطنی بھائیوں نے غمِ رسخ کر لیا ہے، اب تم کو اپنے غمِ رسخ کا اعلان کرنا ہے،

چند شے | ہم کو یقین ہے کہ اگر اس زبان کے حافی تھوڑی سرگرمی دکھائیں تو اس بنا پر کہ اس زبان کی طبعی صلاحیت ہندوستان جیسے ملک کے بالکل مطابق ہے، یہ زبان بھی ہر مخالفانہ کوشش کے باوجود اس ملک میں پھیل کر اور بڑھ کر رہے گی، ضرورت ہے کہ اس زبان کے اہل قلم اور زبان دان اس زبان کی آسانی اور سہولت کیلئے کچھ اصلاحات قبول کر لیں،

۱۔ اس سلسلہ میں ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام "اردو" جو صرف سب سے بڑے سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یکتہ م چھوڑ دیں اس کا نام ہندوستانی رکھیں اور اسی کو شہرت دے کر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب و موسوم ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اہل بی نام جس سے قومی و ملی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجائے اس کا "ہندوستانی" نام ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی رُح رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک کے تعلق ہوا اور وہ پورے ملک کی تہذیب و زبان ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بچتا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں ہے، ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں فرشتہ کی زبان سے یہ فقرہ آپ کو سنایا "بنوئے فارسی را خوب می گفت کہ تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"

دیکھئے کہ اس زبان کا یہ نام کتنا قدیم ہے، شاہجہان کے دربار میں غل خان گویا کا نام اس صفت کیساتھ آتا
 ”درین عہد سعادت ہمدرد نغمہ سرایان ہندوستانی زبان است۔“ (بادشاہ نامہ لاہوری صفحہ ۲۸۱)
 ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کرینگے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کی
 تصور کی ترجائی کرے گا، اور مغلوں کے لشکر کی استیلا کی تاریخ کو جو لفظ اردو میں بھی ہے، جو کونجائی دیکھتا ہے،
 ۲۔ اردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو لفظ اگر مل چکے
 ہیں، اور وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھو
 کرائے نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رولج دینے سے پرہیز کرنا چاہئے، والا یہ کہ عربی
 اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی مانگنی کی ضرورت پیش
 ۳۔ لفظوں کی عربی اور فارسی جمع، اور واو عطف اور فارسی اضافتوں سے جہاں تک
 ہو سکے بچا جائے اور ان کی جگہ ہندوستانی جمع، اور عطف اور اضافت کو رولج دیا جائے
 ۴۔ ہندی کے ان لفظوں کو جو ہندوستانی میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اول
 ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سینکڑوں
 اچھے اور پیارے لفظ تھے جن کو نکال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے، اب آج کل کی
 نئی تحریک میں، پرچار، پریم، دیس، سوراج، سماج اور ایسے بیسیوں لفظ ہیں جو ہمارے
 سیاسی مفردوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور وہ ہم کو اب بھنی اور بیگانہ نہیں لگتے،
 عزیزانِ جامعۃ المسلمین! ”یہ ادبی وعظ“ جو کافی حد تک لمبا ہو چکا ہے، بہتر ہے کہ
 لمبا نہ ہو، ہم اپنے اس طولانی بیان کی معافی چاہ کر، آپسے رخصت ہوتے ہیں،

خطبہ صدر ہندونی ایڈمی

۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء کو بھام لکھنؤ ہندونی ایڈمی کی
پانچویں اردو کانفرنس میں پڑ گیا،

لکھنؤءِ نسبت | شرفائے علم و ادب! کرم فرمائی کامنوں ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی و ادبی مجلس
میں ایک حقیر کو پائین سے اٹھا کر صدر میں بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھاتی
ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ
سے علم و ادب کا گوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو لکھنؤ
وطن کی نسبت حاصل نہیں لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی شوق رہا ہے
وطن ہی کے مانند ہے اسی کی گود میں میرے ہوش و تیز کی نکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری
تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین
کا ہر گوشہ میرے لئے مافوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے،

مفاہقت کے دلغ | خوشی اور غم تو ہم ہیں، اس خوشی کے موقع پر ان چند دوستوں کی یاد آتی ہے
جو اس سال ہم کو اپنی دائمی مفاہقت کا دلغ دے گئے، اور جو خود اس بزمِ ادب کے رکنِ کین
باعثِ زمین تھے، انہی پر ہم چند کا نام اس وقت تک رہے گا جب تک ہماری زبان میں

ان کی کہانیوں کا ایک ورق بھی باقی ہے؟ وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا، وہ اُن کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی، ان کا قلم ہمارے پرانے کیرکڑ اور قومی اُن بان کا سچا قدردان تھا،

اصغر مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے؟ گو اُن کے جسم خاکی کا وطن گونڈا تھا، مگر ان کی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڑھ تھا، اسی ویرانے سے اُن کی شہرت کی بو بکھل کر کے چمن زاروں تک پہنچی، وہیں اُن کا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہیں ان کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہیں سے ان کا نشاطِ روح مطبوع ہو کر نشاطِ عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے ان شعرا میں سے تھے جنہوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رپٹا ہے، اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے،

ان جوانوں کے ساتھ بوڑھے تیر کے فضلِ کمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھ کر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگِ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات ان ہی کے آزمودہ کام ہاتھوں نے ترتیب دیا، سب سے آخر میں لکھنؤ کے مایہ ناز ادیب اور شاعر و مصنف نواب صاحب الملک سید محمد علی حسن خان طاہر کا نام کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعرو سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا،

لکھنؤ کے خدمات | آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں، وہ گو ہمارے پورے ملک کی راجدھانی

کبھی نہیں بنا لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ ہمارے علوم و فنون اور شعروادب کا مدون پائنت
 رہا ہے، اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جن کا ٹیلہ اور ٹیلے پر والی مجدد مشہور ہے، یہاں کے
 سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے ہم دین سہالی سے فرنگی محل کو علم و فن کا وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیوں
 تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیرازہ بند پورب کا دارالعلوم رہا، اور اس نئے زمانے میں سہالوں
 کی نئی عربی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی یہیں بنیاد پڑی، یہاں کا خاندان اجتہاد پورے ملک کے
 طول و عرض پر تہما حکمران ہے،

دلی کے باغ میں جب نثران آئی، تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ
 خوش لحن تھے جنہوں نے اڑاڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا
 سندھ اور پنجاب میں ہوئی، تشو و نوا و کن میں پایا تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور
 سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا،

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی
 میر، انشا اللہ خان، انشا، جرات اور مصحفی وغیرہ نے اودھ کا رخ کیا میر تقی کا خاندان دلی سے پہلے
 ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امرا کی ڈیوڑھیان، اور اہل علم
 کی محفلیں، شعرو سخن کے نغموں سے پر شور بن گئیں، ناخ و آتش، وزیر و صبا اور ان کے شاگردوں
 اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعروادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیے،

شعرو سخن کے چرچون اور شاعروں کے تفریحی جھگھٹوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی محاور
 کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جواہم کام گذشتہ دو

صدیوں میں یہاں انجام پایا اُسی کا اثر ہے کہ اس نے بونی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا ملک سخن کے دو اخیر فرمانروائیں و دبیر نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہل ملک میں تقسیم کرتے رہے،

ناتخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری ہوا کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، ان کے شاگرد والا جاہ میرا وسطیٰ رشک نے صحیح و غلط، تفسیل و سبک لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فضاحت کا معیار بن گئی، سینکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر و انشا کی بارگاہ میں ان کو باطل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلون کے لئے سند پیدا کی، لکھنؤ میں غالبؔ بھی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا جس کا نام نفس اللہ ہے، سیدنا خان کے دریاے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا،

شیخ امداد علی بحر المتونیؒ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہیں ملتا،

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، ان شعرائں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالا مال کیا ہے، سرنا زبان اردو مفید الشعراء، تنقیح اللغات، گلشن فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی دو کتابیں ہیں اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے، افسوس ہے کہ اردو

کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف محدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے حلیل شاگرد نواب فصاحت جنگ حلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ رام پور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو ہماری زبان کی بڑی قیمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازاد میں بھی مستاقون کی آنکھیں اس عروس فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعر و سخن کے ذریعے سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بابرہار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں، اور جو شہرت کی بنا پر زبانِ زودِ خاصِ عام ہیں، مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گناہی ہیں، جن کو اس دور کے قدردان بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں،

عمر حبیب کی تابانی لکھنؤ ہمارے ملک میں سات ہندو پار سے اگر جب اہل یورپ نے اپنے نئے علمی و فنی کے افق میں علوم و فنون کی غامض کی ہے تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش و مسرت کی

شراب سے پرست تھا، اس وقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دساورد کی نئی چیزوں کی قدر کرے اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پران کو بڑا غور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس بیخانہ میں کچھ اہل ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا، اور جو چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ فرنگستان کی دوکانوں سے خرید کر لائے،

یہ سب کو معلوم ہے کہ خالص حالات نے سرکارِ اودھ اور سرکارِ کمپنی کو متحد کر دیا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکارِ اودھ کا وکیل کلمہ تین اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلا

پیوند لگا، اس نے مافی کے رزیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب
سعادت علی خان کے دربار میں سلی صاحب رزیڈنٹ اور انشا اللہ خان کی ادبی نوک جھونک
کی حکایتیں آپ حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں،

سرکارِ اودھ کی طرف سے وکالت اور انشا کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے وہ
عموماً اہل علم کے طبقے سے ہوتے تھے، انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم و فنون سے
آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے تھے، خان علاءہ الفضل
حسین خان ان ہی لوگوں میں سے تھے، وہ گورنمنٹ دے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات و
متوسطات کی تعلیم دی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں ماسٹر فرنگی علی سے حاصل کی، پہلے نواب
سعادت علی خان کے تالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے ان کو اپنا وکیل بنا کر گلکھتہ بھیجا،
اس اثنا میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں، اور جدید ریاضیات و طبیعیات کو حاصل کیا، نواب
سعادت علی خان کے زمانے میں درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم
اور تجربہ و مقابلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں، ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی،

نواب محمد علی خان کے زمانے میں منشی الملک فخر الدولہ ویر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زنجی
نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو ان کے بزرگوں کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہت
لکھنؤ میں آئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کے ساتھ جدید طبیعیات و ریاضیات میں بھی ماہر تھے،
انگریزی سیکھی تھی، صدائق الانجم ان کی مشہور تصنیف ہے، ۱۲۵۳ھ میں تالیف پائی، نئے علم کے لیے نئی
اصطلاحوں کا وضع کرنا ان کا خاص کارنامہ ہے، کہتے ہیں :-

”باید دانست کہ چون ایراد الفاظ یونانی و برطانی (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی بکرو
 و غیر مانوس است، و کتب عرب کیسب بہ مذہب بطلمیوس کہ فیما بین انہ اگر ہم بعضے مطابق با
 لیکن بسیارے مخالف ازان و برتنے مجدد کہ نشانے ازان در تصانیف قدما پیدا نیست ناچار
 بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ یا تصرّف در تعریفات و جزآن چنانکہ عادت مترجمان قدیم
 ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم افتخار ایشان کردہ می گویم“ (ص ۹)
 ان ہی لوگون میں ایک اور قابل ذکر ہستی اسے ممنون لال فلسفی کی ہے، ان کا وطن سندھ تھا
 فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری
 تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہئیت اور حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھپوڑے،
 میں وفات پائی،

سرکار اودھ کی طرف سے جو علما وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، ان میں سے دو نام خاص طور
 قابل ذکر ہیں، مولوی محمد اسماعیل ندنی، اور مولوی محمد حسین ندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم
 فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسماعیل ندنی مراد آباد کے رہنے والے تھے، نواب
 نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے، منطق کی بعض پرانی کتابوں پر ان کے
 حاشیے ہیں، ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے جس میں یورپ کے نئے
 علوم و فنون، جالیج سیل کے ترجمہ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے،
 نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابل تذکرہ ہیں

مولوی عبدالرب اور مولوی کمال الدین حیدر لکھنؤ میں جو یورپین علما رہتے تھے، اُن سے برابر کی
ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں اسی کا نتیجہ وہ رصد خانہ ہے جو ۱۲۴۳ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے
میں جنرل مکلاؤڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانے میں بن کر تیار ہوا، اس
رصد خانے میں کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علما کے علاوہ مولوی عبدالرب صاحب، مولوی کمال
حیدر صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب مراد آبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں
امپیریل بینک کی عمارت قائم ہے،

اب تک ملک میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا
حالانکہ شاہانِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں بھی ایک دارالترجمہ قائم تھا، نئے علوم و فنون کی
کتاہیں یہاں ترجمہ ہو کر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں، اس محکمے کی طرف سے انیس رسالے
چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن میں سے دس رسالوں کے نام ہمیں معلوم ہیں، اُن کی تفصیل
معارفِ ۱۹۱۲ء میں کی ہے، یہ بہت، کمی، مناظر اور طبعیات اور اس کے اقسام، قوتِ طبیعی
علمِ امار، علمِ احوال، علمِ انحرار و غیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بروگم (BROUGHAM)

کی کتاب A TREATISE ON THE OBJECTS, ADVANTAGES &

PLEASURES OF SCIENCE کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے میں چھپا، اور
کے دفترِ صیغہ تاریخ میں میری نظر سے گزرا ہے،

لکھنؤ کی اس علمی تعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اس کی ایک جنرل کمیٹی تھی
جو کتبوں کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی، اور رصد خانہ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی

کہتا تھا، ایک انگریز نے اردو میں فنِ زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا تہہ چلایا جائے اور
آئندہ دہائی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے، اسی عہد کی ایک کتاب
اردو حساب میں لوگارتم ہے، جس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے،

لکھنؤ کی ادبیات | لکھنؤ نے اس کے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں افسوس ہے کہ ان کی

کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں، بادشاہوں کے زمانے میں داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا،
بڑے بڑے زبان دان اور زبان آور بادشاہوں اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھ کر اپنی دلچسپ

داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے، حکیم ضامن علی جلال کے والد
بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانے میں اس فن پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں، اس

وقت کہانیوں کے کردار دیو، پریان اور جاوگر اور ظلم ساز ہوتے تھے، داستان امیر خسرو

نوشیروان نامہ، ظلم ہوش ربا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی اثر
اور زور بیان کا ایک ظلم کھڑا کیا گیا، اس کتابی ظلم کا قتلح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا نمونہ

نہیں کر سکتا، ان کتابوں کے مصنف جن کو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے، میر

محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور تو تارام شایان وغیرہ ہیں، یہ نظم و نثر کے ہزاروں

صفحات حق یہ ہے کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہیں، تشرین سرور کا فسانہ عجائب، اور نظم

میں نواب مرزا شوق اور دیاباں شکر نیم وغیرہ کی شہزادیاں وہ جو ہر پارے ہیں جن سے کبھی ادب اور

کی الماریاں سجائی جاتی تھیں،

امانت کا اندر سبھا متون تک اہل شوق کا تماشا گاہ رہا ہے، اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا، بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا، اور اس کا تماشا پردوں کے ساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ننگون کی تمدنی بدعت بھی پھیل پیدا ہوئی،

میں نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تہمدی تاریخ اس لئے بیان کی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ قدیم و جدید سے مل کر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدائش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی، جو تھرڈ سرتشار، مرزا رسوا، سجاد حسین، مرزا چھو بیگ اور جوالا پرشاد برقی کی تخلیق کا باعث ہوئی، تھرڈ نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرتشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے دم و رواج اور طور و طریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص حلقے کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا بالکل نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد ان ہی کے دم قدم سے پر رونق تھا، لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرتشار کی سیر کسار اور فسانہ آزاد، تھرڈ کی فردوس بریں، اور مرزا رسوا کی امراؤ جان آدا اور سجاد حسین کی حاجی بگلول ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں، مطبعہ | آجکل ادبیات کے سلسلہ تاریخ کی ایک کڑی مطبعہ بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبعہ سلطانی کے علاوہ مطبعہ محمدیہ (۱۲۵۵ھ بعد محمد علی شاہ) محمد یعقوب، مطبعہ علوی علی بخش خان (۱۲۶۳ھ) مطبعہ مصطفائی، محمد مصطفیٰ خان (۱۲۶۱ھ) کانپور (۱۲۶۳ھ) مطبعہ محمدی محمد حسین لکھنؤی (۱۲۶۲ھ) مطبعہ جعفریہ حکیم مرزا جعفر خان (۱۲۶۵ھ) مطبعہ امینی محمد عباس، مطبعہ صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبعے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبعے مطبعہ سلطانی سلطان المطالع کے قانوناً زیر نگرانی

تھے، نورج پراسے متم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد ممدی علی خان بہادر قبول تھا
جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس حمد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے،

مطبوعہ مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجے پر تھا، علما اور طلبہ اس کی چھپی
ہوئی کتابوں کے قدردان تھے، اور اب بھی اُس کی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرافیوں کے
مول خریدی جاتی ہیں،

سب سے آخر لکھنؤ کے اُس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب انٹی برس کے قریب چلی
ہے، اس سے میری مراد نو لکھنؤ کا مشہور نو لکھنؤ پریس ہے، یہ عدد کے بعد ۱۸۵۷ء میں قائم ہوا،
بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی حتمی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں، انکا
مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا، ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی
مطبوعہ سے چھپ کر نکلین، شعرا کے دواوین، ہنویان، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانیں اور
درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غلط جو کثرت کا نتیجہ
ہے اس کی شہرت کے پھرے کا بدنام دلغ ہے،

شعرا کے قدیم، تیسر، سودا، نسخ، آتش، جرات، مصحفی، انشاء، زند، وزیر، صبا، ایس، دیر، میر، نس
آئیر اور آئیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے، اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور
لکے گوشے گوشے میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے،

مطبوعہ تیغ بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ تھا،

اجازت | زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اجازت ہیں، ہمارے شہر اس سلسلے میں بھی پیچھے نہیں رہا،

یہ نین معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس صوبے میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار، اودھ اخبار میں سے نکلا اور جو آج تک نکل رہا ہے، اس کے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۷ء ہے، اور یہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان پر واز چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شمر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے،

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا، تیسرا حسین بن کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اس کے اڈیٹر تھے یہ وہ اخبار ہے جس کے صفحہ میں منشی احمد علی کسندوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور و طریق سے آگاہ تھے، روشناس ہوئے،

سرخیدہ اخباروں میں مشرقیہ (مرتبہ مولوی غلام محمد خان پیش ۱۸۸۳ء) اور ایلینہ اور آزاد، اخبار بھی گزشتہ صدی کے ادیبوں کی پیروار میں جن ہوئے، آزاد آخرین اودھ پنچ کا خیمہ ہو گیا تھا، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بے کار ہو چکے تھے، اُس وقت اس آزادی چند ماہ شکلی، اڈیٹر کا فرض چند دوستوں کے ساتھ مل کر میں نے بھی ادا کیا تھا،

اردو کے سب سے پہلے آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا، لنگھا پرشاد وٹا اس کے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانے میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولانا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے، اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے،

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۷ء میں اس
صوبہ کا سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مظہر گزٹ بھی عین سے نکلا جس کے ایڈیٹر مرحوم وحید الدین
سیلم اور اس کے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی تھے،

رسالے | رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں
کا سب سے پہلا ادبی رسالہ مختصر ہے، جو مولوی عبدالکلیم تھریک پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ ۱۸۸۷ء میں نکل کر
دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۸۸۷ء میں شیر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا، جو اپنے زمانہ
میں جدید طریق تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار
ادیب اور شاعر پیدا کئے، تشریفی کا سلیقہ سب سے پہلے شیر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں
میں پیدا ہوا،

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، نشی تارحین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک
زمانے میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد
کے بڑے بڑے شعراء، امیر، داغ، جلیل اور تسلیم وغیرہ اور ان کے ہا کمال شاگردوں کی غزلین
چھپتی تھیں، یہ انیسویں صدی کے واسط میں جن عشق کا تنہا پیا بسر تھا جس کی باتوں کو سن کر
خدا جانے کتنوں کو عروسِ سخن کا شیدائی بنا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا
اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خان کی ایڈیٹری میں ہر دوئی
سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریت سمجھنا چاہئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت
شہرت رکھتے تھے، اور ان کا قلم وقت کا سامان اور سینہری دکھانے میں خاص ملکہ رکھتا تھا،

اوپر کے صفحہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس شہر کی اُن انفرادی کوششوں کا ذکر تھا جنہوں نے اس زبان کو ملک میں مقبول اور ہر لفظ بنیاد دیا، لیکن اب جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے، اب ہر چیز اسی پانی سے نشوونما پا رہی اور بڑھ رہی ہے، اسی لئے زبان کی ترقی میں بھی اب شخصی کوششوں کے بجائے قوم کی یکجائی کوشش کی حاجت ہے، میں چاہتا تھا کہ تفصیل سے آگے کے کام کا نقشہ پیش کروں، مگر وقت کی کمی کا خیال کر کے اختصار کے ساتھ اپنا مدعا عرض کرتا ہوں،

۱۔ ہم کو اپنا لٹریچر اس لئے ناچیز معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہمارے سامنے ہماری بچھی کوششوں کے ثمرے ایک جگہ نہیں ہیں، اس لئے ایک وسیع کتب خانے کا قیام نہایت ضروری ہے، اس غرض کے لئے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ ہندوستانی اکیڈمی اگر پورے ہندوستان میں نہین تو یوپی گورنمنٹ کا ایک جرنل کی حیثیت سے آئندہ اسمبلی میں یہ تجویز پیش کرائے کہ برٹش میوزیم لائبریری کے اصول کے مطابق صوبہ یوپی کا ہر مطبع ہر کتاب کا ایک ایک نسخہ اس کے کتب خانے کے لئے کلکٹر ضلع کے دفتر میں پیش کرے،

۲۔ ہم کو ہندوستانی زبان کی ترقی کے لئے اس پرانے خیال کو دل سے نکال دینا چاہئے کہ یہ زبان فارسی یا سنسکرت سے پیدا ہوئی ہے یا وہ کسی بھاشا کا غمیمہ ہے، بلکہ وہ خود ایک مستقل زبان ہے، جس کے الفاظ خود اسی کے ہیں، اور جس کے قواعد خود اسی کے ہیں، یہ نکتہ ذہن میں نہ رہنے کے سبب ہم میں سے بعض صاحبوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی لفظوں کی صحت اور غلطی کی پہچان عربی، فارسی یا ہندی اور سنسکرت سے کرتے ہیں، اسی اکیڈمی کے ایک لائق

صدر نے ہندوستانی میں موت اور روح وغیرہ لفظوں کو مونث ماننے میں اس لئے شک کیا کہ اصل سنسکرت میں وہ مونث نہیں، اسی طرح میں نے ایک دفعہ جب عربی اثر کی ہندوستانی جمع اثرات استعمال کی، تو الہ آباد کے میرے ایک لائق اور پرانے اہل قلم دوست نے اس لئے مجھے ٹوکا کہ عربی میں اُس کی جمع اثرات نہیں بلکہ آثار ہے، حالانکہ ہماری زبان میں لفظ اثر کی دو جمعیں دو معنوں میں آتی ہیں، عربی میں آثار کے کچھ ہی معنی ہوں مگر ہندوستانی میں اس کے معنی قرینے کے ہیں، آثار یہ ہیں، آثار یہ معلوم ہوتے ہیں، اور اثرات کا لفظ نتیجے کے معنی رکھتا ہے، اس لئے ہمیں ہندوستانی زبان کو مستقل زبان مان کر اس کی خود مختاری کا اعلان کر دینا چاہئے۔

اسی طرح لفظ "اصل" کو دیکھئے جس کے معنی عربی میں جرٹے ہیں، اس کی جمع عربی میں اصول ہے، مگر اردو میں اصول ایک مفرد لفظ کی طرح قاعدے کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور اس کی جمع اصولوں بنائی جاتی ہے، خود قاعدہ کے عربی معنی بنیاد کے ہیں، اس کی جمع قواعد ہماری زبان میں دو معنوں میں آتی ہے، جب اس کو جمع بولیں تو اصول کے معنی میں اور مذکر اور جب مفرد بولیں تو فوجی قواعد کے معنی میں وہ مفرد ہے اور مونث،

”مواد“ کا لفظ ”ماوہ“ کی جمع ہے، مادے کے لغوی معنی ہیں پھیلنے والی چیز اور اصطلاحی معنی میٹرکین اب مواد کا لفظ ہماری زبان میں مفرد ہے، اور نظم کی آلائش کے معنوں میں ہے اور میٹرک کے معنوں میں کسی مضمون کے ضروری معلومات اور مسالے کے لیے بھی وہ بولا جاتا ہے، خود مسالے کی اہلیت عربی میں مصارح ہے، اور وہ مصلح کی جمع ہے یعنی وہ چیزیں جو کسی کھانے کی اصلاح کے لئے اس میں ملائی جائیں، مگر اب وہ ہماری زبان میں مسالا لکھا جاتا ہے،

(دمس ال ا) اور لکھا جانا چاہئے، اور اب وہ کھانے کے مسالے کے ساتھ ہر مضمون کا مسالا بن گیا ہو
عربی کا مشعل ہمارے زبان میں مثال بن گیا۔ ہے،
ایسی ہی مثالیں ہندی سے بھی دی جا سکتی ہیں،

۳۔ آخری مثالوں میں یہ بات بھی ہمارے بزرگ کچھ کچھ قبول کر چکے ہیں کہ عربی میں کسی لفظ
کی اہلیت کچھ ہو اور اس کا املا بھی کچھ ہو مگر ہماری زبان کے استعمال میں اگر اس کا تلفظ اور املا بدل
گیا ہے تو وہی تلفظ اور املا ہماری زبان میں صحیح ہو گا، اب جیسے ہم مصالح کو مسالا اور مشعل کو
مثال لکھتے اور بولنے لگے ہیں بلکہ صحیح کو بھی ہم نے سہی کر لیا ہے، ذرہ ذرہ اور طیارہ طیارہ ہو گیا
ہے، تو کیا اسی قسم کی کمی بیشی ہم دوسرے لفظوں میں نہیں کر سکتے؟ فارسی والوں نے عربی کے
مصدر وں کے آخر میں سے ت کو نکال دیا ہے، مثلاً مدارۃ سے مدار، محابۃ سے محابا، یا تماشۃ کو
تماشا، بجلی کو تجلا، یا اسم فاعل کے آخر سے ی کو گرادیا، مثلاً محاذی کو محاذ کر دیا، اور اب ہم بھی محاذ بولتے
ہیں، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستانی اُن میں تصرفات نہ کریں، جیسے جن مصدر وں یا
لفظوں کے آخر میں ع ہو ہم ہندوستانی اپنے ہندوستانی بھائیوں میں اُن کو نہیں بولتے، تو اگر ان کو
لکھتے ہیں بھی گرادیا جائے تو برا کیا ہے؟ جیسے اطلاع کو اطلاع، اجتماع کو اجتماع، اتباع کو اتباع، نزاع کو
نزاع، انتزاع کو انتزاع، مطلع کو مطلع اور متبع کو متبع وغیرہ،

۴۔ دلی اور لکھنؤ کے استادوں نے ہمارے لیے ایک اور مثال متروکات کی چھوڑ دی ہے
یعنی بہت سے لفظوں کو ثقیل یا مانوس سمجھ کر چھوڑ دیا یا لگساں باہر کر دیا ہے، جیسے تلک تبہن،
دکھلانا اور جھلانا وغیرہ، کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی ہم اس اصول سے کام نہ لیں، "نطقاً کا لفظ ماننا اور

کے معنوں میں پہلے بولتے تھے، مگر اب نہیں بولتے، اس لئے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ان
 موٹے موٹے لفظوں کو جن کے کام میں لانے کی ضرورت سرے سے نہیں اور وہ اسی لئے
 بولے یا لکھے گئے، کہ ان سے ان کے لکھنے اور بولنے والے کی مبالغہ ظاہر ہو، ان کو اپنی دشمنی
 سے الگ کر دیں، اور ان کو کس سال باہر سمجھیں،

۵۔ ان موٹے موٹے نامانوس لفظوں کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ بڑے
 بڑے اہل علم اور خصوصاً یورپ کے فاضل بہت سے معنوں اور چیزوں کے ٹھیسٹ ہندوستانی لفظوں
 سے واقف نہ تھے، یا نہیں ہیں، وہ ان کی جگہ پر عربی و فارسی کے لفظ جیسے تقاطر، امطار، ادا
 ریان، بدوشو، ربولی کر اپنی ناواقفیت پر پردہ ڈالتے تھے، اور اب بھی ڈالتے ہیں، اسی لئے
 یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا لغت لکھا جائے جس میں عربی و فارسی کے مشکل لفظوں
 کے مرادف ٹھیسٹ ہندوستانی لفظ ہوں، اس کام کو لکھنو اور دہلی کے اہل زبان بہتر کر سکتے
 ہیں، اور پھر وہ لفظ پورے ملک میں پھیل سکتے ہیں،

۶۔ اس قسم کا لغت نئی اصطلاحوں کے بنانے میں بھی کام آ سکتا ہے، آپ دیکھیں کہ
 چھاپے کا فن بالکل نیا ہے، اس کے سارے پرزے اور کام کی چیزیں سب نئی ہیں، مگر چونکہ یہ فن
 پڑھے لکھے ارباب لغت کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ ان پڑھ جاہلون کے ہاتھوں میں رہا ہے، اس
 لئے انھوں نے اس کے لئے کسی ایکٹیلی کی طرف رجوع کئے بغیر سارے لفظ اور اصطلاحیں بنا
 جو سب کی سب ہندوستانی ہیں، یا ہندوستانی کر لی گئی ہیں، جس کا غدر لکھا گیا وہ کافی، اسکی
 غلطیاں دیکھی گئیں تو تصحیح، ان غلطیوں کو کا تب نے درست لیا تو ترمیم، اس کی نقل پھر پرستہ

نئی تو پروف، دوسری دفعہ اتار گیا تو مطابق تیسری دفعہ دکھایا تو مطابق، چوتھی دفعہ دکھایا گیا تو
چٹا طبق، پتھر سے حروف اڑ گئے تو چھن گئے، کاپی کو گرم پتھر پر رکھ کر دبایا تو کاپی کو جمایا، کاپی کے
حروف بگڑ گئے تو کچل گئے، غرض اسی طرح ان ان پڑھوں نے اپنی ساری ضرورتیں پوری کر لیں
اور اصطلاح بنانے والوں کے ہاتھ نہیں دیکھتے رہے،

۷۔ ہمارے ہندی کے دوستوں کو شکایت ہے کہ ہم ہندی کے لفظ قصداً چھوڑے ہیں
حالانکہ بات یہیں ہے، زبان کا سارا دار مدار لفظوں کے چلن پر ہے، ہندو مسلمان آپس میں
جتنسا ملین گے اتنے ہی فارسی اور ہندی کے لفظ گھلین ملین گے، چنانچہ جب ہمارے بزرگ کسب
خوب گھلے ملے تھے، دیکھیے کہ سینکڑوں ہندی کے لفظ مسلمانوں کی زبان پر اور سینکڑوں عربی
فارسی کے لفظ ہندوؤں کے قلم پر چڑھ گئے، وئی کے زمانے کی زبان دیکھیے، اس میں آج سے
سنتے زیا وہ ہندی لفظ ہماری زبان میں تھے، آج تو ہندوستانی میں فارسی عربی لفظوں کی ملاوٹ
کے گنہگار مسلمان ہیں، مگر ہندو مسلمان دونوں سے الگ سات سمندر پار کے ایک بے لاگ
کی گواہی سنئے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ۱۹۲۹ء کے اڈیشن میں ہے،

”اردو کا یوں شدید طور پر فارسیت آمیز ہو جانا ایرانی اثر سے زیادہ ہندی اثر سے تھا، اگرچہ
اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی تھا، تاہم اس میں فارسی عنصر کو کثرت سے داخل کرنے والے
اُن ایرانیوں یا ایرانی مترادفوں سے زیادہ وہ ہندو عمال تھے جو حکومت مغلیہ میں ملازم
اور فارسی دان تھے، کیونکہ وہ (ایرانی اور مغل) صدیوں سے اپنے علم و ادب کے لئے صرف

اپنی ہی فارسی زبان استعمال کرتے آئے تھے،“ (ص ۵۷۰، جلد ۱۱)

لیکن یہ بھی اسی لئے ہوا کہ فارسی تعلیم یافتہ ہندو عمال بکثرت مسلمان افسروں سے ملتے جلتے تھے، تو ان کے لفظ ان کی زبانوں پر چڑھ جاتے تھے، اسی طرح جو مسلمان صوفی، درویش اور عام لوگ بلکہ بادشاہ تک جو کثرت سے ہندوؤں سے ملتے تھے ان کی زبانوں پر ہندی الفاظ بڑی آسانی سے چڑھ گئے تھے، لیکن اکبری اور فارسی کی دوسری مغل تاریخوں اور صوفیوں کے ابتدائی دکنی اور گجراتی ہندوستانی کلام میں اس کی جھلک معلوم ہوتی ہے، آج سے صدیوں پہلے خواجہ نصیر الدین منہنگین کہتے ہیں،

اک سوچئے کیوں ہوے بہرہ پ	ہرہ پ میں دیکھ انوکھے روپ
جگہے تو یہ جگہ دستا ہے سارا	جگہ میں تو سکل جگت اندھارا
جس جگہ میں گیان کی اچھی جوت	اس جگہ کو سمجھے کہ جودہ لایوت

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک ہندو مسلمان مل کر ایک سیاسی تحریک میں شریک تھے، ہر جگہ مل کر وہ ہر مجمع میں جن میں ہندو مسلمان دونوں ہوتے تھے، تقریریں کرتے تھے اس موقع پر اپنی تقریر کا اثر بڑھانے اور مجمع کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے دونوں قوموں کے بارے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ ان کی ہر بات دونوں سمجھ جائیں، اب ہندو مجبور ہوتے تھے کہ ترک موالات بولیں اور مسلمان مجبور ہوتے تھے کہ اس کے لوگ کہیں، چنانچہ اس زمانے میں سوامی نرج، سامراج، اندولن، پرستاو، چٹاؤ، راج نیتیک، سبھاپتی، کرپا، شانتی، سماج اور پریم کے لفظ بے تکلف بڑے بڑے جبہ و دستار والے بولنے لگے تھے، ایسے ہی ہندو دوست عربی اور فارسی کے سیاسی لفظ بے اختیار استعمال کرنے لگے تھے،

۸۔ اسی لئے میری یہ تجویز ہے کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے اور اُن کے ہم معنی ہندوستانی لفظ لکھے جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی میں شامل ہوں۔
 ۹۔ ہم کو ہندو دوستوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ بھی ہندی کے بڑے بڑے لفظ بولتے ہیں، مجھ کو ہندو دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی اُن کے جملوں میں جانا پڑا ہے، اور بعض بعض ایسے انگریزوں کی تقریریں سنی ہیں جن کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا ہے، اور اُس پر مزہ یہ کہ تجویز کی تائید بھی میرے ذمے تھی،

ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالرا اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے، لیکن اگر انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو میں نہ اُن کی سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ میری، کیا مجھ کو اولاً اُن کو کوئی ایک ٹیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے؟ ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی طرح ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے ہندو دوستوں کی یہ کوشش کہ پھر ہندی لفظ کو اسی روپ میں بولیں جس میں وہ ٹھیک ہندی میں بولا گیا ہے، یہ طرح کا بڑا ظلم ہے، میں ایک مثال دیتا ہوں، لیکن کے معنی میں "پرتو" ایک ہندی لفظ ہے، وہ اردو میں کٹ چھنٹ کر "پڑ" ہو گیا، اب اسی جگہ پر "تو بول کر بے پر کی اڑانی کمان تک درست ہے" ہر کلام میں "اور" کی ضرورت کتنی دفعہ ہوتی ہے، یہ "اور" ہندی کا لفظ ہے جس کو اردو نے قبول کر لیا مگر اس لئے کہ یہ اردو میں چل گیا ہے، اس کو چھوڑ کر "تھا" بولنا کتنا تک اچھا ہے؟ "پانی" ہندی کا لفظ ہے اور فارسی والے اتنے پرانے زمانے سے اس سے مانوس ہیں کہ سنائی (۱۵۴۵ء) اور سعدی (۱۱۸۵ء) نے اپنی زبانیں اسی پانی سے سیراب کی ہیں، مگر اب لفظی چھوت کے ڈر سے پانی

کا لفظ بھی آپ چھوڑ دین اور بدل پینے لگیں تو یہ کتنی بے گانگی ہے ؟

۱۰۔ ہماری پرانی اردو میں جب وہ کوٹھی یا گوجری یا ہندی کہلاتی تھی، ہندی کے سیکڑوں پیارے اور میٹھے لفظ تھے جو اردو کے چلن سے بعض نفاست پسندوں نے نکال دیئے جیسے موہن، موہ، سجن، بجن، پریم، داس، ریت، بس، روگ، پریت، درپن، جگت، برہ، پاک، کھن، پی، چھب، پیما، لٹک (ادا)، سنسار، دیا، چرن، پتیم، ادھاک (بہت)، ندھڑک (بے دھڑک)، نگر، آپاس، میا، (مروت)، نیٹ، درس (دیدار)، پریت، وغیرہ، ان لفظوں کو دوبارہ کام میں لانا چاہئے،

۱۱۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لفظوں کے لینے اور نکلنے میں عربی و فارسی یا سنسکرت و ہندی کی ڈکشنریوں کو کسوٹی بنانا اور ان میں سے دیکھ دیکھ کر لفظوں کو چننا اور کام میں لانا ہماری مشترکہ ہندوستانی زبان کے حق میں زہر ہے، اس کی سچی کسوٹی رولج اور چلن ہے ! آج جو لفظ عربی، فارسی، ترکی، ہندی، مرہٹی، گجراتی، پنجابی اور انگریزی کے عام طور سے برتنے جا رہے ہیں، وہ ٹھیک ہندوستانی لفظ ہیں، ان کو اسی لفظ کے ساتھ بولنا چاہئے جس کے ساتھ وہ بولے جاتے ہیں، ہمارے نامور شاعر غالب نے نمبر کو لمبر باندھا،

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

اس سے محاورہ بنا، لمبرے جانا، لمبر چھیننا، تمیر لگانا،

”ریپورٹ“ انگریزی لفظ ہے، تھانے والوں کی زبان میں یہ رپٹ ہو گیا، اور اس کے

خاص معنی ہو گئے، یہاں تک کہ سان، العصر اکبر نے کہا،

ہٹ لکھوائی ہی، یارون نے جا جا کر یہ تھانے میں کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں دوسرے انگریزی لفظوں میں بھی اسی قسم کا تصرف کیا گیا ہے، اور وہی صحیح ہے، عربی ۱۱ فارسی لفظوں کا بھی یہی حال ہے، بلکہ خود عربی و فارسی زبانوں کا قاعدہ بھی یہی ہے جس کو تعریب یا تفریس کہتے ہیں، اسی اصول پر سنسکرت اور ہندی کے لفظ بھی جس شکل میں ہندوستانی بول میں آگئے ہیں ان کو پھر سنسکرت اور ہندی کے اصلی روپ میں بولنے اور لکھنے کی کوشش بنی بنائی زبان کو بگاڑنا ہے، اور یہ کرنا ہے کہ دوسری قومیں ان کی بات کو نہ سمجھ سکیں! اس کو آشا، برہمن کو برہنڑ اور گن کو گنٹھنا ادبی پاپ ہے،

عربی میں لفظ "شہوت" مطلق خواہش کے معنی میں ہے، جو کھانے پینے، مطالعہ کتاب ہر ایک کے ساتھ بولا جاتا ہے، مگر ہماری ہندوستانی میں ایک خاص معنی میں بولا جاتا ہے، اور اس سے اٹھنا بننا یا گیا ہے جو کھانے کی رغبت کو کہتے ہیں یہ بھی اس معنی میں عربی نہیں مگر یہ دونوں ہماری ہندوستانی کے لفظ ہیں اور صحیح ہیں،

عربی میں "مشکور" اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے جو کسی کا شکریہ ادا کرے اسی لئے "مشکور" کی جگہ بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ "شاکر" یا "مشکر" بولنا چاہتے ہیں، مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنی چاہئے خود لفظ "شکریہ" کو دیکھیے، اصل عربی ہے، مگر شکل عربی نہیں، اب اس سے ہم نے دو لفظ بنائے ہیں، شکر اور شکریہ، خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور انسانوں کا شکریہ، وہ ناشکر ہے جو زبان کی اس توسیع کی نعمت کی قدر نہیں کرنا چاہتا،

۱۲۔ ہمارے علم و فن کے ماہرون کی ایک فوج ہے کہ وہ اپنے لئے کسی لفظ کو اس وقت تک علمی اصطلاح بننے کے قابل نہیں سمجھتے جب تک اس میں بیگانہ پن اور موٹاپن نظر نہ آئے، مثلاً دو دریاؤں کا میل جہان ہو اس کے لئے ملتی الجھن، یاد دہا میں جہان پانی پینے کے لئے جگہ ہو اس کو دریا کہیں گے، حالانکہ پہلے کو آسانی سے سنگم اور دوسرے کو نچکھٹ کہہ سکتے ہیں، ڈال کے کو دھوپ کی جگہ ساعت شمسیہ یا دائرہ ہندیہ کہنا ظم ہے، ہمارے عوام نے ریل، جہاز، ہوائی جہاز، گھڑی، گھڑ کی سوئی، سینکڑوں لفظ بنائے مگر ان کو قاموس دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی، ہم جانتے ہیں کہ علمی اصطلاحات میں وقتیں ہیں، مگر یہ آسانی سے ممکن ہے کہ اصطلاحات میں جہاں تک ہونا چاہئے جیسے ہی حال ہندی کے بعض فاضلوں کا ہو کہ انھوں نے بھی نئی ضرورتوں کے لئے سنسکرت ہندی کے شبد ساگر کا غلط لگایا، موتی اور پتھر جو ان کے ہاتھ میں آگیا اس سے ایک مصنوعی زبان بنا میرے ایک تعلیم یافتہ ہندو دوست نے بتایا کہ ہندی کے شاعر ڈکشنری دیکھ دیکھ کر لفظ چنتے ہیں، ان کو شعر میں باندھتے ہیں، اور کہنے کے بعد وہ خود بھی نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم نے کیا کہا، غرض کہنا یہ ہے ہم ہندوستانی زبان کے لفظوں کے پرکھنے کی کوئی دوسری زبانوں کی ڈکشنریوں کی جگہ روا اور چین کو بنائیں، چلتے ہوئے سکون کو قبول کریں اور کھوٹے کو پھینک دیں،

آخر میں یہ کہنا ہو کہ اس ہندوستانی کو ہندو مسلمانوں کی ایک زبان بنانے کیلئے ضروری ہو کہ دونوں ملکوں پرانیوں اور جہاں تک ہو سکے اس کو آسان اور سب کی سمجھ میں آنے والی بنانے کی کوشش کریں اگر ایسا نہ کیا تو ہندو مسلمانوں میں آپس میں بات کرنا بھی محال ہو جائیگا، انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال پر مال کے بل پر دو تہہ بننے کی آرزو ہو!

ہماری زبان کا نام

یہ تقریر آل انڈیا مسلم کونسل کانفرنس کے شعبہ اردو میں ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو

اسٹیرچی ہال مسلم یونیورسٹی علیگڑہ میں کی گئی

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھتے، مزاج بننے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں،

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے ہندوستان کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحر شہد کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کا نام یہ نام تھا، اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے آج اپنے کو ہندوؤں کے نام سے ایک قوم بنالیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا، اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں سندھو اور سند کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا، اس ملک کے دوسرے بھری ہمسائے

کی زبان میں دو لفظ تھے، السند والسند کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سند کے کناروں تک کو وہ سندھ اور گجرات اور لار سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند کہتے تھے اس ہند نے یورپ جا کر اندکی اور اند نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی، ہند والون کو عرب ہندی، اور خراسانی ہندو کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع ہندو اور خراسانی ہندوان بناتے تھے،

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہل عرب نے اس ملک کو ہند کا اہل خراسان نے ہندوستان کا نام دیا، لفظستان جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت میں بولتے ہیں، اس لئے ہندوستان ہندوستان بھی ہو سکتا تھا،

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبہ کی بولی الگ الگ تھی لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا، یعنی ہندی یا ہندیہ،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کا ایک نام ہند یا ہندستان اور یہاں کی بڑی بولی تو ایک کا ایک نام ہند اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہاں کے

رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیدن کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا، ان اس ملک میں عرب، عری، ایرانی فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی نو

کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تہا تہا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے

لگے جس کا نام انھوں نے ہندی یا ہندی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اسکو

اگرچہ جی، دکن میں دکنی اور اردو میں آدھی کہنے لگے لیکن صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا۔ مین نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں،

شاہجہان کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلیٰ کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار نئی دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئے معلیٰ کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کیساتھ "زبان اردوئے معلیٰ" کہنے لگے اور آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے زبان اردوئے معلیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبان اردو" یعنی اردو کی زبان بنی اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اردو" ہوئی،

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پائے پھیکے، دور بینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھیں جبکہ تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اس کو بچھ دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کی کوششیں شروع کیں اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی کو رکھ کر دونوں کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی اٹھارہویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگر دن کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خدا کی پتیلے فولادی سپاہی بنکر ملک کے طول و

مین مرنے کٹنے لگے،

ہندو بھائیوں کے دلون مین یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ مین ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور بعض صوبوں مین یہ کیا گیا کہ اردو خط نامک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شعاعوں نے جس بھاشا مین کچھ مذہبی نظمیں کہی لکھی تھیں وہی پڑے ملک کی زبان بنا دی جائے،

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت مین جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دس کی زبان، اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو، بہر حال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں، اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور جس سے خط کو ہندی کہتے اور اس نام کو اس زبان کے معنی مین اتنا انھوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی، اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیرت برتی، اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالہ کر دیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلیٰ کی چھار دیواری مین سمٹ کر رہ گئے،

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام اردو کے بجائے جو اٹھارہویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلیٰ کے صحن و ایوان میں محدود ہو گئی تھی اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اُس وقت کا نام ہے جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی، تاکہ یہ زبان پورے ملک کی ملکیت کا دعویٰ کر سکے،

مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ انکو دھوکا دینے کے لئے سازش کی جارہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے،

یہ تحریک خالص سانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں،

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخون میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اسکے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہئے، جس کو اب غلطی سے عام طور سے اردو کہنے لگے ہیں،

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے، جس میں وہ بولی جا رہی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی،

انگلستان کی انگلش فرانس کی فرینچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہیے۔
۳۔ ایک شایستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے جس سے اس کے حجم بھوم کی کمالی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی، اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہئے،

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ "اردو" کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر صرف نفسی اثر سے ہمارے اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے،

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر غلطی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے، ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلطی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے،

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو

تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے، لفظ اردو میں بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بنی مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس کی ملکیت ملے گی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبہ میں وہ اچھی اور بے گانہ نہیں قرار دیا جاسکتی ہو، ۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ بھی ہوئی ہے جس سے غریبوں کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھر گیا،

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے، تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کمائی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے،

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی کے یہاں آئے تھے، جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں اور یہ وہ بولی ہے جس کو انھوں نے ہندوستان آکر اختیار کر لیا یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وقیر شہدہ دور ہو جاتا ہے،

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی

فارسی کی صرف ونحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اور انھوں نے اس غلط طریق مروج کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں، اور اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے گو اب ہماری زبان کے نئے نحو یوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں آ رہی ہے، اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی اور لغوی تحقیقات کا رخ ایران و خراسان و ترکستان کی طرف سے مکرہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا، اور اس سے زبان کی لغوی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی،

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی بھڑروی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعویٰ کی بنیاد کھو چکی ہو گی۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پڑنگالی، یا سپینی یا اوراگلے یورپین یہاں آئے، بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقام میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجا پور کے متعلق ہے کہ تا بہ ہندوستانی متکرمی شد شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے۔ ”نغمہ سرا“ ہندوستانی زبان تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لئے یہ شبہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یہ

کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہئے،

۱۳۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میرامن دہلوی سے لیکر سرسید بلکہ آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری، جیسا کہ میرمن کا بیان ہے۔ ”جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قومیں اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی منکر حضورین جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی ہندی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی“

جب حضرت شاہجہان صاحب قرآن نے شہر دہلی کو اپنا دارالخلافہ

بنایا اور وہاں کے بازار کو اردو میں مقلی خطاب دیا،

سرسید نے یہی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف فقط اردو ہے، اس لئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے اور اس کی اصلی تاریخ کو جواب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے،

۱۴۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نمرور پورٹ اور پٹنہ جو ہر لال نے اپنی آپتی

میں ”ہندوستانی زبان“ کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ سہیتہ پرشد کے اجلاس ناگپور میں ”ہندی یعنی ہندوستانی“ کی تجویز منظور ہوئی ہے، اور ان سب کے مراہد ہندی

ہے، اس لئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہئے،

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام ”ہندی“ متعارف تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں ^۱ کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے، ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اٹھالینا پڑا، اب ایک لفظ ہندوستان ^۲ رہ گیا تھا، جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں کے قبضہ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا، یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی کفالتی کے لئے رکھا گیا ہے، اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیون ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سرسید ادبی اور لسانی ہے، غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو،

یہ تجویز کسی تحریک تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسلوں کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی

زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکین پیدا ہوتی ہیں، پھر مستہ بہستہ برپا ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ راسے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، اردو کا نام اردو کو اس ایک شخص یا گھر نے رکھا؟ یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہاں تک کہ سب پر چھا گیا غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزون نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمون میں ادھر اشارے کئے گئے، اتنے پر یہ نام مدراس کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک فہمت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اسکی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے اڈے کر سکتے ہیں، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے، اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام ہندوستانی ہی ہونا زیادہ موزون ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہی، یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا غلط نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جن میں ساہیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا، آج سے چھبیس برس پہلے ۱۹۱۱ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرزا مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی،

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان
 میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی، یا ہندی کے قریب بن جائے، حاشا و کلا اس قسم
 کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہ اسی اردو اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں ہم ہندوستانی کہتے ہیں
 ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اسکے
 پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے، ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں
 تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو نزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا، جو عام
 بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اسکے
 پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی
 غزلیوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھئے، اس میں کچھ ہرج نہیں، مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی
 تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے
 ملک ہندوستان کی زبان ہے، اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونی چاہیے
 ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے
 ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی، گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے چھوئے
 ہی ساری بلائیں دور ہو جائیں گی، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوز
 کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تحیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی
 زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے
 روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے، اور پورے ملک کی اس کے

اندرونی ہوتی ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہئے، ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بھی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے، تاکہ اس کا جو نام صرف خواہں کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے، ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے، اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انھوں نے پیش کئے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاہوں، تاجروں، کمپنی کے حاکمون، اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے ہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے، ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی امر سے ہونے نام کو دوبارہ جلانا ہے،



ہماری زبان بیسویں صدی میں

(یہ مضمون نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر کے طور پر لکھا گیا تھا)

ہمارے ادبی محققوں نے اپنی زبان کی پرانی تاریخ کی تحقیق اور ترتیب میں جو کوششیں کی ہیں وہ شکریہ کے قابل ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل سے قطع نظر کر کے حال پر توجہ کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اس صدی کے آغاز سے لے کر آج تک ہماری زبان نے جو ترقی کی ہے، وہ کئی پچھلی صدیوں کی ترقیوں سے زیادہ ہے، کسی زندہ زبان کے جو اجزاء اور عناصر رچ سمجھے جاتے ہیں، یعنی اخبار رسالے، چھاپہ خانے، کتابیں، کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک چیز کی حیثیت سے اس زبان نے اس حد تک ترقی کی ہے، جو ماضی سے بالاتر اور تسلی کے قریب قریب ہے، پچھلی صدی کے خاتمہ اور اس نئی صدی کے شروع میں ملک والوں میں اور خاص کر مسلمانوں میں اس زبان کی ترقی کے وجہ یہ نظر آتے ہیں،

- ۱۔ سرسید کی تحریک،
- ۲۔ تعلیم کی عام اشاعت،
- ۳۔ مذہبی تحریکات،
- ۴۔ اُردو ہندی کے جھگڑے،
- ۵۔ سیاسی تحریکات،
- ۶۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام،
- ۷۔ قومی زبان کا تخیل،
- ۸۔ آمدورفت کی سہولت،

سرسید کی تحریک | سرسید کی علمی و تعلیمی تحریکات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا، کہ ہماری زبان لکھنؤ اور دہلی کی قید سے باہر نکلی، ملک کے گوشہ گوشہ میں ہر لکھے پڑھے شخص کو اس زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی اجازت ملی، اور ہر جگہ اس کا چرچا پھیلانے لگی کتابیں، جو صاف ستھری سادہ اردو میں لکھی جاتی تھیں وہ لوگوں میں اس زبان میں لکھے پڑھنے کا ولولہ پیدا کرنے لگیں، اور ہر جگہ ان کی نقالی ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد نقل نے اصل کی کیفیت پیدا کر لی،

ابتدائی تعلیم کی عام اشاعت | ابتدائی تعلیم کی زبان حکومت نے ملک کی زبان کو قرار دیا، اس لئے دیہات سے لے کر شہروں تک ابتدائی تعلیم کے جو مکتب اور اسکول کے درجے کھولے گئے، ان کے لئے نصاب کی کتابیں اردو میں لکھی اور لکھوائی گئیں، اور وہ بچوں کے نصاب میں داخل ہوئیں، اس سے زبان کی ترقی اور اشاعت کو بہت بڑی مدد ملی، اس

سلسلہ میں سب سے زیادہ کام نجات اور اس کے بعد صوبہ متحدہ نے کیا،

مذہبی تحریکات | اردو زبان کی اشاعت میں مذہبی تحریکات کو بہت بڑا دخل ہوا۔ بدعت کی

جو تحریک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے اٹھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ پورے

ملک کو چھالیا، اسی کی خاطر قرآن و حدیث کے ترجمے ہوئے، عقائد پر کتابیں لکھی گئیں، اردو بدعت

پر رسالے تالیف ہوئے، اور توحید خالص کی اشاعت پر مسلسل تحریریں چھپتی رہیں، اس سلسلہ کی

پہلی کڑی شاہ عبدلغفور صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ قرآن، اور شاہ اسماعیل

صاحب کی تقویۃ الایمان ہے، اور ان کے بعد ان کے ساتھیوں اور پیروکاروں نے عوام کی سستی

اور عوام تک پہنچنے کے لئے اسی زبان کو اپنی تحریکات کا ترجمان بنالیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج

ہماری زبان میں ہر علم و فن سے زیادہ مذہبی علوم و مسائل کی کتابیں ہیں،

اردو ہندی کے جھگڑے | اردو اور ہندی کی لڑائی بھٹی گئی صدی کے خاتمہ اور نئی صدی کے شروع

میں شروع ہوئی، نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا، کہ لکھنؤ کے پرانے گنگا پرشاد اور مالابری

میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا، اس وقت مرحوم

اردو کی طرف اشارہ کر کے یہ مصرع پڑھا تھا، ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے،

تھنا کار کیا ہو کہ اس دھوم دھام میں مردہ عاشق کفن چھا رہا بوت سے نکل کر اٹھ بیٹھا،

آج وہ عموماً شباب کی اس منزل میں ہو کہ ہم آپ اس وقت اس کی برات میں شامل ہیں،

غرض اس اردو ہندی کے جھگڑے نے مسلمانوں کو اس زبان کی حفاظت اور ترقی کی طرف

متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۰۳ء میں ایکویشنل کانفرنس کے اجلاس ہٹی میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ان ٹھوس علمی کاموں کا سلسلہ بڑھا، اور پھیلا، جو گذشتہ صدی میں صرف سرسید کی تعلیمی تحریک کے دائرہ میں محدود تھا،

سیاسی تحریکات | ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ملک میں جو مختلف سیاسی تحریکیں پھیلنے لگیں انہوں نے اس زبان کی اشاعت میں بہت بڑی مدد دی، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم خلافت اور کانگریس کی یکے بعد دیگرے تحریکوں نے اخبارات کی اشاعت، روزانہ اخباروں کی پیدوار اور ملک کے صوبہ صوبہ میں جلسوں کی کثرت اردو بولنے والے رہنماؤں کی تقریریں، ہر صوبہ کے ممبروں کے بار بار اجتماع اور جلسوں کے توہنوار انعقاد نے اس زبان کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا، اور اردو کے بہتیرے مقروّن، محرّرون اور قومی شاعروں کو پیدا کر دیا اور ترک موالات نے یہ سمجھا دیا کہ بدیسی زبان کو چھوڑ کر اپنی زبان اختیار کرنا ترقی کا راہ ہے،

جامعہ عثمانیہ کا قیام | ہمارے ملک میں جب نئی تعلیم کا آغاز ہوا، تو پہلے پہلے اردو ہی تعلیم کا ذریعہ بنی تھی، چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ڈاکٹری کی تعلیم دو میں ہوتی تھی، دلی کالج وغیرہ قدیم و جدید طرز کے نئے نئے مدرسے بنائے گئے تھے، ان میں ریاضیات اور طبیعیات کی تعلیم بھی دیسی زبان میں دی جاتی تھی مگر دفعہ انگریزوں نے تعلیم کا رخ بدل دیا، اور انگریزی کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا، اور انتہائی تعجب ہے کہ سائنسٹس سائنٹی ولس سر سید احمد خان نے بھی بالآخر یہی سمجھا اور سب کو سمجھا یا کہ جدید علوم کا سمندر اردو کے کوزہ میں نہیں سما سکتا، یہ خیال کچھ اس مضبوطی سے دونوں میں جم گیا کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور جدید علوم و فنون کا تخیل انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں آتا ہی نہ تھا، یہ حالت ۱۹۱۶ء تک

قائم رہی، ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا گیا جس میں تعلیم کا ذریعہ
 ہو، اس تجویز کے بلند بانگ مدعیوں کو تو سب جانتے ہیں، مگر وہ خاموش رہتی جس کے دماغ میں
 یہ تجویز سب سے پہلے آئی، اور جس نے حیدرآباد کے اسباب بست و کشاد کو سمجھا کر اس کے غلدرآمد
 پر آمادہ کیا، اور اس کے ابتدائی مدارج میں اس کی رہنمائی کی، اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور
 وہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم سابق صدر دارالعلوم حیدرآباد دکن ہیں، اللہ کی رحمت ان پر
 ہو، شروع شروع تو سب کو بڑا اچھلچھا ہوا، مگر آہستہ آہستہ تعجب حیرت سے اور حیرت امکان سے
 اور امکان عمل سے بدل گیا، دارالترجمہ قائم ہوا، اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، ہزاروں اصطلا
 پیدا ہو گئے، سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہوئیں اور اب اس کا وجود مادری زبان میں تعلیم کے امکان
 اور فائدہ کی متقل اور محکم دلیل ہو گئی، دوسرے صوبوں پر بھی اس کا اثر پڑا، جامعات میں اردو
 کو مناسب جگہ ملنے لگی، اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ آگے بڑھ
 قومی زبان کا تختہ | جدید تعلیم اور قومی تحریکات کی ترقی نے یہ نکتہ بتا دیا، جو کہ ہندوستان کی مختلف
 قومیتوں اور صوبوں کو ایک کرنے کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے، جو ہماری قومی با
 بن سکے، جہاں تک سالانوں کا تعلق ہے اور دوسرے ملی کی محذو زبان اب ہندوستانی بن کر ہندوستان
 کی عام زبان بن چکی ہے، ہندوؤں کا بیحدہ طبقہ بھی اس زبان کو کم از کم پنجاب، یوپی اور
 میں علاؤ الدینی قومی زبان سمجھتا ہے خواہ وہ اسکو کسی خط میں لکھتا ہو، اس تختہ نے ہماری زبان کی ترقی میں چھٹی اور
 دور دست صوبوں میں جہاں مقامی بولیاں بھی بولی جاتی ہیں وہ توئی بان کی غنیمت قبول کی جاتی ہے،
 آمدورفت کی سہولت | ہم نے اس زبان کی ترقی میں اس ایک اہم سبب کو اب تک بھلا دیا

جس کو پہلے بتانا چاہئے تھا، یعنی ملک کے دور دراز حصے آج ڈاک اور آمد و رفت کی سہولت کی بنا پر گھراگن بن گئے ہیں، پنجاب کے لوگ بنگال، اور بنگال کے لوگ بہار اور یوپی میں، سندھی بھارت اور گجراتی سندھ میں آ جا رہے ہیں، ایک شخص پشاور سے کلکتہ اس طرح پہنچتا ہے، کہ اس کو صدر پنجاب، متحدہ، بہار اور بنگال پانچ صوبے دودن میں طے کرنے پڑتے ہیں، ہسٹیشن پر اس کو تڑپا چڑھنا، لینا دینا، ملنا جلنا، اور بولنا چالنا پڑتا ہے، اور اگر ہماری خوش قسمتی سے طرفین میں سے ایک یا دونوں انگریزی کا کوئی حرفت نہیں جانتے تو یہی ہندوستانی اس سفر میں ان کی زندگی کا سہارا بنتی ہے، اور لازمی طور سے مشترک ہندوستانی زبان کی ترقی کا ہر قدم اس آمد و رفت کی سہولت سے ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے،

غرض یہ اسباب ہیں جنھوں نے ایک مشترک ہندوستانی زبان کے تخیل کو واقعہ بنا دیا ہے اور وہ بولی جو کبھی کسی ضرورت سے شروع ہوئی تھی، اب پورے ملک کی زبان ہو گئی ہے،

زبان کی ترقی کے اصول | بیسویں صدی میں ہندوستانی نے جو ترقی کی ہے، اس کے جاننے کا معیار ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ تعلیمی، اخباری، کتابوں کی تعداد، تجارت اور معیار

کی وسعت اور جغرافی پھیلاؤ کے لحاظ سے کہاں تک بڑھی ہے، ذیل کے صفحوں میں ہم اسی معیار پر اس زبان کی ترقی کو جانچتے ہیں، گو پورے اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کے سبب یہ روداد پوری مکمل نہیں، تاہم یہ ادھر بیان بھی اس قابل ہو کہ ہم اس کو سن کر اپنی مسرت کا اظہار کریں، تعلیمی ترقی | اس مدت میں ہماری زبان وٹی اور لکھنؤ کے حدود سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی ہے، پشاور سے لے کر کلکتہ تک وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں کے اسکولوں اور مکتبوں

میں پڑھائی جاتی ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے، اکثر بچوں میں اس کی ایک کرسی ہے، اور ایم اے کے امتحانوں میں اس کے اوبیات میں تکمیل کی سند دی جاتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر مقرر ہیں، اور ان میں ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اس کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ تعجب کی بات ہے، کہ ابھی تک اس زبان کو ان ہی شہروں کی تعلیم کا ہون میں اس اعتبار اور استناد کی عزت نہیں ملی ہے جو اس زبان کے مولد و منشا ہیں، یعنی لکھنؤ، دہلی اور آگرہ کی یونیورسٹیوں میں اس کی یہ علمی حیثیت ابھی تک تسلیم نہیں ہوئی ہے، اور اس موقع پر حضرت علیؑ کے اس فقرہ کی سچائی پر ایمان لانا پڑتا ہے، کہ نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں۔

کیا یہ سن کر حیرت نہ ہوگی، کہ جاپان میں مشرقی زبانوں کی جو سرکاری درسگاہ ہے، اس میں ہندوستانی کی تعلیم بھی باقاعدہ دی جاتی ہے، دہلی کے نور الحسن برلاس صاحب اس کے پروفیسر ہیں، ابھی علیگڑھ کی گذشتہ اردو کانفرنس کے موقع پر اس درسگاہ کے ایک جاپانی استاد پروفیسر گامو پہلی دفعہ ہندوستان آئے تھے اور علی گڑھ کی کانفرنس میں موجود تھے، اور اردو خاصی بولتے اور لکھتے تھے، روس میں بھی اس کی تعلیم کا اہتمام ہے، اور بران نکوف صاحب نے اردو کے سلسلے لکھے ہیں، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی تعلیم کا بندوبست ہے، اس وقت گریجویٹ صاحب لندن یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر ہیں، پیرس یونیورسٹی میں اس زبان کی پروفیسر بہت پرانے زمانہ سے ہے، دسی ماسی صاحب کا نام ہماری زبان کی تاریخ میں نہایت ممتاز

ابھی جامع ازہر کے مصری وفد کی زبانی یہ خوشخبری بھی آپ کو مل چکی ہے، کہ عنقریب جامع ازہر میں ہندوستانی زبان سکھانے کے لئے ایک درجہ کھولا جائے گا، لیکن ان سب سے زیادہ اس کی تعلیمی ترقی کی بلندی یہ ہے کہ وکن میں جو ایک معنی میں اس کا جنم بھوم ہے، اس کی پوری یونیورسٹی قائم ہے، جہاں ہر علم و فن کی تعلیم کا وہ تہا ذریعہ ہے،

ہمارے عربی مدرسے جو خیر کے درون سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک پھیلے ہیں ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہے جس کو ان کے ہر ویں کا طالب علم کیسا سمجھتا ہے، اردو کے مکتب اور ابتدائی مدرسے گاؤں اور دیہاتوں میں قائم ہیں، لیکن یہ افسوس قابل ہے کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے ان کو وہ امداد نہیں ملتی جس کے وہ مستحق ہیں، تاہم وہ اس زبان کے بولنے والوں کی ذاتی کوششوں سے جیسے تیسے چل رہے ہیں، مجھے مدرسے کے بہت سے دور دراز قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں یہ دیکھ کر

حیرت ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے خاصی اردو بولتے اور پڑھتے تھے، لاٹور، وانباڑی، عمر آباد اور ترچیا پل میں اردو زبان کے مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا ہے، اور کامیاب پایا ہوا ہے، میں بھی اردو اسکول، اور اردو ٹریننگ کلاسز میں، علم یونیورسٹی نے ان کے لئے جن کی ادبی زبان اردو نہیں، اردو کا کورس مقرر کیا ہے، اور وہ پڑھایا جاتا ہے،

ہندوستانی کی جغرافیہ و معاشیات | اس بیان سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زبان پورے ملک میں کس طرح چھائی ہوئی ہے، مسلمان عالم اور واعظ ہر عام طور سے یوپی وٹی اور اس کے اطراف پانچا کے ہوتے ہیں وہ بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ، ممبئی، سندھ اور مدراس تک جاتے ہیں، وہ ہندوستانی

بولتے ہیں، ان کی تقریریں اور وعظون میں ہر ادبا لوگ شمر یک ہوتے ہیں، اور مقرر و واعظ کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہاں کی عام اسلامی کانفرنسین اور انجمنین اسی زبان میں تجویز لکھتی ہیں، تقریریں کرتی ہیں اور رودادین چھاپتی ہیں، سرحد کی پہاڑیوں سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک ہندوستانی کے اخبار اور رسالے چھاپے جاتے ہیں، اور پڑھے جاتے ہیں ہندوستان کے ہر گوشہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے اور کہیں بھی مجھے اپنی زبان کی بے زبانی کا اقرار کرنا نہیں پڑا ہے،

ن ملک سے باہر جہاں کہیں بھی نکلا، ستیاح کو اس زبان کے نقش قدم ملتے گئے، کابل گیا، تونو کے بادشاہ سے وزراء علماء اور ادبا، تک اس زبان میں بولتے یا سمجھتے ہوئے ملے، عراق، حجاز اور بیت المقدس (فلسطین) میں ہندی زائرین اور حاجیوں کی آمد و رفت کے سبب سے اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے ہیں، خصوصاً آج زمین تمام دوسری اسلامی زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، عدن میں نہ صرف یہ بولی جاتی ہے، بلکہ یہاں ہندیوں کے لئے ہندوستانی کے مکتب اور اسکول ہیں، یمن کی ریاست مکتلا میں ملاحون کی زبان سے اردو سنی افریقہ کے ایٹالوی مقبوضہ مصر میں اتر، تو گجراتی تاجروں سے ہندوستانی ہی میں بات چیت ہوئی، اسکندریہ کے بازا میں اس کے بولنے والے پائے، سوئز کے ملاحون کو کام چلاؤ اور دو بڑی تیزی سے بولتے سنا، کیمبرج یا کسفورڈ کی انڈین مجلس میں بھی جس میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے ہندو مسلمان، پارسی اور عیسائی طالب علم تھے، انگریزی کے بعد ہندوستانی ہی زبان عام اور مشترک زبان پائی اور اسی میں تقریر کی،

ادھر ایشیائے وسطیٰ سے ایشیائے قسمی تک اردو زبان کا سکھ چلتا ہے، ادھر بخارا، خیو، قندھار، غزنی، کابل، ہمرقند، بدخشان سے کاشغر تک اور ادھر چین، جاوا، ملایا، اور سنگاپور تک کے عظیم ہمارے عربی مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں، ندوہ لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، امینیہ دہلی، جامعہ ملیہ علی، مدرسہ عبدالباق، دہلی، مدرسہ عالیہ رام پور، اور جامعہ عربیہ ڈابھیل، گجرات وغیرہ میں مختلف اسلامی ملکوں کے باشندہ لڑکے پڑھتے ہیں، اور یہاں چند سال کے قیام میں ہندوستانی زبان اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں، اور اس کو تحفہ کے طور پر اپنے ملکوں میں لجاتے ہیں،

ترکستان و خراسان و کابل کے طالب علم پہلے بھی ہندوستان کے عربی مدرسوں میں پڑھنے آتے تھے، مگر چونکہ ان مدرسوں میں ہندوستانی زبان کی ادبی تعلیم کا شوق نہ تھا، اس لئے وہاں کے طالب علم بول چال کی زبان تو سیکھ لیتے تھے، مگر اس زبان میں لکھنے پڑھنے سے عاری رہتے تھے، لیکن دارالعلوم ندوہ، اور جامعہ ملیہ نے چونکہ تعلیمی مضامین میں اس کی ہمت بھی رکھی ہے، اس لئے اس کے نتیجے سامنے ہیں، ندوہ میں مولوی عبدالرحمن صاحب کاشغری نے اردو ضرب الامثال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں، اور شمس مادی زبان کے اس کو بولتے ہیں، جامعہ میں چین کے بدالدین نے اردو زبان ایسی سکھی، کہ چین کے مسلمانوں پر خود اپنے قلم سے کتاب لکھی ہے، اور جو دارالمصنفین میں چھپی ہے، ابھی میرے پاس غن کے ایک ندوی طالب علم کا خط آیا جس کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی، ندوہ کے ایک جاوی طالب علم عدنان نے اتنی اردو سیکھ لی ہے کہ میرے رسالہ رسول وحدت کا جاوی میں ترجمہ کیا، اور اب خطباتِ رسالہ کا ترجمہ کر رہا ہے، محمد حسن مالدی، مالدیپ کے رہنے والے ہیں، ندوہ سے پچھلے سال فراغت

پائی، اردو خوب سیکھ لی، ابھی چند روز ہوئے والد پرپے ان کا اردو خط آیا، تو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، سوچا کہ ایک نوجوان محمد صابر ندوہ میں ہے جو ایسی اردو جانتا ہے کہ اردو کو کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیتا ہے،

ابھی بھدر دجامتہ دہلی میں ایک مضمون کے سلسلہ میں یہ اطلاع نکلی ہے :-
 ”جامعہ میں بہت سے غیر ملکیوں نے اردو خوب سیکھی، ابھی چند سال پہلے جریرہ والد پرپے کے ایک طالب علم محمد ویدی یہاں تھے، یا تو وہ اردو کا ایک حرف نہیں جانتے تھے یا کچھ عبادتیں لکھنے لگے، کالج میں ایک جاوی بن، محمد عثمان سوید، وہ جماعت کا سارا کام اردو میں کرتے ہیں، معاشیات، تاریخ، دنیات وغیرہ مضامین خالص اردو میں لکھتے ہیں اور بدرالدین چینی تو ان سب کے سردار ہیں، محمد بن عبد القیوم افغانی بھی مدرسہ میں ابتدائی کے بڑے ہوشیار ہونہار طالب علم ہیں، ان پر بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ افغانی

(دسمبر ۱۹۳۷ء میں)

گذشتہ علی گڑھ اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر میں نواب ہمدی یار جنگ بہادر نے فرمایا تھا
 ”جنوبی افریقہ سے حال میں ایک ڈیلیکیشن آیا تھا، ان سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ جو ہندوستانی لوگ اس ملک میں آباد ہیں، وہ ہندوستانی بولتے ہیں، مارٹینسن بھی ہندوستانی بولتے ہیں“

پیش

مارٹینسن کا مجھے بھی تھوڑا سا ذاتی تجربہ ہے ۱۹۲۷ء کی جولائی میں مین فرانس کی صحت گاہ میں تھا میں فرانسیسی سے بالکل نااہل تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس انجان شہر میں مجھے مارٹینسن کے دو

ہندو طالب علم ملے، جو پیرس میں ڈاکٹری پڑھنے آئے تھے، ان کے مورث قدر کے زمانہ میں ہمارا سفر سے بھاگ کر اس جزیرہ میں چلے گئے تھے، وہ اتنے دنوں اور نسلوں کے بعد بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیتے تھے،

مارشیس میں اردو کے اسکول بھی ہیں اور علماء اور واعظ وہاں جا کر اسی زبان میں تقریر کرتے ہیں، یہی دوسرے جزائر ہند کا بھی حال ہے، رنگون ان اطراف میں اردو زبان کا مرکز بن رہا ہے، جہاں کے بازاروں میں ہندوستانی عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور وہاں ہندوستانی کے اسکول اور کتب خانے قائم ہیں، برہما کے ایک ہندوستانی مضمون نگار (سکرٹری مسلم کمیٹی رنگون) کا یہ بیان پچھی سے سنا جائیگا،

”یہاں کے اکثر شہروں اور خصوصاً رنگون کی شہری زبان اردو ہے، کسی ملک کا رہنے والا ہوشیارین داخل ہونے کے ساتھ اردو کا جاننا ضروری ہے، وہ ہر بازاری چیز کے لئے بھی بن گفتگو کر سکتا ہے، اکثر غیر مالاکے لوگوں خصوصاً ہندوستان کی ہر زبان بولنے والی قوم کا غلط ملط جس قدر برہما میں ہے، اس قدر ہندوستان کے کسی شہر میں آج تک نہ ہو سکا، اور یہی وجہ ہے کہ اسی ملک کی بدولت ہندوستان کے ان مقامات تک اردو پھیل گئی جہاں شاید ایک عرصہ دراز تک پھیلا نہ سکتا تھا، مدراس، کوکنا، وا، ترچنا پل، ناگوڑ، جیسے مقامات کے لوگ برہما کی کثرت سے آمدورفت کی وجہ سے اس قدر آسانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں کہ آج وہاں کے جس دیہات میں چلے جائیے، عام طور پر اردو جانتے والے ملین گے، چٹاگانگ کی بہت بڑی آبادی جس کا برہما سے تعلق ہے، اردو سے مانوس ہی

نہیں بلکہ اردو کی معاون و مددگار ہے، مالا بازمین بھی اسی ملک کے ہر دولت مند کی کافی عیش
 ہو چکی ہے۔ یہاں چینی قوم بھی کثرت سے آباد ہے، اس کا ایک ایک بچہ اردو جانتا
 اور بولتا ہے، یورپین ممالک کے لوگ بھی کثرت سے موجود ہیں، اور ہندوستانی ہی زبان
 میں بازاری کاروبار کرتے ہیں“ (اجل بیٹی یکم دسمبر ۱۹۳۴ء)

ہندوستان کے تین احاطے، مدراس، بنگال اور بمبئی ایسے ہیں، یہاں ہندوستانی زبان
 کے علاوہ صوبائی بھاشاؤں کا بھی چلن ہے، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان مقامی بولیوں کے
 ساتھ ساتھ ملک کی یہ مشترکہ زبان بھی ہر جگہ ترقی کرتی جاتی ہے، مجھے احاطہ مدراس کے مختلف
 شہروں، مدراس، بنگلور، ترچنپلی، امبوری، میسور وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا، اور ہر جگہ اردو میں یہ
 ہوئیں، اور عموماً ہوتی ہی رہتی ہیں، اور وہ اچھی طرح سمجھی جاتی ہیں، اور شمالی ہند کے اردو اچھا
 رسالے اور تصنیفات وہاں پڑھی جاتی ہیں، بلکہ عام جیسے دور دراز علاقہ میں جو مدراس اور بمبئی کی
 سرحد پر ہے، اردو کا رواج کافی ہے، اور اردو کے مدرسے اور کتب خانے قائم ہیں،
 بمبئی جانے کا اتفاق ہر شخص کو ہوتا ہوگا، وہاں دیکھا گیا ہوگا، کہ صوبہ کی مختلف بولیوں
 مرہٹی، کنڑی اور گجراتی کے ساتھ بازاروں اور پبلک مقاموں پر ہندوستانی ہی کا قبضہ ہے،
 یہاں کا پوریشن کی طرف سے اکثر محلوں میں اردو کے میونسپل اسکول جاری ہیں، ہمارا شہر
 کے مرکزی شہر پونہ میں میرا دو سال قیام رہا، ہر جگہ نظر آیا، کہ بازاروں میں اور مشترکہ مقاموں پر
 سمجھنے بوجھنے کا واحد ذریعہ اردو ہی ہے، یہاں اردو کا ایک ٹریننگ اسکول بھی ہے،
 اور اردو اسکولوں کے لئے الگ انسپکٹر بھی مقرر ہیں،

بیان پر اپنے قیام کو نہ کا ایک لطیف یاد آؤ گن کالج میں میرے شریک کا ایک مرہٹہ بہمن
 پروفیسر تھے، دوپہر کی راحت کے گھنٹہ میں ہم لوگ ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے، ہمارے
 مرہٹہ پروفیسرون اور چیرسیون کی مادری زبان مرہٹی تھی، مگر جب ان پروفیسر صاحب کو چیرسیون
 پر غصہ آتا تھا تو اُدوین آتا تھا، ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا مرہٹی بڑی پیاری زبان ہے
 اس میں غصہ کرتے نہیں بنتا، اور اردو زبان "مٹری لنگوئج" ہے، اس میں غصہ کرتے خوب بنتا ہے
 گجرات کے مسلمانوں میں گجراتی کے ساتھ اردو زبان بھی بخوبی رواج پذیر ہے، اور گجراتی
 ہندو بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، گجرات کے عام شہروں میں بلکہ دیہاتوں تک میں اردو
 کھنے پڑھنے کا رواج ہے، شہر بڑودہ، جونا گڑھ، مانگرول، بھرج، احمد آباد، سورت، رانڈیر، وغیرہ
 مقامات میں اور خصوصاً سورت اور اُس کے آس پاس میں ہندوستانی مادری زبان کی حیثیت
 ہے، یعنی باقاعدہ سیکھے بغیر اردو بولتے چالتے ہیں، اور گھروں میں بولی جاتی ہے،

بنگال میں بنگالیوں کی واحد زبان بنگالی ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مگر شخص
 جا کر دیکھ سکتا ہے کہ بنگال کے دارالحکومت کلکتہ پر ہندوستانی کا قبضہ ہے، بنگال کے پرانے
 متہن شہروں مرشد آباد اور ڈھاکہ میں اردو گویا مادری زبان ہے، چانگام میں ان سے کم مگر بھی
 ہندوستانی زبان سمجھ لی جاتی ہے، بنگال میں عربی مدرسے بکثرت ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے، کہ
 کم سے کم ساٹھ ہزار مسلمان طالب علم وہاں عربی پڑھتے ہیں، اور ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی
 ہی ہے، ہم کو اس کا علم ہے کہ بنگالی مسلمانوں کو بھی اپنی صوبائی زبان سے بہت محبت ہے،
 لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی بولنے پر مجبور سے ہیں، ہندوستان کے اکثر عربی مدرسوں

مین ہنگامی طالب علموں کا بڑا حصہ آیا کرتا ہے، اور مین وہ چند سال رو کر تعلیم پوری کرتا ہے اس کا اثر ہے کہ وہ گھر جا کر بھی اس کو مین بھوتا، ہنگامی بہت سے اردو کے لیے ہوتا ہے شاعر اور ادیب ہیں، جو کسی حیثیت سے اس صوبہ کے اردو شاعروں اور ادیبوں سے کم نہیں راجپوتانہ | راجپوتانہ مین اجمیر کا شہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ سارے کا سارا اردو بولتا ہے، اس کی ریاستوں کی سرکاری زبان اردو رہا کی ہے، وہاں کے رہنے والے یا تو ٹھیکہ ہندو بولتے ہیں، یا ایسی بولیاں جو ہندوستانی سے بالکل ملتی جلتی ہیں، اور وہی کے اثر سے متاثر ہیں، ٹونک کی مادری زبان اردو ہے، وہاں کے نواب اور امرا اس زبان کے شاعر ہوتے ہیں وہاں کے عام شرفار مین بھی اس زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب ہیں،

دوسری ریاستوں مین بھی ہماری زبان کا سکھ چلتا ہے، جے پور مین بھی یہ بولی جاتی ہے ریاست کے محکمہ تعلیمات نے تمام سرکاری اور مادی مدرسوں مین اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے، مازوٹ وغیرہ مین جو مقامی بولیاں ہیں وہ ہندوستانی ہی کی ایک قسم ہیں، گولچہ مین اس سے کڑی،

ہندوستانی بولنے والوں | اردو کی جغرافی وسعت کے سمندر مین بہتے ہوئے خدا جانے ہم کہاں سے کہاں چلے آئے، کتنا تو یہ تھا کہ اردو کی ترقی کا آغاز اس صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا، اور سال کے ہر قدم کے ساتھ اس کا قدم آگے کو بڑھتا جاتا ہے، اس کے جانچنے کا سب سے آسان ذریعہ ہندوستانی بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی تعداد پر سرسری نظر ڈالنا ہے،

نواب مددی یار جنگ بہادر اردو کا نفرنس علیگندہ (۲۴-۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے صدر تھے
خطبہ میں فرماتے ہیں،

”سائنس کمیشن رپورٹ کے دیباچہ میں ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی
تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے“ (روداد مذکور ص ۵)

انڈین نیشنل کانگریس کے محترم صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے،
”جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں پڑتے، لیکن میرا خیال
ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد کم از کم کروڑوں سے کم نہیں اس کے
علاوہ اس کے سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے، جو پورے ملک میں پھیلی
ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں، یہ منسکرت
زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے، اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونوں
زبانوں کے خزانوں سے یہ مالا مال ہو سکتی ہے“ (اردو ترجمہ ص ۲۹۹ و ص ۳)

مدارس، بنگال اور	ہندوستانی زبان کی رفتار ترقی کے لئے سب سے کھن منز لین بیٹی، مدراس
بیٹی کی امید گاہیں	اور بنگال کی ہیں، بنگال میں ڈھاکہ یونیورسٹی، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور عربی کے

دوسرے مدرسوں کے ذریعہ سے یہ زبان اہل صوبہ کی مخالفت کے باوجود آگے بڑھ رہی ہے
بیٹی میں تحصیل کالج ہندوستانی ادبیات کی ترقی کے لئے کوشاں ہے، اور رفتار کامیاب نظر
آ رہی ہے، مدراس میں جامعہ دارالسلام عمر آباد سے بہت کچھ امیدیں ہیں، میسور میں بنگلور اردو کا
خاص مرکز ہے،

ابھی حال میں ملیبار میں ایک انجمن اصلاح اللسان کے قیام کی خبر ملی ہے، جو چھ سال
 ملیبار کے گیارہ لاکھ مسلمانوں کی قومی زبان اردو بنانے کے لئے کوشاں ہے، اس انجمن
 کی کوششوں سے وہاں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو چلا ہے، اور
 اب وہاں سے مارچستان نام ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔
 صوبہ بہار | صوبہ بہار، اطراف دہلی اور یوپی کے بعد اردو کا تیسرا مرکز ہے، اور اردو میں
 کی مادری زبان ہے، تاہم اکثر صاحبوں کو یہ معلوم ہوگا، کہ گذشتہ صدی کے خاتمہ کے قریب اس
 زبان کا رسم الخط سرکاری محکمات سے خارج کر دیا گیا تھا تو ان کی کوششوں کے بعد آرمیل سر فرم
 مرحوم کے عہد وزارت میں یہ حکم منسوخ ہوا، اور پٹنہ کشتری میں اردو رسم الخط کی سرکاری اجازت
 ہو گئی، اس اجازت کا اس صوبہ میں اردو زبان کی ترقی پر بہت اچھا اثر پڑا، کئی اجارا اور رسائے
 نکلے، اور پبلک شوق بھی نمایاں ہو اچھی عارضی وزارت میں بعض بنگال سے ملے ہوئے اضلاع کے
 علاوہ سارے صوبہ کو اردو خط کی اجازت مل گئی، کانگریس کی نئی وزارت نے بھی اس اجازت کو قائم
 اور اب یہ صوبہ بھی بدستور سابق اردو کا گھر بن رہا ہے، اور ہندوستانی زبان کو صوبہ کی قومی اور تعلیمی زبان بنانے کی
 کوششیں ہو رہی ہیں،

سرحد صوبہ سرحد کی مادری زبان پشتو ہے، تاہم ہندوستانی وہاں کا ہر شہری باشندہ بولتا اور دیکھتا
 باشندہ سمجھتا ہے، پچھلے دنوں سر عبد القیوم کی وزارت میں اردو رسم الخط اس صوبہ کا سرکاری
 خط قرار دیا گیا، ایک ادبی انجمن اور اسلامیہ کالج کی فضا اس زبان کی ترقی کے لئے سازگار

ابھی کو ہاٹ مین ایک ہزم اردو کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا مقصد اس صوبہ میں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اشاعت ہے۔

زبان کی ترقی کے دوسرے معیار اس زبان کے مطبوعات اور ادارے ہیں، مطبوعات میں اخبارات، رسالے اور تصنیفات ہیں،

اخبارات | پچھلی صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کے ایک دو روزانہ اور دو تین روزہ اخبارات تھے، خیال آتا ہے کہ اس زمانہ میں لاہور میں ایک روزانہ اخبار اخبار عام چھپتا تھا اور دوسرا لکھنؤ سے آؤدھ اخبار، صدی کے خاتمہ پر غالباً سب سے پہلے پتہ اخبار روزانہ ہوا، اور ۱۹۱۱ء تک یہی حال رہا، بلقان کے سیاسی ہنگاموں میں زمیندار روزانہ نکلنے لگا، اور اسی

کے قریب مولانا محمد علی نے روزانہ ہمدرد کا اجرا کیا، اب آج میرے علم میں صرف لاہور سے اردو کے دن روزانہ اخبارات نکل رہے ہیں، زمیندار، انقلاب، احسان، سیاست، ملاپ، پرتاب، ویر بھارت، ہندو وغیرہ، دہلی سے چار، ملت، وطن، وحدت اور تیج لکھنؤ سے چار، حقیقت، حق، آؤدھ اخبار، اور تھم، کلکتہ سے چار، عصر جدید، روزانہ ہند، مسلم گزٹ اور اہلال، تیسرا بند ہو گیا، بمبئی سے پانچ خلافت، اجل، ہلال، مشیر ہند اور اسلام، مدراس سے دو، قومی رپورٹ اور آزاد (آج کل شاید بند ہیں) حیدرآباد سے چھ روزنامے، پیام، صحیفہ، رہبر، دکن، مشیر دکن، صبح دکن، منشور اور رنگون سے دو، شیرنگون، اور مجاہد برما اور پیشاور سے آزاد، اور متحد اور رنگور ملک میسور سے الکلام جو پہلے ہفتہ وار تھا، اب روزانہ ہو گیا۔

ایک روزانہ اخبار سندھ سے شائع ہوتا ہے،

صدی کے خاتمہ پر سہ روزہ اخبار دو تھے، ایک مغرب میں، دوسرا مشرق میں، مغرب میں وکیل امرتسر جس نے انتشار اللہ خان کی اوٹیری میں روم و یونان کی جنگ میں کافی شہرت حاصل کی، مشرق میں ریاض الاخبار، گورکھپور، مشہور شاعر ریاض کا اخبار، اس کی ادبی حیثیت نیا نہایاں تھی، اب اس وقت سہ روزہ اخبارات میں صداقت کشمیر، پیغام لاہور، وکیل امرتسر، مدینہ یمنور، الامان دہلی، انصاری دہلی، البحریتہ دہلی، اتحاد پٹنہ، مسلم پٹنہ، اللہ مال پٹنہ، آزاد پٹنہ، صدی کے خاتمہ پر ہفتہ وار اخباروں میں پیسہ اخبار لاہور، نسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، کرزن گزٹ دہلی، التبشیر اٹاوہ، آدھ پنچ لکھنؤ، ہندوستانی لکھنؤ، تیر عظم مراد آباد، ذوالقرنین بدایون، روہیل کھنڈ گزٹ بریلی، تہتمیر و زیوپی کے کسی شہر سے نکلتا تھا، اپنچ پٹنہ، اردو گارڈ کلمنتہ شہس الاخبار اور تجربہ دکن مدراس،

صدی کے آغاز میں سب سے پہلا پر زور ہفتہ وار ۱۹۱۵ء میں انتشار اللہ خان کی اوٹیری میں وطن نکلا جو ٹرکی، اور عام اسلامی دنیا کا نقیب اور سفیر تھا، ٹرکی کے دستوری انقلاب کے بعد اس کا وقار رفتہ رفتہ گھٹ گیا، اور آخر ہندوستان کے سیاسی انقلاب میں وہ مٹ گیا، اس کے بعد سیاسی ہفتہ وار اخبارات میں ۱۹۱۵ء میں مسلم گزٹ لکھنؤ اور اللہ مال کلمنتہ بڑے زور شور سے نکلے، بہر حال یہ ہفتہ وار اخبارات میں ترقی کی ابتدائی تاریخ ہے، اس وقت سے لے کر آج تک پشاور و کشمیر سے لے کر رنگون تک جگہ جگہ سے ہفتہ وار اخبارات نکل رہے ہیں، کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے، ہفتہ وار اخباروں میں خلافت، احسان، انقلاب

زمیندار، ملاپ، تیج، اجل اور ہند کے ہفتہ وار ایڈیشن خوبی سے کل رہے ہیں، ہفتہ وار
صحیفوں میں دیوان سنگھ مفتون کا ریاست عام لوگوں میں بہت مقبول ہے، بھوپال
سے تیزیم بلیٹی سے صداقت، اور مقصور، کلکتہ سے ہفتہ وار ہند مدراس سے سہیل اور اب
ملت بنگلور سے پہلے الکلام، اور اب قوم، رنگون سے میوئل گزٹ اور کراچی سے بوجپان
جید اور بھیت اور ان کے علاوہ چھ اور ہفتہ وار اخبار کل رہے ہیں،

ابھی حال میں کن گنج پورینہ (بہار) سے ایک ہفتہ وار اخبار آئینہ نکلنے لگا ہے، یکم اکتوبر
۱۹۳۷ء کو اس کا بارہواں نمبر چھپا ہے، ایسٹ آباد سمرحد سے عزیز الملک نکلا ہے، اور کولہ
صوبہ برار سے البرمان، ناگپور سے مسلم کشمیر سے انور بلیٹی سے مختلف ناموں کے ۱۳ ہفتہ وار
گذشتہ صدی کے اواخر میں ہندوستانی زبان کے اخبارات کی تعداد جو مالک
مغربی و شمالی اور پنجاب میں لکنؤ سے لاہور تک چھتے تھے، تلو کے قریب تھی (رسالہ جن
حیدر آباد جلد پنجم نمبر ۱۲ ص ۱۱۴) اگر اس تعداد سے آج کے اخبارات کی تعداد کا موازنہ کیا جائے
تو ہندوستانی زبان کی ترقی کا پورا حال معلوم ہوگا، چنانچہ اب سارے ہندوستان میں
آٹھ سو بارہ اخبار اور رسالے اس زبان میں نکلتے ہیں، جن میں سے ساؤن روزانہ اور تین
بیالیں ہفتہ وار ہیں،

رسالے ہندوستانی زبان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ شرکا و لگداز لکنؤ ہے، جو ۱۸۸۷ء
سے نکلنا شروع ہوا تھا اس کے پہلا مذہبی و اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق سرسید احمد خان

جو ۱۸۶۷ء سے ۱۸۹۵ء تک نکلا سب سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد حیدرآباد دکن ہے جس کے اڈیٹر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے، یہ ۱۸۶۷ء میں نکلا تھا، اور سب سے پہلا تحقیقی و تاریخی رسالہ حسن ہے، جو حیدرآباد میں ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۷ء تک جاری رہا، نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ اس کے اڈیٹر تھے، اور ہر قسم کے علمی، ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ علی گڑھ کا معارف ہے جس کے اڈیٹر وحید الدین سلیم اور نواب محمد امین خان تھے، یہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۱۷ء تک نکلتا رہا،

پچھلی صدی کے یہی مایہ ناز رسالے تھے، جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے لیکن نئی صدی اپنے ساتھ بہت سے نئے ساز و سامان لائی، نئی تعلیم کی پودھ اب بڑھ کر جوان ہو چکی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۷۱ء میں (سرخ) شیخ عبدالقادر کی اڈیٹری میں لاہور سے مخزن نکلا، آج کے ادھیڑ اور بوڑھے اس زمانہ کے نوجوان تھے، سراقبال، میر ننگ، چودھری خوشی محمد ناظر، اعجاز حسین، علی الدین، سید حسرت مولانا شروانی، سید علی محمد شاد وغیرہ اس کے مضمون نگار تھے، مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میری عمر کا سب سے پہلا مضمون "وقت" اسی میں شائع ہوا تھا، یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نئی تعلیم کے نوجوانوں کو ملکی ادب کے کام میں لگایا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں سید حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اردو سے معنی نکالا، جس میں ادبی اور سیاسی مضامین کی گنگا جمی ہوتی تھی، اس زمانہ میں علی گڑھ منتحلی سیکرین کو میر ولایت حسین ایڈٹ کرتے تھے، اور وہ کالج کے بجائے ملک کا رسالہ تھا، نئے نوجوان اس میں منتحلی سخن کرتے تھے، اس کے نوآموزوں میں میر انام بھی داخل ہے، ۱۹۰۳ء میں دکن کے افق سے مولوی ظفر علی

کا دکن ریویو اور افسانہ طلوع ہوا، ۱۳۲۲ء میں لکھنؤ سے اندرون کلا جورو شیخال علماء کا آگن تھا، مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن ثروانی اس کے اڈیٹر تھے، ۱۹۰۴ء ہی میں زمانہ کا آغاز ہوا، جو فنی دینارین نظم کی اڈیٹری میں اب تک جاری ہے، فنی نوبت رائے نظر کا خدنگ نظر بھی ۱۹۰۴ء کی یادگار ہے،

اس کے بعد آئین پریس الہ آباد سے ادیب ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے آنظر ۱۹۰۹ء میں لاہور سے ظفر علی خان کا پنجاب ریویو ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا انصر ۱۹۱۱ء میں اگرہ سے دلگیر آبادی کا تقارن ۱۹۱۳ء میں حیدرآباد سے ہوش بگلرانی کا ذخیرہ ۱۹۱۵ء میں اعظم گڑھ سے معارف ۱۹۱۶ء میں چلبلیست کا صبح امید لکھنؤ ۱۹۱۸ء میں نکلا، اور اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے اردو کے جس کثرت سے رسالے بنے، وہ آپ کے سامنے ہیں، اور جس کی وسعت پورے ملک کو محیط ہے، پنجاب میں ہمایون دہلی میں جاتمہ، اور (شاید یونی میں معارف بھی) ہماری زبان کے معیاری ماہوار رسالے جو اردو کا سب سے پہلا سہ ماہی رسالہ اردو جو آج ترقی اردو اور نگ آباد دکن کا آگن ۱۹۲۱ء میں نکلا، جو خاص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لئے مشہور ہے، دوسرا سہ ماہی اور نیل کج میگزین لاہور ۱۹۲۵ء سے نکل رہا ہے، جو مشرقی علوم و فنون و تاریخ پر تحقیقات مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی ایکاڈمی کا ہندوستانی لایا ہے جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان و ادبیات کا خدمت گزار ہے، ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے بھی ماہوار رسالے نکلتے رہے،

اور بند ہوتے رہے، مثلاً کلکتہ سے تسان الصدق (۱۹۰۲ء) مولانا ابوالکلام کی
 اوٹیری مین اور تنویر الشرق اور ڈھاکہ سے جادو، جونا گڑھ سے زبان اور شتاب، پونا
 رفیق الطالبہ (اینکوار دوہائی اسکول پونا) مالیکاؤن ضلع ناسک صوبہ خاندیس سے بیدار
 اور اب (۱۹۲۸ء) مین کشن گنج پورینہ سے ہمار نکلا ہے،

مدرسہ امین سفینہ اور بشری شہر مدراس سے کوثر بنگلور سے، اور مصحف عمر آباد شمالی
 ارکاٹ سے ابھی ان ہی سالوں میں نکلتے اور بند ہوئے، اب امبور سے مینا نکلا ہے، اور
 مصحف عمر آباد سے دوبارہ نکلا ہے،

سفیر سخن پشاور سے، میزان الافکار تنویر زبان ہند اور امتحان کراچی سندھ سے
 تختہ تان ملتان سے، اور آلہ صحرا بھاولپور سے ستم سے ستم تک نکلے، اور اب
 بمبئی کے افق سے صبح امید طلوع ہوا ہے،

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ میں نکلے جنہیں سے نوآے
 کیمرج اور نوآے وطن امریکہ ذکر کے قابل ہیں،

زمانہ رسالے | یہ وہ رسالے ہیں جو ادب و علم کی عام شاخوں سے متعلق ہیں، لیکن صدی کے
 خاتمہ کے قریب ہی سے مخصوص رسالوں کی اشاعت شروع ہو گئی، ۱۸۹۹ء میں مولوی
 سید ممتاز علی صاحب مرحوم نے لاہور سے تہذیب نسوان جاری کیا، جواب تک اسی
 شان سے نکل رہا ہے، یہ خاص لڑکیوں اور عورتوں کا ہفتہ وار اخبار ہے، اور مہینہ کی
 آخری اشاعت ایک خاص نمبر کی شان سے نکلتا ہے، ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ سے

خاتون نکلا جو ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تعلیم نسوان کا آرگن تھا اس ۱۹۰۷ء میں مولناراشد خیر صاحب نے عصمت جاری کیا، جواب تک کامیابی سے نکل رہا ہے، جھوپال سے ظل اسطان ہر پائیس سلطان جہان یکم مرحومہ کی زندگی بھر نکلتا رہا، اور ان کے بعد بھی کچھ دنوں نکلا کیا، منشی محمد امین صاحب زیری اس کے اڈیٹر تھے، ظل اسطان کے بدلتا کے نام سے زمانہ اخبار نکلنے لگا، مگر اب وہ بھی بند ہو چکا ہے،

چھپرا (بہار) سے زیب النساء اچھا رسالہ ۱۹۲۳ء میں نکلا تھا، پھر بہار (کوڑگا نوان) سے دوسرا رسالہ ۱۹۲۶ء میں عصمت نکلا، دونوں بند ہو گئے، پنجاب سے سیٹلی اور نور جہان دو اچھے رسالے نکلے تھے، مگر شاید بند ہو گئے، اب جان دھر سے سکہ کے نام سے مسلمان عورتوں کا مذہبی رسالہ اور جوہر نسوان کے نام سے دلی سے ادبی اور اخلاقی رسالہ خوبی سے نکل رہا ہے، اکا پنور سے ستورات، دہلی سے رہبر نسوان اور صدائے نسوان لاہور سے سیٹلی، اور نسوانی دنیا وغیرہ بہت سے رسالے نکلے لیکن شاید اپنی زندگی پوری کر چکے، اب آجکل چار برس سے ممبئی سے خاتون نام زمانہ ہفتہ وار اخبار کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، منشی محبوب عالم (پیسہ اخبار) کی صاحبزادی فاطمہ خانم اس کی نگران ہیں، ۱۹۳۷ء میں خاتون سرحد کے نام سے پشاور سے ایک زمانہ رسالہ نکلا ہے،

بچوں کے رسالے یاد آتا ہے کہ اس صدی کے شروع میں سب سے پہلے منشی محبوب عالم صاحب مرحوم نے پیسہ اخبار کے دفتر سے بچوں کا اخبار نکالا اور وہ کچھ دنوں چلا، پھر تہذیب نسوان کے دفتر میں پھول کھلا جواب تک عطر نیز ہے، بنات کے نام سے

دفترِ محنت سے بچوں کے لئے رسالہ نکل رہا ہے، ہونٹاؤں، نوٹنہال وغیرہ پر چے ہیں، مگر ان کا
مین کامیاب جامعہ ملیہ دہلی کا پیامِ تعلیم ہے،

اللہ آباد سے بچوں کی دنیا، ہمارے تربیت دہلی سے بچہ نکلے، رنگون سے معصوم ۱۹۳۳ء
مین نکلا، بچوں کی دنیا آج بھی اللہ آباد میں ہے،

فنی رسالے افنی رسالوں میں سب سے زیادہ طب پر رسالے نکلے، اور اب تک نکل رہی ہیں

حامی صحت (۱۹۳۶ء) دہلی، تبصروہ الاطبا لاہور، حاذق (۱۹۳۳ء) دہلی، معین الشفا لاہور،

(۱۹۳۶ء) میسارامپور، ۱۹۳۶ء ہو میا پتھک میگزین لاہور، ڈاکٹر لاہور، طبی میگزین (۱۹۳۳ء)

پٹنہ، حکیم کن حیدر آباد، ۱۹۳۲ء سے طبیہ کالج میگزین علی گڑھ سے، اجمل میگزین ممبئی سے،

شمس الاطبا لاہور سے، اور ہمدرد صحت ۱۹۳۶ء سے دہلی سے اچھے نکل رہے ہیں، اولہ

اب دہلی ہی سے چشمہ حیات نکلا ہے،

فن اقتصادیات پر ایک مخصوص رسالہ مالیات پٹنہ سے ۱۹۳۵ء میں نکلا، جامعہ

دہلی بھی کچھ دنوں تک اپنی اشاعتوں کے تین نمبر اقتصادیات پر نکالتا رہا، اور اب وہ

خالص اقتصادی و سیاسی رسالہ ہو گیا ہے، اور لاہور سے ۱۹۳۶ء میں اقتصادی دنیا

شائع ہوا،

حیوانیات پر سلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ حیوانیات کا رسالہ حیوانیات ۱۹۳۱ء

میں نکلا تھا، مگر بہت کم زندہ رہا،

سائنس کے تمام متعلقہ علوم پر انجمن ترقی اردو کا مشہور سہ ماہی رسالہ سائنس خوبی

سے نکل رہا ہے،

تعلیمی رسالے بھی بہت سے نکلے اور بند ہوئے، اور بعض ایسے مقامات سے نکلے جو اردو کے مرکز سے دور ہیں، جیسے رفیق طلبہ (۱۹۱۲ء) پونہ سے، طلبہ (۱۹۳۵ء) پورنہ (بہار) سے، بہارستان (۱۹۳۶ء) امراتہ برار سے، اور مستقل (۱۹۳۷ء) پشاور صوبہ سرحد سے، کچھی چند دیکھائی کارہنمائے تعلیم لاہور اس سلسلہ کا پرانا رسالہ ہے، اس وقت تعلیمی رسالوں میں پنجاب ایجوکیشنل جرنل لاہور ممتاز ہے، یہ ۱۹۳۶ء سے نکل رہا ہے، اور شیخ نورانی، پروفیسر نظراقبال اور پروفیسر گوپال داس اس کے ایڈیٹر ہیں، حیدرآباد میں معلم اور تالیم دور رسالے ہیں،

ادارے | صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کا کوئی ادارہ قائم نہ تھا، انگریزوں کے بنائے ہوئے ادارے تو غدر کے طوفان میں بہ گئے، سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی بھی سیاست کی الجھنوں میں پھنس کر رہ گئی، صدی کے آغاز میں ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی جس کے پہلے معتمد مولنا شبلی تھے، اس سے کتابوں کے ترجمے، اور بعض مستقل تصنیفیں شائع ہوئیں، سرکار آصفیہ نے اسی زمانہ میں سررشتہ علوم و فنون قائم کیا، جس کے پہلے اور محمد معتمد مولنا شبلی تھے، اس کی طرف سے الکلام، علم الکلام، موازنہ نیس و دیس، اور سولج روم وغیرہ کتابیں لکھی گئیں،

مصنفین

۱۹۱۲ء میں مولنا شبلی نے دارالمصنفین کا خیال ظاہر کیا اور آخر نومبر ۱۹۱۴ء میں دار

کی بنیاد پڑی، ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ حیدرآباد قائم ہوا، ۱۹۲۰ء کی تحریکات کے سلسلہ میں

جامعہ ملیہ کی بنا پڑی، اور اس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے اردو ایکاڈمی قائم ہوئی ۱۹۲۶ء
 میں ہندوستانی ایکاڈمی کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد دائرۃ ادبیہ پشاور انجمن ترقی اردو
 کرچی انجمن ترقی اردو پٹنہ اور انجمن مذکورہ کی دوسری شاخیں ہیں جنکی تعداد ۱۹۳۲ء کی روداد
 میں ۹۵ بتائی گئی ہے،

ستمبر ۱۹۳۷ء میں عمر آباد شاہی اراکٹ (مدراس) میں ہندوستانی ایکاڈمی جنوبی ہند
 کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے، ملیبار میں بھی ایک انجمن بروئے کار ہے،
 ابھی ابھی (جنوری ۱۹۳۸ء) دہلی سے ندوۃ المصنفین کے نام سے ایک نئے علمی و ادبی ادارہ
 کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے،

ان کے علاوہ ذاتی اور شخصی ادارے بھی قائم ہوئے، جیسے دائرۃ ادبیہ لکھنؤ، ایوان اشیا
 گورکھپور، اردو مرکز لاہور، قومی کتب خانہ لاہور، کتابستان الہ آباد وغیرہ، ان سب نے ملکر ہندو
 زبان کی ترقی و اشاعت کی اہم خدمت انجام دی ہو،

دفتر عصمت دہلی اور دفتر تہذیب نسوان لاہور عورتوں کے لئے اور جامعہ ملیہ بچوں
 کے لئے مفید طریقہ پر پیدا کر رہے ہیں،

اردو کتابوں کی تعداد | افسوس ہے کہ اردو کتابوں کا کوئی ایسا ذخیرہ ہمارے پاس موجود نہیں

اور نہ کوئی ایسی فہرست ہو جس سے شروع سے آج تک کی اردو کتابوں کی تعداد کا پتہ
 پورا تخمینہ معلوم ہو سکے، ۱۹۲۳ء میں پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے الفہرست کے
 نام سے اردو کتابوں کی جو فہرست حیدر آباد دکن سے شائع کی ہے، اس میں چھ ہزار اور سو

مطبوعہ کتابوں کا اندراج ہے، اس کے بعد چودہ برسوں میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے، وہ ظاہر ہے
 ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی ایکاڈمی کے ایما سے پروفیسر ضامن علی صاحب (الہ آباد) نے
 اردو کتابوں کی پیمائش کی محققہ روداوشائع کی ہے، اس میں باجمال بلانام سترہ ہزار نو سو ستائیس
 کتابوں کا شمار ظاہر کیا ہے، اس شمار پر بھی نوان برس گزر رہا ہے، اور عجیب نہیں کہ میں ہزار
 تک نمبر پہنچا ہوں،

بہر حال پروفیسر سجاد مرزا بیگ مرحوم کی الفہرست کے اندراجات کے رو سے آج سے
 چودہ برس پہلے ان کے علم میں ہر علم و فن کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد یہ تھی،

۱۔ مذہبیات

۹	دینیات اہل تشیع	۷۳	قرآن پاک کے ترجمے
۱۲۶	فلسفہ مذہب کلام	۲۴	تجوید و قرأت
۴۶	مذہب نصاریٰ	۵۹	حدیث
۹۸	مذہب ہنود	۹۹	فقہ اہل سنت
۱۸۸	علم اخلاق	۱۰	فقہ اہل تشیع
۱۲۲	اخلاق ہنود	۶۶	دینیات اہل سنت
۲۹۰			

۲۔ علوم

۳۰	نقشہ جات	۹۶	حساب
۶۰	علم طبیعیات	۲۹	جبر و مقابلہ
۲۰	علم برق	۴۶	مساحت
۷	علم کیمیا	۱۵	علم مثلث
۳۴	علم ہیئت	۱۳	تراشہائے مخروطی و برقیں
۷	طبقات الارض	۱۷	علم تعمیرات
۸۴	نباتات	۴۳	علم ہندسہ
۲۹	حیوانات	۳۵	منطق
۱۹	علم الابدان	۳۲	فلسفہ
۵۶۶	طب	۲۵	علم النفس
۹۰	ڈاکٹری	۱۲	مناظر
۱۱	ہومیوپیتھک	۴۹	موسیقی
۵	علاج ششی	۳۲	معاشیات
۵	بیدک	۵۹	اجتماعیات
۴۴	بیطاروی	۲۰۳	جغرافیہ

حفظانِ صحت،	۳۲	قانون،	۱۵۵
			۱۹۰۴
۳-تواریخ			
انساب،	۲۱	جنگِ یورپ،	۷
عام تاریخ	۱۳	تاریخِ مصر،	۱۳
تاریخِ اسلام،	۶۴	ترکون کی تاریخ،	۴۰
تاریخِ عرب،	۲۰	تاریخِ ایران،	۱۳
تاریخِ اسپین،	۱۰	تاریخِ افغانستان،	۱۱
تاریخِ انگلستان	۲۴	تاریخِ ہندوستان،	۹۶
تاریخِ روس،	۲	تاریخِ ہندوستان و برما و لکھا،	۱۵۰
تاریخِ جاپان و چین،	۶	تاریخ کی متفرق کتابیں،	۳۶
یونان،	۷	سفرنامے،	۱۱۵
حالاتِ اقوام،	۱۷		۶۶۵
۴-سوانح			
سیرانیار	۳	سوانح بزرگانِ دین،	۳۰
میلاد و سیرت،	۳۹	تذکرۃ الشہداء،	۳۹

۴۹	تذکرہ نسوان،	۱۹	حالات اولیاء اللہ،
۴۱	تذکرہ شعراء،	۹۶	احوال شہادت،
۷۵۳		۵۱۷	عام سوانح عمریان،
۵- ادبیات			
۴	ترکیب بند،	۳۰۰	قصے،
۱۶	واسوخت،	۶۷۰	ناول،
۴۱	مرثیے،	۳۷	ڈرامے،
۲۵	علم زبان،	۴۵	ادب،
۴۳	نعت،	۴۷	عروض و شاعری،
۵۵	صرف و نحو اردو،	۲۶۸	دیوان غزلیات،
۲۰	صرف و نحو عربی،	۶۸	نعت،
۳۳	صرف و نحو فارسی،	۸۷	مثنوی،
۲۳	نعت زبانہائے غیر،	۶۸	نظم،
۷۷	انتشار،	۷	رباعیات،
۲۰۴۴		۱۱۰	مجموعہ ہائے نظم،

۶۔ متفرقات

۶۰	رہل و نجوم	۱۰	قواعد فوج
۲۱	شعبہ	۱۳	علم قیافہ
۲۷	خوشنویسی	۳۰	کھیل تماشے
۴۲۵	تعلیم نسوان	۱۳	سمرنیم
۱۵۹	فن تعلیم	۱۲۴	صنعت و حرفت
۲۶	مجموعی میزان	۱۱۷	عمیات
۱۸۵			
۶۸۹۶			

کتبخانے | یہ امرافوس کے قابل ہے کہ اردو کتابوں کا کوئی خاص مرکزی کتب خانہ ایک
 نہیں، عموماً مشرقی کتب خانوں کے ضمیمہ کی حیثیت سے اُن کا وجود ہے، میرے علم
 میں خالص اردو زبان کا سب سے پرانا کتب خانہ میرے وطن دہلی ضلع پٹنہ میں کتب خانہ
 اصلاح کے نام سے قائم ہے، یہ کتب خانہ ۱۸۹۹ء میں چند ناوون سے شروع ہوا
 اور اب چھتیس برس کی سیم کوششوں سے اس میں خالص اردو زبان کی تین ہزار نو سو با
 کتابیں جمع ہیں جن کی فن و ارتداد حسب ذیل ہے،

۴۵۰	ادب نثر	۵۳۶	مذہب
۴۰۰	سوانح و سیرت مذکرہ	۴۹۰	ادب نظم
۳۸۰	تاریخ و جغرافیہ	۴۶۵	ناول

۲۷	سائنس	۱۴۰	تذکرۃ اشعار و تاریخ اردو
۲۱	محاشیات سیاسیات	۱۲۷	لغات و قواعد
	متفرق	۹۰	میلا دالنبی نظم و نثر
۴۸۵	مجلدات رسائل	۵۰	سفرنامے اور روزنامے
۱۵۰	کشکول	۶۲	مطبوعات فورٹ ولیم کالج
۳۹۱۲	میزان	۳۹	فلسفہ و منطق
<p>یہ ایک حقیر انجمن کا کام ہے، اگر باقاعدہ کوشش کی جائے، تو تعداد اس سے بدرجہا زیادہ ہو سکتی ہے،</p> <p>ہمارے ہاں دارالمصنفین بین اردو کتابوں کی خریداری کا انتظام نہیں تاہم اس کے باوجود جو سرمایہ جمع ہے، اس کی تفصیل یہ ہے،</p>			
۲۳	۸۔ مناظرہ	۳۱	۱۔ تفسیر
۴۴	۹۔ تصوف	۵۳	۲۔ علوم القرآن
۷۴	۱۰۔ سیرۃ نبوی	۱۱	۳۔ حدیث
۳۳	۱۱۔ سیر صحابہ	۱۳۰	۴۔ فقہ
۸۳	۱۲۔ طبقات	۷۷	۵۔ کلام و عقائد
۱۱۵	۱۳۔ سوانح	۲۴	۶۔ رد بدعت
۲۵۱	۱۴۔ تاریخ	۴۲	۷۔ ترغیب و ترہیب

۴۸	۲۶- فلسفہ	۶۳	۱۵- تاریخ علوم و فنون
۳۶	۲۷- طبیعیات	۳۷	۱۶- سفرنامے
۱۱	۲۸- کمپٹری	۱۲	۱۷- جغرافیہ
۹	۲۹- علم سکون و حرکت	۳۰۰	۱۸- دواوین
۲۷	۳۰- ہندسہ و ریاضی	۹۱	۱۹- ادب
۱۱	۳۱- ہیئت	۱۷	۲۰- مکاتیب
۵	۳۲- طبقات الارض	۱۷	۲۱- عروض و قوافی
۲۵	۳۳- سیاسیات	۱۳	۲۲- لغت
۱۹	۳۴- معاشیات	۱۰۲	۲۳- افسانے
۵۸	۳۵- طب	۳۲	۲۴- تعلیمیات
۴۵۵	۳۶- مجلدات رسائل	۱۰	۲۵- منطق
<p>۲۸۲۷ میزان</p> <p>ہندوستانی ایکاڈمی الہ آباد بھی اردو کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر رہی ہے، اس وقت تک اس کے کتب خانہ میں اردو کی ۲۵۲۱ کتابیں جمع ہوئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے،</p>			
۱۶	معاشرت	۱۹۲	مذہب
۲۷	سیاسیات	۵۶	تاریخ مذاہب
۶	اقتصادیات	۴۷	لغت
۴	سیر و سیاحت	۲۸	منطق و فلسفہ

۹۴	انتخابات نظم	۵	تعلیم
۷۶	نقد و غیرہ	۷	معاشرتی تاریخ
۱۶۵	درامے	۷۳	گرامر
۴۸۴	ناول اور افسانے	۲۲	سائنس
۱۰۴	مضامین	۷	فلکیات
۳۱	تقریریں	۷	ریاضی
۲۸	خطوط	۱	طبقات ارض
۱۰۰	ادب	۷	نباتات
۹	تمدن	۴	حیوانات
۱۴	سفرنامے	۷	زراعت
۱۶۵	سوانح	۲۰	حفظانِ صحت
۳	تاریخ اقوام	۲۵۲	دوا دین
۶۷	تاریخ ممالک	۳۶	مرثیے
۲۲۶	تاریخ و طبقات	۵۷	ثنویات
۲۵۲۱	میزان :-	۸	رباعیات
		۶۶	متفرقات نظم

انجمن ترقی اردو کے سلسلہ میں انجمن مذکور سے اردو کے جو کتب خانے ملحق ہیں، انکی

تعداد حسب ذیل ہے: حیدرآباد وکن، بنگال و آسام ۴، صوبہ متحدہ ۷، بہار و اڑیسہ ۱۸، راجپوتانہ ۸، گجرات و کاٹھیاوار ۳، سندھ ۲، بلوچ ۲، سی پی ۱۶، دہلی کے لالہ سری رام مصنف نختیہ جاوید کے پاس اردو شعر و ادب اور تذکرہ کرون کا اچھا ذخیرہ تھا، اب وہ ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہے،

یورپ میں ہندوستانی زبان کی کتابوں اور کتب خانوں کا پتہ سب سے پہلے سار نے پیش کیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں جب مجھے پہلے پہل انڈیا آفس لائبریری کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں ہندوستانی زبان کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہے جس کی فہرست تین سو صفحوں میں سمائی ہے اور اس میں ہندوستانی کی پرانی چھپی ہوئی کتابیں جنہیں بڑا سرمایہ غدر سے پہلے کے مطبوعات کا تھا، موجود ہیں، ۱۹۲۰ء تک کی کل کتابوں کی مجموعی تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ سارے مطبوعات چھ عنوانوں علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الہیات اور متفرقات پر تقسیم ہیں، اور ان میں سے ہر ایک عنوان میں سیوں تختی عنوانات پر مشتمل ہے، مثلاً علوم و فنون کے عنوان کے نیچے زراعت، صنعت و حرفت، ہیئت و نجوم، نیرنگ و طہم، سپہ گری، انگریزی قانون، ہندو قانون، اسلامی قانون، منطق و فلسفہ، طب و تشریح، موسیقی، طبعیات، معاشیات، اجتماعیات وغیرہ ۲۴ بابوں پر تاریخ و جغرافیہ کا عنوان، علم الانساب، عام تاریخ، سوانح اور سفر نامے وغیرہ ۱۰ بابوں پر تعلیمی و درسی کتابوں کا عنوان، قواعد و ریاضیات و طبعیات تذکرے، خطوط وغیرہ ۴ بابوں پر تعلیمی و درسی کتابوں کا عنوان، قواعد و ریاضیات و طبعیات

وغیرہ کے ۲۰ بابوں پر، الہیات و دینیات کا عنوان، برہمنی و لاندہبی، بودھی، عیسائی، ہندو
 جینی، اسلام، سکھ مت وغیرہ ۲۰ عنوانوں پر بٹا ہوا ہے، متفرقات، تعلیمات، تعلیم نسوان،
 تعلیم صبیان، تقریرون کے مجموعون، ماہوار رسالوں اور مجلّوں کی رودادون، چھ ذیلی عنوان
 پر منقسم ہے ۱۹۲۷ء میں اس کتب خانہ کی ہندوستانی قلمی کتابوں کی جو فہرست چھپی ہوئی
 ۶۹ قلمی نسخے درج ہیں،

ہمارے دوست مولوی نصیر الدین صاحب تہی نے یورپ کے اکثر کتب خانوں کی سر
 کر کے وہاں کے قلمی نسخوں پر ایک جامع کتاب لکھی ہے، اس میں ان کتب خانوں کی فہرست
 دی ہوئی ہے، جہاں ہندوستانی کتابوں کا ذخیرہ ان کو نظر آیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے،
 کتب خانہ انڈیا آفس، کتب خانہ برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، اسکول
 آف اورینٹل اسٹڈیز، بوڈلین لائبریری، اوکسفورڈ، کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی، کتب خانہ
 گنگ کالج کیمبرج، کتب خانہ کالج کیمبرج، کتب خانہ کرائسٹ کالج کیمبرج، اٹین کالج،
 کتب خانہ اڈنبرا یونیورسٹی، قومی کتب خانہ پیرس،

جاپان کے مشرقی زبانوں کے مدرسہ میں بھی ہندوستانی کتابوں کا نیا ذخیرہ ہے، کا
 کی انجمن ادبی کے پاس بھی ان کا سرمایہ ہے، ابھی جب یہ سطرین لکھ رہا ہوں، بدخشان کے کتب خانہ
 کے لئے ۲۵ ہندوستانی کتابیں ہمارے ہاں سے بھیجی جا رہی ہیں، جو انجمن ترقی اردو اور دارین عظیم
 ہندوستانی زبان کے مرکزوں سے بہت دور دریاے شور کے کناروں پر بلکام
 احاطہ بلہئی میں کتب خانہ رزاقیہ کے نام سے جناب عبدالرزاق صاحب نے صرف اپنی

محنت سے اردو کا ایک کتب خانہ فراہم کیا ہے جس کو مین نے ۱۹۱۶ء میں دیکھا تھا، اس وقت اس میں دو ہزار سو چھتیس کتابیں ہیں، بڑی بڑی جلدوں کی کتابوں کو بھی ایک کتاب فروش کیا گیا ہے، جن کی فن دار فرست یہ ہے،

۱۔ وینیات

۱	اصول فقہ	۱۳	قرآن مجید کے ترجمے
۸	مضابطہ و قانون	۴	تجوید
۶۴	رد فرق	۱۴	اوراد و وظائف
۱۵	عقائد	۱۵	علوم القرآن
۱۳۶	مناظرہ و کلام	۲۱	تفاسیر
۳۰	تصوف	۲۰	احادیث
۱۴	مواظط و خطب	۴۵	فقہ حنفی
۲۳	کتب مذاہب عالم	۱۰	قباوی
		۹	فرائض

۲۔ جغرافیہ

۴۱	سفر نامے	۱۱	کتب جغرافیہ
		۹	نقشہ

۳-تاریخ

۴	مستقبل اسلام	۴	تاریخ قدیم
۷	اندلس	۳	تاریخ مصر
۲	مراکش	۷	ایران
۲	تونس و طرابلس	۳	یونان
۴	افغانستان	۱	روم
۱۶	تاریخ عام هندوستان	۴	چین و جاپان
۱۲	وکن و همارا شتر	۱۵	تاریخ قبل اسلام
۱۰	لکهنو و بھوپال و گجرات	۲۶	تاریخ خلفاء
۹	تاریخ تمدن	۹	تاریخ تمدن اسلام
۷۵	سیاسات ہند	۳	تاریخ فرق اسلام

۴-سوانح

۲۸	خواتین اسلام	۵	انبیاء
۳۷	شہان اسلام	۱۷	سیرۃ نبوی
۴۶	مشاہیر عالم	۱۲۵	سیر رجال

۱۶	تذکرہ شعراء	۶	خواتین عالم
۵۔ نظم و ادب			
۲۲	مباحث شعروادب	۳۰۱	منظومات
۲۸	قواعد و عروض	۶۰	دواوین شعراے قدیم
۱۸	خطوط	۷۰	شعراے جدید
۷۰	مقالات	۱۱	نقیہ
۵۲	لغات و محاورات	۱۵	مثنویات
		۱۶	مرثیے
۶۔ اخلاق و معاشرت			
۱۸	معاشیات و اجتماعیات	۶۲	اخلاق قدیم و جدید
۷۔ نسائیات			
۴۲	خانہ داری	۳۵	عورتوں کی معاشرت
		۵۲	زنا نہ قہقہے
۸۔ علوم			

اس کام کے نلکے کے لئے
 ران اور بھی لئے گاڑی چنی
 ہے ہر گز مثل شیر و شکر
 ہوا خوب جب باہمی ساز و باز
 تو باہم ہم آواز دونوں ہوئے
 وہ تھا کونسا رازیہ راز تھا
 کہ میں مقطع معدنیات اگر
 تو کہئے کہ کیا دیئے گا مجھے
 کہا واسٹن نے نہ گھبرا ئے
 کمیشن میں مجھے حصص لیجئے
 رہے آپ میں مجھے میں یہ ساز و باز

ولایت کو آخر روانہ ہوئے
 بھٹی دلیں دونوں کے جو کچھ مٹی
 ہوا کرتے تھے مشوریات
 ہوئے ختم اشکال سوز و گداز
 یہاں تک کہ ہزار دونوں ہوئے
 کہ سردار نے واسٹن کھا
 ٹھہرا ہی دون آپ کے نام پر
 کروں کوششیں گر کمیشن
 خریدار حصوں کے بن جائے
 جو کوشش ہو امکان میں
 کہیں ہوتے پاویں نہ اقتدار

بھی وہیں ہے، اُن کے صاحبزادہ سید معز الدین خان نے بتایا کہ اس میں چھ ہزار کتب ہیں تفصیل معلوم نہ ہو سکی،

دکن کے ایک دوسرے سرے پر یعنی بنگلور میں مسلم لائبریری ۲۵ برس سے قائم ہو چکے اس کے دیکھنے کا اتفاق ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا، کتابوں کی تعداد معلوم نہیں،

انجمن ترقی اردو اور نگ آباد کے پاس بھی اردو کا بڑا کتب خانہ ہے، لیکن اسکی فہرست دریافت نہ ہو سکی، تاہم یہ معلوم ہے کہ قدیم اردو کتابوں کا قلمی سرمایہ اس کے پاس سب سے زیادہ ہے، اور جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، ہمارے دوست ڈاکٹر سید حفیظ صاحب (الہ آباد) کے پاس بھی قدیم اردو کی کچھ قلمی کتب ہیں،

دلی میں لالہ سری رام انجانی کا کتب خانہ جمین قلمی دیوان اور تذکرے تھے، اب ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہو،

اہم تصنیفات | ان اداروں کے ذریعے اور مختلف ذاتی کوششوں سے ہندوستانی زبان میں ہر سال مفید تصنیفات کا سلسلہ اتنا آگے کو بڑھ رہا ہے، جو اگر شکر کے لائق نہیں تو شکوہ کے لائق بھی نہیں، معارف کے چند سال کی تنقیدات سے ان کی سالانہ فہرست یہ ہاتھ آئی ہے، جو ظاہر ہے کہ اصلی تعداد سے بہت کم ہے،

سنہ	کتابیں	رسالے	میزان
۱۹۳۱ء	۷۳	۳۲	۱۰۵
۱۹۳۲ء	۱۱۱	۱۸	۱۲۹

سنة	کتابین	رسالے	میزان
۶۱۹۳۳	۶۰	۳۰	۹۰
۶۱۹۳۴	۱۳۹	۴۵	۱۸۴
۶۱۹۳۵	۱۴۷	۳۵	۱۸۲
۶۱۹۳۶	۹۵	۳۸	۱۳۳

یہ ایک رسالہ کی تقیدات کی تعداد ہے،

بہر حال اس وقت ہندوستانی زبان کا سب سے بڑا تصنیفی ادارہ سر رشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہے، یہ ادارہ ۱۹۱۷ء سے کام میں مشغول ہے، اس وقت تک مختلف علوم و فنون کی ۲۳۶ کتابیں اس نے شائع کی ہیں، ۶۲ کتابیں زیر طبع ہیں اور ۱۰۵ کتابیں زیر ترجمہ و تالیف ہیں، اور ۱۱ کتابیں زیر تجویز ہیں، ان کی فن وارفہرست درج ذیل ہے،

فہرست دارالترجمہ حیدرآباد دکن
تا نومبر ۱۹۳۶ء

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۱	مصطلحات	۰	۰	۱
۲	تاریخ ہند	۳۳	۶	۱۵

کمر لوگ شکر کہتے چمکتے گئے
 آواز سوقت تک کوئی سمجھا تھا اور
 بحیرہ واٹسن اور سردار کے
 ہوا یون تدارک اور دھڑکا
 یہ سردار ہی جیب بھر چکے
 ہوئے نامور جمع زر ہو گیا
 یہ حکمت کی یان آتی ہی ایک بار
 کئے بیج سرکار عالی کے نام
 بچار کھے اپنے لئے دس ہزار
 تہین یاد ہو گا یہ حصے تہ دو
 خزانہ سے کی اونکی قیمت و

روپیہ مینہ کی صورت برسنی لگے
 بکے بین یہ سب حصے فرجی کھیلے
 تھے سب لوگ دھومیں مانی ہوئے
 ادھر کار میننگ جاری کیا
 پھرے گھر کو دو دن پہر وان
 وسیلہ طفل کا سفر ہو گیا
 کہ اپنے حصص ساڑھی بارہ ہزار
 کتاب المنافع ہوئی اب تمام
 کیا نقد سے مختلف کاروبار
 کہ حق کمیشن مین پائے تھے جو
 ہوا یون زر نقد وافر حصول

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۱۹	ریاضیات	۲۲	۵	۵
۲۰	طبیعیات	۲۱	۰	۲
۲۱	کیمیا	۱۰	۱	۷
۲۲	نباتیات	۰	۳	۰
۲۳	حیوانیات	۰	۳	۰
۲۴	طب	۹	۱۰	۱۹
۲۵	انجینیری	۱۷	۱۸	۸
۲۶	فن تعلیم	۰	۰	۳۰
۲۷	میزان	۲۳۶	۶۲	۱۰۵

انجن ترقی اردو کے مطبوعات کی تعداد ۹۵ ہے جس میں تذکرے، قواعد، درسیات، معاشیات، تعلیمات، طبیعیات، نفسیات، ارتقاء، نباتیات اور تاریخ کی کتابیں داخل ہیں ان کی فن و اقسام یہ ہے،

۱	ادب	۳۵	ان میں، شعراے قدیم کے تذکرے اور ۶
۲	تاریخ و سیر	۱۵	اردو کی قدیم کتابیں ہیں،
۳	سائنس	۱۲	تعلیم
		۴	۳
		۵	۳
		۵	فلسفہ

۶۔ قواعد زبانِ انسانیات وغیرہ	۷	۹ لغت	۱
۷۔ درسی	۱۵	۱۰ معاشیات	۱
۸۔ مذہب	۲	۱۱ خطابِ صحت	۱۰

ہندوستانی ایک اڈمی نے اپنی دس برس کی زندگی میں اردو کی پچیس کتبیں شائع کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے،

۴	۱	تعلیم و تربیت	۱
۲	۱	سیاسیات	۱
۱	۳	ترجے	۳
۲	۲	انتخاباتِ دوادین	۲
۵	۱	ادبِ اردو کی پیمائش	۱
۲	۲	متنِ کتب	۲
میزان		۲۴	

ذکر کے قابل پنجاب یونیورسٹی کے مطبوعات بھی ہیں، جہاں سے تذکرہ اور تاریخِ اردو کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اسی طرح اسلامیہ کالج پشاور بھی شکر یہ کا مستحق ہے، جہاں کے پروفیسروں نے نظریہ اضافیت اور تہیئت و فلکیات پر کتابیں شائع کی ہیں، ان کے علاوہ اردو اکاڈمی (جامعہ) دہلی ہے، جو ہر سال کچھ کتابیں شائع کرتی ہے جن میں نفسیات، فلسفہ، اقتصادیات، اور سیاسیات کا حصہ زیادہ ہوتا ہے، کتابستانِ الہ آباد نے تاریخ

فلسفہ اور ادب پر متحد و کتابین چھاپی ہیں، قومی کتب خانہ لاہور نے افسانے ترکون کی موجودہ تاریخ اور ادبیات لطیفہ کی بعض کتابوں کی اشاعت کی ہے، فطامی پریس بدایون نے شعروں مرثیہ، دیوان اور تائین چھپوائی ہیں، الناظر بک ڈپونے بھی تاریخ، سفر نامے اور ادب کی بہت سی کتابیں اضافہ کی ہیں، ایوان اشاعت گورکھپور نے فلسفہ ادب اور افسانوں کے مجموعے شائع کئے ہیں، اردو مرکز لاہور نے منتخبات نظم و نثر کی ۳۰ جلدیں شائع کی ہیں، بطیہ کالج نے طب کی اہم کتابوں کا آٹا اچھا ذخیرہ ہندوستانی میں جمع کر دیا ہے، کہ بطیہ کالج دہلی بطیہ کالج علی گڑھ، بطیہ اسکول لکھنؤ، اور بطیہ اسکول پٹنہ کی تعلیم کے لئے وہ بہت کچھ کافی ہو رہی ہیں، حیدر آباد میں کئی تجارتی ادارے ہیں، جن سے ادب، ادب کی تاریخ، تنقید اور افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں، مدراس یونیورسٹی نے بھی اپنے فرض کو محسوس کیا ہے، اور مولوی محمد صاحب لکچر راء و مدراس کی کوشش سے دیوان بیدار واقعات اختری کا ترجمہ اور بعض کتابیں چھاپی ہیں، اب دلی میں عالی پبلشنگ ہوس کے نام سے ایک نیا اشاعت خانہ قائم ہوا ہے،

دارالمصنفین کے اشاعت خانہ نے اپنی پائیس سال کی زندگی میں ۲۷ کتابیں شائع کی ہیں جن کی فن وار فہرست یہ ہے،

۱- سیرت و سوانح	۲۱	۴- ادب	۱۱
۲- تاریخ	۱۸	۵- تعلیم	۳
۳- فلسفہ	۱۲	۶- تصوف	۲

۱	۹ - فلسفہ تاریخ	۲	۷ - فقہ
		۳	۸ - مذہب

سلسلہ دار المصنفین کا آخری نمبر ۵ ہے،

علوم و فنون [کتابوں کی کثرت اور تعداد کو چھوڑ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی دینیت میں قرآن پاک حدیث اور فقہ کے بہت سے ترجمے ہو چکے، جدید اور قدیم علم کلام کا ذخیرہ بھی اچھا ہے، اسلامی قوموں اور ملکوں کی تاریخیں بھی خاصی ہو گئی ہیں، یورپ اور امریکہ کی تاریخیں بھی موجود ہیں، طب، ہومیو پتی، اور ڈاکٹری کی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، سائنس اور ریاضیات کی کتابیں اتنی ترجمہ ہو چکی ہیں کہ ان کے بل پر ایک یونیورسٹی کا پورا شعبہ علم فلسفہ میں افلاطون، ارسطو، کانت، ہیوم، شوپنہاؤر، برگسٹران کے فلسفے ہندوستانی ہیں آچکے ہیں، اسی طرح روسو، نٹشے اور ٹالسٹائی کے خیالات بھی اس زبان کا جامہ پہن چکے ہیں، اخلاقیات، نفسیات اور معاشیات کا ذخیرہ بھی قابلِ قدر ہے، علمی اصطلاحات کی کئی ڈکشنریاں بن چکی ہیں، ترقی اردو نے انگریزی اردو، اور اردو انگریزی ڈکشنری، پیشہ وروں کا لغت اور اردو کا عام لغت تیار کیا ہے، دار المصنفین نے عربی اردو کا لغت لکھوایا ہے، عام لغات میں فرہنگِ اصفیہ کے بعد اس عہد میں تیر کا کوروی مرحوم کی نوللغات اور لاہور میں عام استعمال کے لئے جامع اللغات کئی جلدوں میں لکھی جا چکی ہے، ان میں گو غلطیاں بھی ہیں، مگر ایک طرح سے انسائیکلو پیڈیا کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے، اردو ادب کی تاریخ کے سلسلہ میں پنجاب، صوبہ متحدہ اور دکن کے اہل قلم نے اس صدی

مین بہت کچھ کام کیا ہے، اور شک نہیں کہ اس زبان کی پیدائش کی کمافی اب مسلم تاریخ بن رہی ہے، اس تحقیق کا آغاز ہمارے صوبہ مین مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کی گلی رعنا سے ہوا اور اس کی تکمیل دکن اور پنجاب کے اہل تحقیق نے کی، ترقی اردو نے شعرا کے پرانے تذکرہ اور پرانی زبان کی ابتدائی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے،

ہندو مذہب اور تاریخ و تمدن کا سرمایہ بھی اس زبان مین موجود ہے، وید، مہابھارت، رامائن، منو ساستر، گیتا، ہندو تہذیب، رہنمایان ہند، قدیم ہند کے ترجمے ہو چکے ہیں، ہندی ادب، ہندی شاعر کبیر داس، ہندی تیوہارون پرکتا مین لکھی گئی ہیں، مگر ابھی یہ ذخیرہ ناکافی ہو اور مزید ترقی کا محتاج ہے،

خاتمہ | یہ ہندوستانی زبان کی نصف صدی کی رفتار کا اوصو راخا کہ ہے، معلومات ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھے نہیں کئے گئے، بلکہ جو کچھ یاد تھے، ان کو کاغذ پر کھینچ دیا ہے،

(معارف - دسمبر ۱۹۳۷ء)



مقالہ

اکبر کا ظرفیہ کلام

ولی دکنی سے لیکر امیر و داغ و جلال کے زمانہ تک ہماری شاعری جس تنگ و محدود
شاہراہ پر چل رہی تھی، اہل محفل کا دل اس سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اگر نئے راستے پیدا نہ ہوتے تو
اردو شاعری فنا ہو چکی ہوتی مولانا شبلی کی تاریخی شاعری، مولانا حالی کا پند و موعظت، مولوی
سمیع اللہ میرٹھی کی اخلاقی کہانیاں، ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ، میر اکبر حسین صاحب کی پڑھی
اور لطیف ظرافت، اردو شاعری کی جدید تاریخ کے شاندار ابواب ہیں،

ارباب تجارت و طرح کے ہیں، ایک وہ جو بازار کا چلن دیکھ کر اپنی دوکان میں
ہر ضرورت کی چیزیں ادھر اور دھر چن دیتے ہیں، خریدار راستہ سے گزرتے ہیں، اور اپنی
پسند اور ضرورت کے مطابق دوکان سے مختلف چیزیں اٹھا لیتے ہیں، ان کوکانداروں کو پھر سستی
اور چلتی ہوئی چیز نظر آتی ہے، اس کو لے کر اپنی دوکان سج لیتے ہیں دوسرے وہ سوداگر
ہیں، جنھوں نے اپنے مذاق اور استعداد کے مطابق کوئی چیز پسند کر لی ہے اور وہی

ایک جنس اُن کی دوکان میں ملتی ہے، اگر تم کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو اسی قسم کی کوئی اور دوکان تلاش کرو، جہاں صرف اُسی جنس کی تجارت ہوتی ہو، عموماً بڑے بڑے تاجر اسی دوسری قسم کے ہیں،

شاعری کا بھی یہی حال ہے، فروسی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، خیام نیشاپوری، عرفی شیرازی، جن کا کلام قبول عام چل کر چکا ہے، تھوک فروش سوداگر تھے، ان کے یہاں شاعر کے مذاق کے مطابق کلام ملیگا، اُن میں ناظرین کے مذاق و انتخاب سے بحث نہیں، ایک شاعر و خطیب میں سب سے بڑا نازک فرق یہی ہے، شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھاتا ہے، خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے، اور اُن کے خیالات و جذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعرا کا ایک خاص رنگ مذاق ہے جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتے ہیں،

قدیم شعراے اردو میں میر، غالب، انشا اور نظیر اکبر آبادی کے سوا کسی اور کا کوئی مخصوص موضوع سخن نہیں، جدید شاعری کے ہماری زبان پر دو بڑے احسانات ہیں، ایک تو غزل و قصیدہ کے متفرق و پراگندہ خیالات کے بجائے عربی شاعری کی طرح مسلسل مضامین کی اس نے بنیاد ڈالی، دوم یہ کہ زلف و شانہ کے ابجھاؤ اور گرفتاری سے اس نے نجات پائی، اور ہر قسم کے مسلسل خیالات شعر میں بندھنے لگے، ہماری تعلیم اور عام فضل و کمال کے مشابہ میں جس طرح اب تک وہی قدیم تعلیم یافتہ تھے، جنھوں نے بوریا نشین ہو کر تعلیم پائی اور اب تک قومی ایٹج کے وہ مالک تھے، اسی طرح جدید شاعری کے میدان

میں بھی اب تک وہی بزرگوار پیشرو ہیں، جنہوں نے قدیم شاعری سے اکتا کر اس نئے
کو چہ میں قدم رکھا۔

مولانا حالی، اور میر اکبر حسین دونوں قدیم شاعری کے استاد مسلم الثبوت ہیں، ان کے
دیوانوں کا ایک حصہ ان ہی قدیم غزلوں کا مجموعہ ہے جس کے شکست و ریخت میں عمر
کا بڑا حصہ ضائع کیا گیا ہے، میر صاحب غالباً وحید اللہ آبادی کے شاگرد ہیں، جنکو انش
یا ناسخ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، بنا پر میر صاحب کی شاعری میں لکھنؤ کا مذاق نہایت نمایاں
ہے، اور وہی رنگِ طبیعت نکھر کر ایک اور عالم بن گیا ہے، اب تک ان کے دو دیوانے
شائع ہو چکے ہیں، کلام کی تقسیم مختلف مضامین پر ہے، لیکن درحقیقت ہم ان کو صرف تین
جلی تقیسات میں درج کرتے ہیں، غزلین، سنجیدہ اور تین کلام، ظرفیہ نظمیں، اول اور دوم
صنفِ سخن کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں صرف تیسری صنف ایسی ہے جو انکی خاص چیز کی جاسکتی ہے
لکھنؤ کے شعرا میں سید انشا (لکھنؤ آکر) اور امانت لکھنوی کا جو رنگ ہے، میر صاحب
کی ظرفیہ نظموں کا درحقیقت وہ اساسِ سخن ہے، آج سے تیس برس پہلے لکھنؤ سے اودھ
نام سے ایک اخبار نکلا تھا، اور مدت تک زندہ رہا، میر صاحب کے فطری رنگ کی خوشگلی
میں اس اخبار کی بڑی مدد ملی، اسکی ہفتہ وار اشاعتوں میں میر صاحب کا کلام خاص ذوق و شوکت پر چاکرتے تھے
اودھ پنچ کے گرجانے کے بعد اور ماہوار رسائل میں بھی میر صاحب کا کلام چھپکر مطبوع ہونے لگا، اور انگریزی
زبان کا ہر ممتاز رسالہ اور اخبار ان کے اشعار کے لئے ہر مہینہ بقیارِ رہتا ہے
میر صاحب کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام پرستی اور سنجیدہ ظرفیت ہے،

ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کا مغز سخن خواہ جو کچھ ہو لیکن اس کا تشربالائی صرف سنجیدہ طرافت ہوتی ہے، طرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد صرف تفریح طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی محض تفریح طبع تھا، اور لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جان صاحب کا طریقہ نہ رنگ گو زمانہ لہجہ میں اگر بد نما ہو گیا تھا، تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریح طبع پر تھی، میرزا کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی ابن یحییٰ بنیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا بلکہ اس کی تہ میں، پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادشاہ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں،

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ میر صاحب کے اصناف کلام میں گوہر عنب کی چیزیں ملی ہیں لیکن ان کے کلام میں لذت و حقیقت طرافت کی ہوتی ہے، جسکے مزہ سے دل اور زبان دو نون لطف اٹھاتے ہیں،

میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں، جنکو یوں پینا اس جدید دورِ لطافت و تنزہ پسندی

مین نامکن تھا، میر صاحب بھری محفل مین، علمائے کرام، مشائخ عظام، امرا و حکام مدعیان ہر پر
عام، اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور ان کی چتون پر سیل تک نہیں آتا،
میر صاحب کا اصل رنگ یہ ہے کہ جدید طرز معاشرت، یورپین اخلاق و عادات،
تعلیم جدید کے نقائص، مغربی تقلید کے معائب کو نظر افت کے پردہ مین اس طرح نمایان
اور واضح کریں کہ مخاطب جھینپ کر خاموش ہو جائے، اور اپنے فعل پر تھوڑی دیر کے لئے
اس کے چہرہ پر مذمت سے پسینہ آ جائے، کہتے ہیں،

ہر خچہ کہ کوٹ بھی ہو پستون بھی ہے	بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہو صابون بھی ہو
لیکن یہ مین تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی	یورپ کا تری رگون مین کچھ خون بھی ہو
آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے	واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطین عزت کی اور ہین کبیر	چلتا نہیں کام صرف نقالی سے
تعلیم مین اُن علوم کے ہو مضرو	نیچر کی جو طاقون کو کرے مکشوف
لیکن تم سے اُمید کیا ہو کہ حسین	عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف
مذہب کی کون تو دلگی مین اڑ جائے	مطلب کی کون تو پالی مین اڑ جائے
باقی سر قوم مین ابھی ہے کچھ ہوش	غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی مین اڑ جائے

میر صاحب کی ظرفانہ شاعری پر اگر تنقید کی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی
ظرافت کے مختلف سات عنصر ہین جنکی تفصیل حسب ذیل عنوانون مین کیجا سکتی ہو،
رعایت لفظی یا ضلع جگت | دنیا مین کوئی چیز بری یا بھلی نہیں ہو، ہر چیز کا اعلیٰ استعمال بڑا یا بھلا ہے

ضلع جگت درحقیقت ایک بازاری چیز ہے، اس لئے سنجیدہ کلام اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
امیر خسرو نے اعجازِ خسرویی کے ذریعہ اس عالم میں اپنی پیغمبری کا لاکھ ثبوت دیا لیکن
اہل ہوش و خرد کے نزدیک مقبول نہ ہوئی۔

رعایتِ لفظی اور ضلع جگت، متاخرین بلکہ متوسطین شعراے لکھنؤ تک کا مذاقِ خاص
رہا ہے، اکثر صرف اسی اساس پر ان کی شاعری کی ساری بنیاد قائم ہوتی ہے، ان لوگوں نے
بڑی غلطی یہ کی کہ اس کا کوئی خاص محل استعمال متعین نہیں کیا، بلکہ ہر قسم کے کلام کو اس زریعہ سے
آراستہ کرنا چاہا یہی وجہ ہے کہ وہ اونچے طبقوں میں مقبول نہیں ہوا لیکن میر صاحب نے
رعایتِ لفظی کو صرف ظریفانہ کلام کے ساتھ مخصوص کر دیا، جو اس کے لئے خاص طور پر موزون
تھی، میر صاحب کے ظریفانہ کلام کے رنگ کو جا بجا اسی عنصر کی آمیزش نے نہایت شوخ کر ڈالا
ہے، مثلاً گویاں دوا کی بھی ہوتی ہیں اور بند و قون کی بھی، اس تجنیس سے دیکھو میر صاحب
کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں،

گویوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو سضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں
رسالہ کی تجنیس سے دیکھئے کس طرح کام نکالتے ہیں،

ملکی ترقیوں میں دوائے کھائے
پلٹن نہیں تو خیر رسالے کھائے
بس کی تجنیس دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے،

سہرا سر نور تقویٰ سایہ پر قربان کر آئے
یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زرد کھوکے مس لائے
تثلیت اور تین،

شیخ تلیث کی تردید تو کرتے تہنیں کچھ گھر میں بیٹھے ہوئے والیتن پڑھا کرتے

اس رعایتِ لفظی اور تجنیس کے شوق میں بعض اوقات وہ اردو و انگریزی و فارسی الفاظ کو بھی باہم متجانس کر لیتے ہیں، اور اس میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے، ”ہمیں“ انگریزی میں خاکسار کو کہتے ہیں، وہ اس کو امام خلیل بناتے ہیں،

ہر طرح ہے اب عاجزی ہم میں اب ہمارے امام خلیل ہیں
پاس کرنا اور پاس رہنا،

لندن میں بگڑ جاؤ گے دسواں ہی ہے گڈ ڈے اور گڈے،
تم پاس رہو میرے بڑا پاس ہی ہے

ضرورت کچھ نہ تھی اسکی کہ بسین بھی ہو جائے سلام و رحمتہ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ اور گڈے
حیاتِ مذہبی سے بھاگتا تھا کھیل گڑیوں کا کمان کی قوم ہاں کچھ بنگے ہیں نازنین گڈے
کم آل اور کمال،

ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر کتا ہے ”کم آل“ جسکو صہل ہو کمال
کم آل (تم سب آؤ) اور کمال کی تجنیس صوتی اس ظرافت کی بنیاد ہے،

جدتِ قافیہ | میر صاحب کی ظرافت کا بڑا کھیل اکثر اوقات قافیہ کی جدت ہوتی ہے،
یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ کے استعمال کرتے ہیں، مثلاً

ہوئے طوبی ہو اب نہ سرین نہ موج کوثر ہو اب نظرین

ہوس اگر ہو تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیہ میں

اک دن وہ تھا کہ رگبے تھے لوگ دین سو
 اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے نشین سے
 خواہش ہو تجھے اگر غنی بننے کی
 دولت کی ہوس ہو اور جہنی بنو کی
 شخصی حالت کو چھوڑے ہندی
 کوشش لازم ہے کمپنی بنو کی
 بلبل بن آج ہم چمنستان کمپ کے
 پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے
 فکر بہشت کو اثر و تسنیم ہو چکی
 اب پارک کا خیال ہو چرچے بن پکے
 رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونکے
 خور ہوئے ہیں لیپکے اسکپکے جمپکے
 عینک آنکھوں میں منہ میں مصنوعی دانت
 نیچر نے سکھا کے کر دیا جسم کو تانت
 اب تک ہے وہی مگر ہوس حضرت کی
 ہے طول اہل ہنوز شیطان کی آنت
 نہ نماز ہو نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہو نہ حج ہے
 تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جہنم کوئی آج ہے
 بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو عموماً قافیہ نہیں بنتے، لیکن میر صاحب اس قسم کے الفاظ
 کی ترکیب سے بعض موقعوں پر قافیہ کا کام لیتے ہیں، اس لئے اس سے نہایت ندرت اور
 جدت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لیکر
 بنیا بیٹھا ہے موٹھ موٹھی لیکر

سودا اس کو ہے جو سدھا ران
 وہ دولت جو سن گھر میں ہو تھی لیکر

پوتھی، موٹھی کا قافیہ جو تھی کتنا عجیب ہے۔

میر صاحب کو قافیہ نکالنے میں کمال حاصل تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ
 میں نے ان سے کہا کہ میرے نام کا قافیہ نکالے تو جانیں، وہ اس وقت چپ ہوئے تھوڑی

دیر کے بعد میر صاحب نے دعوت کا منظوم رقعہ بھیجا،

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

قبلہ قبلی اور شبلی کا قافیہ ان ہی کی تلاش سے مل سکتا تھا،

مخاطب کے دعویٰ کی | میر صاحب کے کلام میں بعض وقت ظرافت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مخا
تشریح کے دعویٰ کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن اس کی تشریح اس طرح کر دیتے ہیں

کہ مدعا اس کے بالکل مخالفت ثابت ہوتا ہے، مثلاً موجودہ بیداری سید احمد خان کی گوشہ
کا نتیجہ خیال کیجاتی ہے، میر صاحب اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر کہتے ہیں مین لٹہست اتنی تو ہو کہنگ
اٹھتے وقت اللہ کا نام لیں،

سید صاحب کھانگئے ہیں جوشعور کتنا نہیں تم سو کہ ہو اس سے نفور

سو توں کو جگا دیا انھوں نے کین اللہ کا نام کیسے اٹھنا ہے ضرور

جدید تعلیم یافتہ گروہ کالج کو تمام قومی کاموں کا تنہا اور واحد مرکز بتاتا ہے، میر صاحب
اس کے اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی طرح واحد اور ایک جس طرح ایک بے مایہ کی
ایک واحد جھوٹری، یا اندھے کی ایک لکڑی،

مسلمانوں نے کالج کی بُری کیا راہ پکڑ لی وہی تو کٹھکنا ہو ہی اندھے کی لکڑی ہے

جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی، اور عورتوں کو پبلک مجمع میں دیکھنے

کے مشتاق ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے گویا وہ تعلیم سے عاری ہے، میر صاحب

ان کے دعویٰ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں،

حامدہ چکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
 اب وہ شمع بزم ہو پہلے چراغ خانہ تھی
 ”شمع بزم“ اور چراغ خانہ کی تشریح سن کر عجیب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی اور انگریزی
 تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائیں،
 ابہام | یعنی کسی فقرہ کے دو مطلب ہوں، قریب تر غیر مقصود اور بعید تر مقصود ہو،

یورپ لے لے جو چاہیں دل میں بھر دیں
 جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھو دیں
 بچے رہو ان کی تیسہ لیون سے اکبر
 تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں
 تین ٹکڑے کرنے سے قطع و برید نہیں، تثلیث مراد ہے لیکن ابہام قطع و برید کا ہوتا ہے
 یہی اس شعر کا لطف ہو،

بے پردہ کل جو ہیں نظر چندی بیاں
 اکبر زمین میں غیرت قومی سے گر گیا
 پوچھا جو ہیں نے آپکا پردہ وہ کیا ہوا
 کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا
 بظاہر اس سوال کا جواب ہے کہ پردہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ مردوں نے چھین لیا
 لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ مردوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا، اور اپنی عورتوں کا پردہ انھوں نے اٹھا
 بوٹ ڈاؤن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
 میرا مضمون رہ گیا ڈاؤن کا جو تاج لگ گیا
 جو تاج لگ گیا کے دو معنی ہیں، ایک مقصود دوسرا غیر مقصود،

قدیم شعرا کے خیالات کو دوسرے
 میر صاحب بعض اوقات قدیم شعراء کے خیالات کو اس طرح اٹ
 پیرایہ میں ادا کرنا
 پلٹ کر ادا کر دیتے ہیں کہ قدیم و جدید مضامین میں ایسی ولادیر

مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بیساختہ تہنسی آجاتی ہے، سعدی کا شعر ہے،

چہ بر تخت مردن چہ بر دوسے خاک

وہ اسکو یون پلٹے ہیں،

چہ بر میز خوردن چہ بر سو خوان

چو مضر نباشد ترا میہماں

مولوی روم کا شعر ہے،

نے قماش و فقرہ و فرزند و زن

چسیت دنیا از خدا غافل شدن

اس کو یون کیا،

نے قیص و کوٹ و پتلون و بٹن

نیچریت چسیت از دین گم شدن

تا تو نا نے بکفت آری بھفت نخوری

ابر باد و مہ و خورشید و فلک کا رند

اس شعر کو یون کیا،

تا تو پاسے بکفت آری کئی ہند پڑی

کا کچ و ٹیچر و حکام ہمہ درکارند

جدید محاورات | میر صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جدید محاورے جو انگریزی

زبان کے اختلاط سے پیدا ہو گئے ہیں، ہمارے مشرقی شاعر تو ان کا استعمال عارِ کلام سمجھتے

لیکن میر صاحب ان ہی محاورات کو پیرایۂ اشعار میں اس طرح جلوہ دیتے ہیں کہ ہزاروں

مقاطع شاعریوں کو ان پر قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے،

افسوس ہی ہوا نہ میسر سلام تک

بیٹھا رہا میں صبح سو اس در پہ نام تک

جھک بھی رنجِ نیر کا سینہ بھی ریش ہی

ہر اک رہا رگ آکھ کا عطر کا نیش ہی

کہ اکبر فخر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

حریفوں نے پٹ لکھوائی ہی جا جا کے تھائے

جبت تشبیہ استعارات | کلام میں نئی تشبیہیں پیدا کرنا شاعری کی جنت کا شجر ممنوعہ ہے، عرب
میں تشبیہات بالکل مادی اور سادی ہوتی تھی، ایران اگر عربی شاعری باغ و بہار کی
فارسی شاعری جب ہندوستان آئی، تو گو شیراز کا بلبل ہات سے نہ چھوٹا، لیکن قمری اور فاختہ
کی کو کو بھی اب سنائی دینے لگی، اس نئے دورِ مختصرات میں سینکڑوں چیزیں نئی پیدا ہو گئی
ہیں، لیکن ہماری قدیم شاعری کا ذخیرہ تشبیہات اب تک ہی متروکات و اندوختہ سلف
چلا آتا ہے، میر صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے بیسیوں نئی تشبیہیں کلام میں پیدا کر دیں
اور ان سے عجیب و غریب تشبیلی استدلالات پیدا کئے،

زندگی اور قیامت میں یلٹن سمجھو	اس کو کا کج، اور اُسے کا نو وکیشن سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئیگا دل	پیش قلب کو بنگال میں پچھلشن سمجھو
بحر ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے	برف کی طرح جمنے بگنوں پانی کی طرح
میدانِ عمل لیگ کا محدود ہی بیشک	ہاں رقبہ مجلس کی کوئی تاپ نہیں ہے
ہے کو ماہی کو ما، جو پڑھے دہر کا نامہ	جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے
بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہی	قوم ہی کو دیکھے مردہ ہی اور موجود ہی
کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں	اب ہاے ہاے کر رہی ہیں اسپتال میں
دنیا اُسے قرار دو اور آخرت ہے یہ	سن لو کہ سازِ معنی اکبر کی گت ہے یہ

(معارف جلد ۲ نمبر ۲)

اگست ۱۹۱۶ء

اُردو انسائیکلو پیڈیا

ہندوستان کی ترقی کا شور و غل اُس وقت تک صدائے بے اثر ہے جب تک اس میں کوئی جامعیت پیدا نہیں ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں، اور مختلف زبانوں کا گھر ہے، ان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف زبانوں کو افراد کو جماعت، اور مختلف جماعتوں کو ایک قوم بنانا صرف اسی طریقہ سے ممکن ہے کہ ان میں نسلی، یا مذہبی، یا لسانی تباہی پیدا کیا جائے، ہندوستان کی مختلف نسلی جنسیتوں کو ایک کرنے کا خیال ایک بے سود اور ناقابلِ عمل تخیل ہے، تمام ہندوستان کو صرف ایک مذہب کا پیرو بنادینا گو عقلاً ممکن ہے، اور دائرہ عمل کے اندر داخل ہے، لیکن بیرونی مشکلات کی بنا پر ایک وسیع مدت تک یہ تقریباً محال ہے، اس لئے تمام ہندوستان کو اگر ہم ایک متحد قوم بنانا چاہتے ہیں تو صرف زبان ہی کا اشتراک ایک ایسی چیز ہے، جو ان اختلافات کو مٹا کر تمام ہندوستانیوں کو ایک مشترک و متحد ہندوستانی قوم بنا سکتی ہو،

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی سیکڑوں زبانوں میں سے اس عمومیت کا اشتراک کی صلاحیت کس کو حاصل ہے، اور اس صلاحیت و استحقاق کا معیار کیا ہے،

(۱) فطرۃً عینِ عمومیت اور تمام ملک میں چھا جانے کی صلاحیت موجود ہو،

(۲) کسی صوبہ کی خاص زبان نہ ہو بلکہ عموماً وہ ملک کے ہر گوشہ اور ہر حصہ میں بولی اور

سمجھی جاتی ہو،

(۳) اس میں علوم و فنون کا سرمایہ اور ہر قسم کے بلند خیالات کا ذخیرہ ایک ہی جگہ موجود ہو

دو اول الذکر حیثیتوں سے اردو زبان کے ترجیحی تفوق کے پہلو کو کوئی دبا نہیں

سکتا، اردو سے زیادہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں ایک عمومی اور ملکی زبان بننے

کی قابلیت نہیں، ملک کی دوسری زبانیں صرف بھاشا اور سنسکرت کی پیداوار ہیں لیکن

اردو نہ صرف ہندوستان کی تمام زبانوں کا مجموعہ ہے، بلکہ غیر ملکی الفاظ کا بھی اس میں ہے

اس بنا پر ہندوستان کی مختلف الاجز قومیت کے لئے اردو سے زیادہ اس قومیت کی

ترجمان بننے کی کسی اور میں صلاحیت نہیں ہو سکتی، بنگالی زبان، ہندوستان کے تمام دوسرے

صوبوں کے ہندو مسلمان اور ملک کے عام باشندوں کے لئے بالکل بیگانہ ہے، یہی حال

مرہٹی اور گجراتی کا ہے کہ اپنے اپنے صوبوں کے حدود سے جب ان کا قدم باہر نکلیگا تو

ان کا خیر مقدم ملک کے باشندوں کی طرف سے بیگانہ وار ہوگا، برخلاف اردو زبان کے کہ ملک

کی آبادی کا تیسرا اسلامی حصہ، ہر صوبہ اور ہر گوشہ میں اس کو بطور مادری زبان کے بولتا اور

سمجھتا ہے، ملک کی دوسری کثیر التعداد قوم یعنی ہندو بھائی ملک کے بڑے بڑے صوبوں میں

مثلاً پنجاب، دہلی، صوبہ اے متحدہ، بہار اور اسلامی ریاستوں میں مادری زبان کی طرح سکو

بولتے ہیں، بنگال، مدراس، ملیشی، ممالک متوسط اور راجپوتانہ و کشمیر و بڑودہ کی ریاستوں میں

اس کو وہ نہایت آسانی سے سمجھتے ہیں، اور ضرورت کے وقت اسی میں اظہارِ مطلب کی سہولت
 وجوہ بالا کی بنا پر اردو زبان کو اب بھی ملک کی عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہے، اور
 اس دعویٰ کی تردید عملاً ناممکن ہے۔ اور ہندوستان کی مختلف قوموں کا میل جول جس تک
 ترقی کرتا جائیگا، اردو زبان کی ہمہ گیری اور عالمگیری بھی اسی حد تک وسیع ہوتی جائیگی،
 اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے، اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے تمام بھون
 اور گوشوں کے ماہیوں اور قوم کے مائندوں کی ایک عظیم انسان مجلسِ شوریٰ قائم ہے،
 ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ ہم کو کس زبان
 میں مخاطب کرے گا۔ وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے، لیکن کیا پنجابی زبان اس کے
 خیالات کی ترجمانی کرے گی، کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف بولیوں والے مجمع
 کی گرد کشائی کر سکے گی؟ وہ یقیناً صرف اردو ہی زبان ہوگی جو اس عظیم انسان قومی مجمع
 شوریٰ میں مبادلہ خیالات کا ذریعہ بن سکیگی،

اب ایک چیز رہ گئی، یعنی یہ کہ ہماری آئندہ مشترک اور عمومی بننے والی زبان علوم و
 فنون کے لحاظ سے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ دولت مند اور ذی ثروت ہو۔ اور ہر قسم
 کے بلند اور عالی خیالات کی ادار و تعبیر کا سامان اُس میں ہو، موجودہ حالت
 میں اردو زبان، بنگالی و مرہٹی وغیرہ ملک کی دوسری زبانوں سے علانیہ اس معرکہ میں
 بازی نہیں لے جاسکتی، اس لئے ہم کو اردو زبان کی ملکی اور عمومی زبان تسلیم کرانے کے لئے
 اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان میں فراہم کر لیں

جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، سیاسی، تمدنی، اخلاقی، ہر قسم کے علوم و خیالات کی ادار اور تعمیر کی کفالت کر سکے، ایسا مجموعہ جو ان گونا گون علوم و خیالات کا فیل ہو، ایک ایک دو کے دائرہ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کے سوا کچھ اور نہیں،

لیکن یہ اس قدر عظیم الشان، اہم، اور مصارف طلب تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں میں سے کوئی قوم بھی اُس کے لئے باسانی آمادہ نہیں ہو سکتی، اس کی تالیف و طبع و اشاعت کی ضرورت کے لئے ایک شاہی خزانہ اور شہنشاہانہ عہد اور حوصلہ مند یوں کی ضرورت ہے، دنیا میں اس قسم کے کام ہمیشہ امرار، اور سلاطین زمانہ کی زیر پائشوں سے انجام پائے ہیں، آج ہم میں گو بکر ماجیت، سوائی سنگھ، مامون الرشید اور اکبر نہیں لیکن،
فیض روح القدس ارباز مدد فرماید
دیگران نیز کنند انچہ مسیحا می کرد

ہم میں بہت سے ایسے ہمت والے موجود ہیں، جو اپنی وسیع قومی حوصلہ مند یوں، بے پایاں علمی فیاضیوں اور غیر محدود سیاسی انجام بینیوں کے لحاظ سے ہمارے موجودہ دورِ تاریخ کے سب سے بڑے ہیرو ہیں، ان میں کا ہر شخص جو صرف مسلمانوں کے "جامعہ اسلامیہ" کے لئے ایک لاکھ دے سکتا ہے، وہ ہندو مسلمانوں کے متحد "جامعہ لسانیہ" کے لئے دو لاکھ نہیں دے سکتا؟ ہم کو کامل اطمینان ہے کہ ہماری قومی فیاضیوں کا دستِ کرم اس تجویز کی اعانت سے کوتاہ نہیں،

دوسری منحل موافقین اور اربابِ قلم کی ایک کثیر جماعت کے حصول کی ہے لیکن سرمایہ کے امکان کے بعد ہم اس منحل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، ایک دو چھپائیڈٹر

بیشک نہایت لائق درکارین، لیکن اگر شد کہ یہ دولت اس تجویز کو حاصل ہو چکی ہے، ان کے علاوہ ۲۸ متوسط لیاقت کے مترجم اور انگریزی دان انشا پر داز ہم کو چاہئیں جن کے لئے گریجویٹ ہونا ضروری نہیں، صاحب لیاقت ہونا البتہ ضروری ہے، انگریزی کے ساتھ کسی قدر عربی کے واقف کاروں کو ترجیح دیجائے گی، کام بجائے ماہوار تنخواہ کے صفحات کے معاوضہ پر گنا کتابوں کی غیر معمولی مقدار کی بھی ہم کو حاجت نہیں، انگریزی میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، پاپو لرائس انسائیکلو پیڈیا، امریکن انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، عربی میں دائرۃ المعارف، فارسی میں کشف، اصطلاحات الفنون جیسی جامع کتابیں موجود ہیں، اردو کے مشہور علمی رسائل میں اکثر مباحث پر نہایت قابلیت کے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے ممکن الحصول مواد اور ماخذ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کے سامنے ہیں، تحقیق و کاوش نہایت احتیاط کے ساتھ عمل میں آئے گی اور انتشار الشدھیت ڈیڑھون کی قابلیت اور ان کا ذوق تحقیق اس کو پایہ اعتبار و استناد سے گرنے نہ دے گا،

تالیف و ترجمہ کی درخواست بھیجنے والوں کے لئے حسب ذیل امور تحریر ہیں،
(۱) مؤلف و مترجم کے لئے مذہب و ملت کی تخصیص نہیں،

(۲) انگریزی لیاقت مسلم ہو، اردو کا انشا پر داز ہو، فارسی بقدر ضرورت جانتا ہو، کوئی صاحب ان زبانوں کے ساتھ عربی بھی جانتے ہوں، یا علوم و فنون جدیدہ کی کسی شاخ سے واقف ہوں تو ان کو ترجیح دی جائے گی،

(۳) ترجمہ کا نمونہ بھیجنا چاہئے،

(۴) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے صفحہ کو پیش نظر رکھ کر اطلاع دینی چاہئے کہ فی صفحہ وہ کیا زیر معاوضہ قبول فرمائیں گے،

(معارف دسمبر ۱۹۱۶ء)

افسوس کہ یہ تجویز قبل از وقت مر گئی، ہمارے دوست مولوی عبدالمجید صاحب اور مولوی عبدالباقی صاحب اس کے قلمی اور مرحوم عالمگیری صاحب محمود آباد اس کے مالی دست و بازو تھے، ہمارا راجہ صاحب مجرم کا خیال تھا کہ غنقریب ہندوستان میں ایک آزاد حکومت قائم ہوگی، اور اس وقت وہی زبان سرکاری حیثیت حاصل کرے گی، جس کا علمی و ادبی سرمایہ سب سے زیادہ ہو، اس لئے اردو کے علمی سرمایہ کی ترقی کے لئے اردو انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیجائے، اخباروں میں اس تجویز کا اعلان ہوا، سب نے تائید کی، دفعہ سیاسیات کا سرخ ایسا پلٹا کہ ہمارا راجہ صاحب اس کام میں شریک نہ ہو سکے، اور تجویز کے دوسرے ارکان بھی تتر بتر ہو گئے، راجہ صاحب نے اس کے ٹو ایک لاکھ روپیے کا وعدہ کیا تھا،

”س“

زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ

ڈیمانڈ اور سپلائی کا اصول

بخدمت جناب اڈیٹر صاحب "معارف"

جناب من! میں نے اردو لٹریچر کے "نفسِ اسپین" کے عنوان سے حال میں ایک مضمون لکھا تھا جس سے بعض حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ پرستارانِ شبلی کے مقابلہ میں دراصل اس سے انجمن اردو کی تنقید مد نظر تھی لیکن واقعی بات یہ نہیں ہے بلکہ انجمن کو اس کی اہم ذمہ داریوں کے لحاظ سے ٹوکا تھا، یعنی توقعات زیادہ ہوتی ہیں تو فروگزاشت کسی حیثیت سے ہو یا یوس کُن ہوتی ہے،

انجمن جو کچھ کر رہی ہے، میں اسے قوم کی عام بے التفاتی کے لحاظ سے بہت قابلِ ستائش سمجھتا ہوں، اسی طرح مجھ کو دارالاشاعت لکھنؤ سے پوری ہمدردی ہے جو انجمن کے کارناموں کی مقدار کے ساتھ اس کی صفات کو بھی گراں وزن کر رہا ہے، اور گو ایک غیر ذمہ دار جنسِ لطیف نے نظرِ الملاک سے ایک موقع پر کیفیت نہیں بلکہ جواب طلب کیا تھا لیکن یہ بڑی ناشکری ہوگی اگر ترقی اردو کے آلہ محرک (بور) سے ایک منٹ

کے لئے قطع نظر کیا ہے، تاہم بین نہیں مانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قدرتی طور پر ہماری ضروریات کے مطابق ہے،

ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ہر چیز ایک نظام طبعی رکھتی ہے اور اردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اردو، زبان کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہیں رہا، یہاں تک کہ ان لائق ادب افراد نے (جن کے دل و دماغ کے نتائج آج اردو کا بہترین سرمایہ ادب ہیں) منفرد یا متفقہً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون سے کام ہیں جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئے اور دراصل ترقی اردو کے نظام ترکیبی کا اقتضا ہے طبعی کیا ہے،

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ملک میں جہاں تک مختلف اصنافِ سخن کا تعلق ہے، لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے، لیکن کیا یہ انتشارِ عمل کسی قاعدہ کلیہ کی تحت میں ہے، یا ہم اس کی حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہیں؟

میں نے اسی خیال سے پروفیسر براؤن آف کیمبرج کو جو آجکل کے مشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں، اور جنکو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے، لکھکر دریافت کیا، ممدوح کی رائے کے مطابق ہم کو ترقی زبان کے لئے سب سے پہلے تالیفاتِ ذیل مرتب کرنی ہوں گی،

(۲) محاورات ،

(۳) لغات الاصطلاحات ،

(۴) لغات فارسی ، جہانگیر اردو کی تکمیل کا تعلق ہے ،

(۵) لغات عربی ، بہ ترتیب جدید ،

(۶) ادب الاسانہ ، ۱۲ ضخیم جلدوں میں ،

(۷) جامع القواعد اردو ،

(۸) عقلیات ، یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب ،

(۹) اردو انسائیکلو پیڈیا ، جو بظاہر علوم عصریہ ہوگی ،

کسی زبان کو سراہہ دار اور با اصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہے جس سے ہر اؤل کی رائے کے مطابق قطع نظر نہیں ہو سکتی ، ہم کو محض بے غایتہ رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی غصہ مفید بھی ہوں ، صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہیں ہے ، بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کے لئے لازم سے ہیں ، یہ دیکھنا ہے کہ آتش نمایاں سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے ،

اس کے لئے فاضل پروفیسر کی رائے ہے کہ کثرت سے ”صراح ٹریچر“ کی اشاعت کی جائے ، اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اردو ، فارسی ، اور عربی کی لاکھوں جلدیں ”لغات المبتدئین“ کی حیثیت سے مرتب کی جائیں ، اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں ،

میرا خیال ہے کہ پروفیسر براؤن کی یہ اسکیم نسبتاً اس قدر ضروری ہے کہ اس کا ذکر اگر آپ کے
دقیع پرچہ میں نہ آئے تو لڑو پچر کی حق تلفی ہوگی؟

”ایم، ہمدی حسن“

کیشم نالہ خدا سمان نگمدارد

پروفیسر براؤن نے انگلستان میں بیٹھ کر ہندوستان کی ملکی زبان کی نسبت جو کچھ
لکھا ہے اصولاً اس کی تسلیم میں کس کو عذر ہو سکتا ہے، لیکن ذرا ان کو غلط بھی ایک محکوم قوم
کی زبان کے مشکلات سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے، اس زمانہ میں محکوم قوم کی زبان
کی ترقی کا مسئلہ علیٰ حیثیت سے ایسا نہیں ہے کہ صرف ایک دو آدمی یا ایک مجلس کے
طے کر دینے سے طے ہو جائے، وہ زمانہ گزر چکا جب ایک رستم تہا مازندران کے سارے
دیوستان کو فتح کر سکتا تھا، اب اس کے لئے کلدار تو ہیں، لاقعدا و گوئے، بیشمار تربیت یافتہ
فوجین اور غیر محدود سامان چاہئے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آسمان و زمین کے خزانوں
کی کنجیان ہاتھ میں ہوں،

ہم کو تصنیفات کی ضرورت ہو، تصنیفات کے لئے سامانِ طبع کی حاجت، اور سامانِ
طبع کے لئے سرمایہ کی ضرورت، ہم کو مصنفین چاہئیں، لیکن مصنفین کو فراغ چاہئے، اور فراغ تو یہ
سے ہو سکتا ہو، الغرض سب سے اول اور سب سے پہلے مصنفین اور تصنیفات کا سوال نہیں بلکہ
سرمایہ اور روپیہ کا سوال ہے، سرمایہ اور روپیہ کیونکر ہاتھ آ سکتا ہے؟ حکومت سے یا قوم سے

موجودہ نظام حکومت کا طرز عمل ایسی امداد کے لئے آمادہ نہیں، اب صرف قومی خزانہ کی طرف ہمارا ہاتھ بڑھ سکتا ہے، لیکن حالت یہ ہو کہ قوم اپنے خزانہ کا منہ اسی وقت کھول سکتی ہے جب اس کو روزانہ کاروبار اور اپنی عام زندگی کے لئے ہماری ضرورت محسوس ہو، اردو کی ترقی اور تکمیل کے لئے متعدد تجویزیں اب تک پیش ہو چکی ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ اس وقت تک ناقابل عمل ہیں جب تک ملک میں اس کی مانگ اور اس کی قدر وانی کا جذبہ نہ پیدا ہو، بہت سے دوستوں نے نیک نیتی سے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز کی گفت کی، اور سنجیدہ دلیلین پیش کیں، چنانچہ سب سے پہلے روسیہ کا سوال پیش آیا، ہم نے کہا ایک دو صاحبان ہمت نے بھی ہمارا ساتھ دیا تو بس ہو، لکھنے والوں کی نسبت سوال آیا تو ہم نے ملک کے اربابِ علم کے نام گنا دیئے، جن میں سے عملاً اکثر کام کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن جب یہ سوال آیا کہ اس کی کتنی جلدین چھپینگے اور کتنے لوگ اس کی خریداری کو آمادہ ہوں گے، اس وقت ہم نے شائقین کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ مشعل سے ننو دو نو تیسے فروخت ہو سکتے ہیں، سیرۃ نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا ہے، اور ہمارے اجنبی کا بیان ہے کہ ملک نہایت یحینی سے اس کا منتظر ہے، اس وقت تک اس کے دفتر میں خریداروں کے صرف ۳۰۰ نام رجسٹر ہوئے ہیں، پھر اردو کے لئے کوئی کس برتنے پر کسی بڑا کام کی ہمت کرے،

استاذ مرحوم نے شعرِ اعجم جب لکھی تھی تو خیال تھا کہ ہندوستان کو شاعری سے ایک فطری لگاؤ ہے اور خصوصاً فارسی شاعری تو اب تک کاجون میں زندہ ہی، لیکن آپ کو معلوم

کہ اس کے ۵۰ سو نسخے پورے پانچ برس میں کیے۔ انجمن ترقی اردو اپنے مطبوعات کا پستارہ
باندھے تمام ملک کا چکر لگا رہی ہے تاہم اس کی سالانہ روداد میں مطبوعات کی خریداری اور
آمدنی کی قابل افسوس تعداد نظر آتی ہے۔ دارالمصنفین کا بھی یہی حال ہے،

بیں تیس برس میں کیا سے کیا ہو گیا۔ المامون ۸۵۰ء میں پہلی دفعہ چھپی تھی نمونہ
مرحوم فرماتے تھے کہ صرف تین مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا، سرسید کی تصنیفات جو تاہم
عربی سے مانو، عربی عبارتوں اور دقیق اور مشکل بحثوں سے بھری ہوتی تھیں، لوگ برابر
پڑھتے تھے، بات یہ تھی کہ اس زمانہ تک ملک میں انگریزی کا پورا رواج نہ تھا، عربی اور
فارسی زبانیں زندہ تھیں، جدید تعلیم نے دماغوں کو صرف تفریحی مشاغل کا آشیانہ جس طرح
آج بنا رکھا ہے اس وقت تک نہ تھا، اس لئے ایک حالت قائم تھی، انگریزی تعلیم جیسے
پھیلتی گئی، اردو جس کا تانا بانا سارا عربی اور فارسی سے ہے ان کے لئے ناقابل فہم ہوتی گئی
آج ان کے ہاتھ میں اگر تفسیر احمدی یا السطری بعض مسائل الامام الغزالی دیدیکائے تو شاید
اس کی چند سطریں بھی وہ صحیح نہ پڑھ سکیں، حالانکہ سرسید کا طرز تحریر نہایت صاف، سہل
اور سہل ہے،

جدید تعلیم نے ہماری زبان میں جو مایہ ناز افراد پیدا کئے وہ وہی تھے جن کو کم و بیش اپنے
مشرقی علوم پر اطلاع تھی، سید محمود، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، یہ نام ہمارے ملک اور
زبان کے لئے معیارِ فخر ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اپنے مشرقی
علوم میں بھرپور ہیں، ان سے نیچے اگر کوئی مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام شکیلین، مرحوم داماد لہم کے

مغربی فضل و کمال کے چہرہ پر اسی آبِ رنگِ مشرقی علوم و اسنہ کی واقفیت کا تھا، اس وقت بھی جو لوگ موجود ہیں اور جن کو ہم جدید تعلیم کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں وہ مشرقیات کے بے بہرہ نہیں ہیں،

یہ حالت کچھ مسلمانوں کیساتھ مخصوص نہیں ہندوؤں کا بھی یہی حال ہے، کن کے ہندوؤں میں تعلیم کے نظم و قابلِ عظمت اشخاص پیدا کئے ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو سنسکرت سے بے بہرہ ہو جس راٹاؤ سے، مٹرگو کھلے، ڈاکٹر بھنڈارکر، مٹرملک، مشرق و مغرب کے پیوند نے ان کے نخلِ کمال کو بار آور کیا ہے، بنگالیوں کا بھی یہی حال ہے، اور یہی ان کی ملکی زبان کی ترقی کا راز ہے، البتہ ہمارے صوبہ میں ہندو نوجوانوں کی حالت مسلمان نوجوانوں سے ممتاز نہیں ہے،

ہمارے ہاں بد قسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خوان دوست اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا حرم سمجھتے ہیں، ترجمہ کے لئے انگریزی کی دو سطرین دیجئے تو یہ کہہ کر مغرورانہ انداز سے کاغذ میز پر رکھ دینگے کہ بڑی مشکل ہے کہ اس کے لئے اردو میں الفاظ نہیں۔ اردو میں الفاظ نہیں یا آپ کی نظر میں وسعت نہیں، اصل یہ ہے کہ کچھ تو اس تعلیم کا یہ اثر ہے کہ غور و فکر، وقت بینی اور نکتہ رسی کی قوت نوجوانوں سے مفقود ہو جاتی ہے اور اس لئے علمی دجسپی اور مذاقِ سلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں، اور زیادہ تر یہ ہے کہ ایک مدت تک اجنبی زبان اور بیگانہ خیالات پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے اپنی مادری زبان سے قدرۃً ان کو بُرد ہو جاتا ہے، اور چارہ چلے بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر نہیں لکھ سکتے، بلکہ اپنی مادری زبان سے ان کو ایک گونہ نفرت سی ہے، اور اس میں

لکھنا پڑھنا اپنے لئے عار سمجھتے ہیں، جب تک یہ حالت قائم ہے، زبان کی ترقی کی کوشش بسوچنا
 لکھنے کے تاریخی افسانے اور دلی کے مذہبی چٹکے ممکن ہے کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے
 ہوں لیکن مستند ترین اور صالح ٹریڈر کی ناگ ملک میں مطلق نہیں ہے، اس لئے وہ پیدا نہیں
 ہو سکتا، قدرت صرف اسی چیز کو پیدا کرتی ہے جس کی طلب اور تلاش ہو، اگر مصنوعی طریقہ
 سے ایسی چیزیں پیدا بھی ہوتی تو زندہ نہ رہ سکتی، چنانچہ کلکتہ کے اردو کالج (سنہ ۱۸۷۷ء) سے جو
 کتابیں نکلیں، چند کمیونیوں کو چھوڑ کر جن کا نام شاید آپ نے سنا ہو اسکی کسی علمی اور مفید تصنیف
 کا نام آتی ہے سنا ہے؟ حالانکہ اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد کی کتاب صرف اردو میں
 لکھی گئی، اردو سوسائٹی دلی (سنہ ۱۸۷۷ء) کی تصنیفات آپ کی نظر سے گذری ہیں، حالانکہ
 علم الاقتصاد (پولٹیکل اکنامی) کی پہلی کتاب اسی سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے،
 اردو سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا نام سرسید کے تعلق سے زبانوں پر آتا ہو، لیکن اس کی
 چالیس مفید مطبوعات علمی کے نام آپ کو معلوم ہیں، اور آپ کے کتب خانہ میں اس کا سلسلہ موجود
 ہے، حالانکہ زراعت اور علم البرق اور دیگر علوم طبعی و تاریخی کے جدید الضرب سکے پہلے
 اسی ٹکسال میں ڈھلے، انجمن پنجاب تو آپ کے ہوش میں قائم ہوئی ہوگی، سنہ ۱۸۷۷ء میں
 جدید علم النفس پر اردو میں سب سے پہلے وہیں سے ایک مستقل تصنیف ترجمہ ہو کر شائع
 ہوئی، آپ جانتے ہیں،

اس وقت ملک میں جو اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں، ان کے خریداروں کا
 لیجئے، تو معلوم ہو جائے کہ ان میں انگریزی تعلیم یافتوں کا کتنا کم عنصر شامل ہے، اور پھر سہارا

مغزوہ صوبہ تو اس دوڑ میں سب سے پیچھے ہے۔ تعجب ہو گا کہ تقریباً ہندوستان کے ہر اردو اخبار اور رسالہ کی خریداری وہاں زیادہ نہیں ہے جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے، بلکہ وہاں ہے جہاں ابھی لوگ اس کو سمجھ رہے ہیں، زیادہ تر خریدار کمان سے ہاتھ آئیں گے، مسوطہ مدراس، حیدرآباد، بکرات، سندھ اور زنگون وغیرہ سے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان ممالک کے مسلمانوں میں اب تک انگریزی تعلیم عام نہیں ہوئی ہے، اور ابھی تک علم و اطلاع کا ذریعہ وہاں اردو ہی ہے،

مصر میں ہندوستان سے عام تعلیم نسبت کم ہے، لیکن چونکہ تعلیم کی زبان عربی ہے، اس لئے وہاں جدید عربی ٹرچر ہمارے ہاں سے زیادہ وسیع اور بہتر پیدا ہو گیا، حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہاں چند روز میں اردو زبان علمی تصنیفات سے مالا مال ہو جائیگی، چنانچہ ابھی سے وہاں ایسے صیغے قائم ہو رہے ہیں جو انگریزی خیالات اور مغربی علوم کو اپنی زبان میں منتقل کر سکیں، اور اردو ذریعہ تعلیم ہونے کے باعث یہ کتابیں تمام ملک میں پھیل جائیگی، اس کا قیاس صرف ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں شہر اعجم جس کی نسبت میں نے پہلے کہا ہے کہ اس کے ۵۰۰۰۰ پنچ ہی برس میں نکلے، دو برس سے اس کی کچھ جلدیں لاہور کے مشرقی صیغہ نے اپنے نصاب میں داخل کر لی ہیں، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شہر اعجم کا ایک ایک نسخہ اشرفی کے مول بک رہا ہے، اور اس کے طبع نانی کا جگہ جگہ انتظام ہو رہا ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کی بیسیوں تاریخی اور مذہبی کتابیں گھر گھر پھیلی ہیں، اور ہمیشہ لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں، لیکن ہم عرض کرینگے کہ یہ علم پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ ہماری شہرت

اور مذہب پرستی کا نتیجہ ہے،

نہیں در دائرہ یک نقطہ خلاف انکم پیش
کہ من این سلسلہ بے چون و چرا می بنم
پروفیسر براؤن نے ہماری زبان کی ترقی کے لئے جو خاک تیار کیا ہے اس میں لغات
و محاورات اردو کی جگہ سب سے پہلے ہے، اولاً اسی پر غور کیجئے ابتداً جب اہل یورپ نے
آئے تو ان کو اردو دیکھنے کی ضرورت پیش آئی، اس لئے اردو کے قواعد و محاورات پر
سی کتابیں لکھی گئیں، گورنمنٹ نے ابتدائی بچوں میں اردو کو داخل کیا، اس کی بدولت
ہر سال قواعد اردو کے متعدد رسالے پیدا ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ ان کثیر التعداد رسالوں
کو چھوڑ کر جو اہل یورپ نے اپنی ضرورت سے مختلف زبانوں میں لکھے، نیز ان بیسیوں کتابوں
سے قطع نظر کر کے جو اسکول کے بچوں کے لئے لکھی گئیں، قواعد کی حسبِ ذیل کتابیں ہماری
زبان میں موجود ہیں،

(۱) تحریف اردو، شیدا، ۱۸۸۱ء	(۵) رسالہ صرف و نحو، مولوی احمد حسن ۱۸۵۹ء
(۲) دریائے لطافت، سید انشار ۱۸۰۲ء	الہ آبادی،
(۳) رسالہ صرف و نحو، مولوی جھٹا علی ہلوی ۱۸۴۵ء	(۶) رسالہ صرف و نحو، سید خندان ہلوی ۱۸۶۱ء
(۴) " " مولوی صہبائی دیو ۱۸۴۹ء	(۷) قواعد و صرف و نحو، مولوی سید علی بیگ سہیل اگر کاٹھ، ۱۸۶۱ء

اس کے بعد اردو زبان کی طرف سے انگریزوں کو بے اعتنائی ہوئی، اردو فقہ اس کی
ترقی رک گئی، پھر اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہ ہوئی، جب تک انجمن ترقی اردو
کا وجود نہ ہوا، انجمن کی کوشش سے قواعد اردو پر دو نہایت عمدہ کتابیں تالیف پائیں،

- (۱) مصباح القواعد منشی فتح محمد صاحب، جالندھری، ۱۹۰۴ء
- (۲) قواعد اردو مولوی عبدالحق صاحب، ۱۹۱۴ء
- مصباح القواعد میں جزئیات کے استقصا کا خیال زیادہ کیا گیا ہے، اور قواعد اردو میں اصول کلیہ بنانے اور تحقیق و تلاش کا پہلو زیادہ مد نظر ہے،
- محاورات اور لغات کو لیجئے، ان کا بھی یہی حال ہے،
- شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان، مرزا خان پیش، ۱۲۸۳ء
- دریائے لطافت، سید انصار، ۱۲۶۲ء
- کلید سخن، سید محمد حسین، ۱۸۰۲ء
- خزائن الامثال، شمس الدین فیض، ۱۲۸۲ء
- فرہنگ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، ۱۸۸۱ء
- دستور الشعراء، خواجہ محمد اشرف لکھنوی، ۱۸۸۹ء
- مخزن الاسرار، نیاز علی بیگ، ۱۲۸۳ء
- رسالہ زبانتدانی، چرونجی لال، ۱۸۸۴ء
- مخزن المحاورات، منشی رجولال، ۱۸۹۸ء
- محاورات اردو، مجھو بیگ عاشق لکھنوی، ۱۸۰۰ء
- گنجینہ زبان اردو، جلال لکھنوی، ۱۲۹۴ء
- سرمایہ زبان اردو، " ۱۳۰۴ء

امیر اللغات، امیر لکھنوی، (ناقص) ۱۸۹۱ء

مصطلحات اردو، خواجہ محمد شرف لکھنوی، ۱۸۹۰ء

لغات ہندی، (قلمی موجودہ ندوہ) ۱۲۲۳ھ

لغات فیروزی، (طلباء مدارس کیلئے) فیروز الدین، ۱۹۰۴ء

فرہنگ اردو، (طلباء مکاتب کیلئے) حمایت اسلام لاہور، ۱۹۰۴ء

دوسیکر، (تذکرہ و تائینٹ) ظہیر الدین خان، ۱۹۰۲ء

رسالہ تذکرہ و تائینٹ، مولوی شہید الدین صاحب، بنارس، ۱۹۰۲ء

تذکرہ و تائینٹ، حافظ جلیل حق صاحب، بانکپوری، ۱۳۲۶ھ

فرہنگ اصغیر ہماری زبان کا سب سے بڑا لغت ہے، لیکن وہ ایک انگریز ذہین صاحب کی تحریک کا نتیجہ اور حیدر آباد کی علمی قدر دان کی کا پر تو ہے، امیر اللغات اس سے بہتر لکھی جانے والی تھی، لیکن وہ ناقدر دان رئیسوں کے ہاتھوں میں بھنسی ہی،

اگر ترتیب جدید کا سوال چھوڑ دیجئے تو عربی و فارسی کے لغات بھی اردو میں موجود ہیں، کئی زبانوں کے مشترک ضخیم لغت بھی لکھے گئے ہیں، ڈیکل اور قانونی دکنٹری بھی اردو میں موجود ہے، جدید علوم و فنون پر اردو میں اس کی بیچارگی اور کس پرسی پر نظر رکھ کر کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں، تقریباً ہر فن پر دو ایک کتابیں اردو میں موجود ہیں، لیکن وہ گمنامی کے پردہ میں چھپ کر رہ گئی ہیں، ہم نے ان میں سے کچھ کتابوں کی فہرست اسلامی ہندوستان کے عہد آخر میں دی تھی، بقیہ کتابیں جو غدر کے بعد لکھی گئی ہیں، ان کی فہرست بھی زیر نظر

وتلاش ہے،

اس تمام یا وہ کوئی اور دراز نفسی سے مقصود یہ ہے کہ اردو زبان کی حقیقی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک حکومت اپنے نظام تعلیمی میں تیز نہ کرے، یا ہم اپنی مادری زبان کی پرستش کی وہ مثال نہ پیش کریں جو سرزمین بنگالہ کے جادوگر اور عمال اسٹر کے سورا اپنی اپنی زبانوں کے متعلق پیش کر رہے ہیں،

اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں تو پروفیسر براؤن کے اس حکم کی ہم کیونکر تعمیل کر سکتے ہیں کہ اردو فارسی، اور عربی کی لاکھوں جلدیں لغات المبتدی کی حیثیت سے مرتب کی جائیں اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں،

(معارف ستمبر ۱۹۱۷ء)



ہوم رول پسے!

ہوم لینگویج (ملکی زبان)

ہندوستان میں آجکل سیاسی خیالات میں جو مد و جزر نمودار ہو رہا ہے، اس سے توقعات کے کشت زار میں نئی آنکھیں پیدا ہو گئی ہیں، گو مسلمانوں کو ایک عرصہ دراز تک براہِ وطن کے سیاسی خیالات سے ہمدردی نہیں رہی لیکن اب واقعات کی روباہل بدل گئی ہے، اب یہ خیال ہے کہ سیاسیات کی سطح میں جنبش تو پیدا ہو رہی ہے، جب دیا اپنی اصلی رو پر آئیگا تو اپنی رو کا رخ ہر طرف پھیلے گا،

ان ہی مباحث میں سب سے اول زبان کا مسئلہ ہے، اور ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ہوم رول سے بہت پہلے حل ہونے کے لائق ہے، افسوس ہوتا ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ یہ سیاسی خیالات بیگانہ زبان کی محض ترجمانی ہے، یہ خلاق عالم کی مخلوق زبان کی آواز نہیں ہے، بلکہ امریکن آڈین کی مصنوعی زبان کی آواز ہے، دسمبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی تقریب سے جو مضمون ہم نے لکھا تھا، اس کی تمہید میں عرض کیا تھا،

”اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے

تمام صوبوں اور گوشوں سے نائبان ملک اور نمائندگان اقوام کی ایک عظیم الشان مجلس
شورعی قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ جو
کہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے برز رہا ہے، لیکن کیا
پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی کرے گی؟ کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف
السان مجمع کی گروہ کشائی کر سکیگی؟

اس لئے ہوم رول کے تخیل سے پہلے در نہ کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لنگویج کا فیصلہ
کر لینا چاہئے، ہمارے برادران وطن اس خیال سے غافل نہیں ہیں، اور اس مشکل پر ان کی
نظر ہم سے پہلے پینچ چکی ہے، جولائی ۱۹۱۷ء کے اخباروں میں مسٹر گاندھی کا وہ عاقل
مضمون شائع ہو چکا ہے، جس میں انھوں نے ہندی نام ایک عتقا صفت زبان کو ہندو
کی عمومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک کی ہے، اور دسمبر ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ میں اس
کا اجلاس ہو چکا ہے جس کا مقصد ہندوستان میں ایک زبان اور ایک خط جاری کرنا
ہے، اور اس سے ان کی مراد ہندی ہے،

۱۰۔ اگست ۱۹۱۷ء کی یوپی اسپیشل کانگریس کے پلیٹ فارم پر رفاه عام کلب کے وسیع
ہال میں الہ آباد کے مشہور لیڈر سے جب انگریزی میں تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی تو اس
”آپ لوگ ہوم رول چاہتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ انگریزی میں بولو، کیا ہوم رول
ملنے پر کوئی انگریزی میں بولا کرے گا، اگر ہوم رول کے بعد بھی آپ انگریزی میں بولا
کرینگے، تو ہوم رول کچھ فائدہ کی چیز نہ ہوگی، اگر آپ کے پاس ایسی زبان نہیں جس میں

اپنی ضرورت کی باتوں کو کہہ سکیں، تو ہوم رول کی آپ کو کچھ ضرورت نہیں ہو:

اس روح کا سب سے بڑا منظر مشرک اندھی کی اس تجویز میں ہے کہ اس سال آل انڈیا کانگریس کے صدر مجلس کی تقریر اردو ہندی یا ہندوستانی میں ہو، اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو مسلم لیگ کے لوگ بلکہ سب سے زیادہ آل انڈیا کانگریس کا نفرنس کے لئے ایک تازیانہ ہوگا، جہاں صدر مجلس کی اردو بولنا انتہائی تحقیر ہے، ہمارے نوجوان انگریزی خوان معترض ہیں کہ جمعہ اور عیدین کا عربی میں ہونا بالکل بے فائدہ ہے کہ خطبہ سے مقصود نصیحت ہے، اور وہ اس زبان میں ہونا چاہئے جس کو حاضرین مسجد سمجھتے ہوں، شاید ہماری قومیں مجلسین جو جامع مسجدوں کا اگر حکم نہیں رکھتیں تو عید گاہوں کا حکم ان پر ضرور عائد کرنا چاہئے کہ زرق برق کپڑوں کی سالانہ نمائش گاہ وہ بھی ہے، ان قومی عید گاہوں میں انگریزی تقریریں مساجد کے عربی خطیبوں سے کہیں زیادہ بے سود اور کہیں زیادہ بے فائدہ ہیں،

اصل یہ ہے کہ ہندوستان جس مرض کا بیمار ہے اس کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ ملکی زبان میں تعلیم ہے، جب تک اس نسخہ کی آزمائش نہ ہوگی ہماری مشکلات کا خاتمہ نہ ہوگا ہماری تعلیمی ترقی کا سب سے صحیح راستہ وہی تھا جو سائنٹفک سوسائٹی کی روشنی میں سرسید کو ۱۹۶۳ء میں نظر آیا تھا، اور جس پر ایک مدت تک وہ قدم زن بھی رہے، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے، اچانچہ اس سوسائٹی کے ذریعہ سے چالیس کتاتین اردو زبان میں لکھی اور چھاپی گئیں، ۳۰ ہزار کی لاگت سے علی گڑھ میں اس کے لئے عمارت بنی، اور چند ہی دنوں میں اس نے ملک اور حکومت دونوں

مین اقتدار پیدا کر لیا، وزیر ہند نے اس کی سرپرستی قبول کر لی،

اسی سوسائٹی سے ۱۸۶۶ء کو بٹش انڈین ایسوسی ایشن پیدا ہوئی، جس نے

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو دوسرے کی خدمت میں حسب ذیل عرضداشت پیش کی،

(۱) اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سرشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون

کی تعلیم دیسی زبان میں ہو کرے،

(۲) دیسی زبانوں میں ان ہی مضمونوں کا سالانہ امتحان ہو کرے جن میں کہ طلبہ

کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں،

(۳) جو سیدین انگریزی خوان طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں معاوضہ تحصیل لینا

عطا ہوتی ہیں، وہی سیدین ان طلبہ کو عطا ہو کرین جو ان ہی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں،

(۴) یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں

ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو،

یہ اصلی نظام کار تھا جس پر اہل ملک کو کام کرنا چاہئے تھا، ایسوسی ایشن کی اس تجویز

کو گورنمنٹ نے بھی نظر قبول سے دیکھا، لیکن پھر خدا جانے وہ کونسا جادو تھا جس نے ستر

کے خیال کو مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا، اور ۱۸۶۷ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم

کا مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے نہایت دلیری سے اس کے خلاف گواہی دی اور وہ مدرسہ علوم

مسلمانانہ جس کا مقصد ایک مشرقی یونیورسٹی کا قیام تھا، ایک خالص انگریزی کے کالج

بمعدل ہو گیا، اب گو مسلم یونیورسٹی کا تخیل سامنے ہے، تاہم سفر کا رخ چشمہ حیوان کی طرف نہیں بلکہ ظلمات کی سمت ہے۔

پچاس برس کے بعد مردہ ہڈیوں میں پھر جان آئی، یعنی گورنمنٹ کے سامنے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی، گسٹ سائے کی بیج کی تار بخون میں بہاؤ شملہ اس غرض سے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، ہنر کلسنی و ایسراے نے اس میں اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر فرمائے،

آپ کو زیر بحث مسئلہ پر صرف تعلیمی نقطہ نظر سے بحث کرنی چاہئے، یعنی انگریزی تعلیم کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے؟ تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہو یا دیسی زبانیں ہوں، اور انگریزی لازمی زبان ثانوی کے طور پر سکھائی جائے، یہ امر اب خارج از بحث ہے کہ ہم اپنے طریقہ تعلیم کے مسئلہ طرز کو بالکل بدل ڈالیں،

تعلیم یافتہ جماعتوں کے فوائد انگریزی تعلیم کی سطح پر قائم ہیں جو اب تمام ہندوستان کی قومی زبان ہو گئی ہے، اگرچہ مجھے ان اصحاب کیساتھ دلی ہمدردی ہے، جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کئے جانے کے شاک میں ہیں، لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا علی پالیٹکس سے باہر ہے، اس مسئلہ میں سب سے بڑی وقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے، جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک پیش نہیں کیا گیا،

ہنر کلسنی ہم کو اپنے جائز حق سے محروم نہیں کرتے بلکہ مختلف دیسی زبانوں کے تصادم کا علاج پوچھتے ہیں، ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج اردو زبان ہے، جسکی علامہ گری اور

عمومیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور اگر دیگر ملکی فرقوں کو اس فیصلہ سے اتفاق نہیں تو کانگریس و مسلم لیگ کے بیسیوں مختلف العقائد مذاہب سیاسیہ کا حل ایک مخصوص مشترک جلسہ سے کیا جا چکا ہو، زبان کی اہمیت کا مسئلہ اس قدر پست نہیں ہو کہ اسکی خاطر کوئی مشترک فیصلہ کن اجلاس انعقاد نہ پاسکے، اردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اٹھاتے ہیں وہ درحقیقت زبان کے فلسفہ سے بیگانہ ہیں، زبان کے خطا کے لحاظ سے تو یہ سوال ہو سکتا ہو کہ ہندوستان کی زبان کس خط میں لکھی جائے لیکن اس سوال کو صوبوں کے رواج پر چھوڑ دینا چاہئے، رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مسٹ جائینگے، ہم کو اصل زبان کے ذخیرہ الفاظ پر غور کرنا چاہئے،

زبان میں تین چیزیں ہوتی ہیں، آتم فعل اور حرف، زبان کی اصل ماہیت فعل اور حرف ہیں، آتم دوسری زبانوں سے آئے بہتر ہیں اور مٹتے جاتے ہیں، اور بدلتے جاتے ہیں، عربی زبان میں سیکڑوں لفظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں، فارسی میں ہزاروں عربی الفاظ مستعمل ہیں، انگریزی میں لاتعداد یونانی اور لیٹن لفظ ہیں، تاہم ان کو عربی اور فارسی اور انگریزی ہی کہیں گے، اسی طریقہ سے اگر ہماری اردو میں آدھے فارسی اور عربی اسماء مل گئے ہیں تو اس سے وہ ہندی ہونے سے خارج نہیں ہو سکتی، جبکہ اس کے سارے افعال سارے حروف اور آدھے اسماء بھاشا اور ہندی ہیں، یہ سچ ہو کہ ہندو مسلمانوں کی قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی مسٹ نہیں سکتیں ان کا خزانہ عاریت تو اور قومیت کی ضروریات کے اختلاف سے عربی و فارسی و سنسکرت ہی رہیگا، اور اس میں کچھ ترجیح نہیں، مگر مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قطبی ہیں، اور مسلمانوں کی عربی، پھر بھی وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں،

انڈیا آف لائبریری

مین

اُردو کا خزانہ

اس وقت مین محارف کے ناظرین سے سات ہزار اسیل دور ہون، بار بار جرجی چاہا کہ اس عجائبستانِ عام سے ان کے لائق کوئی تحفہ بھیجوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ۲۶ فروری سے یعنی جس دن سے ہمارا وفد انگلستان کے ساحل پر اترا، آج ۲۷ اپریل تک شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا جو آمد و رفت اور ملاقات سے خالی ہو، لندن چھوڑ کر کبھی پرس اور کبھی اور کھین جانا پڑتا ہے، اور اب انگلستان کے دوسرے شہروں کا دورہ شروع ہوتا ہے، کل رات کو اوڈنبرا، وہاں سے منچسٹر، ۳ مئی کو کیمبرج اور واپسی کے بعدہ روپورٹن، ایک چکر جو مری پائون مین زنجیر نہیں

گو میری مصروفیت وفد کے دوسرے ارکان، محترم محمد علی وسید حسین صاحب سے بہت کم ہے، پھر بھی اتنی کہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا، جس کی معافی چاہتا ہوں، اس دوران مین اُس ایوانِ حکومت مین جس کا نام انڈیا آفش ہے، تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا

اس عمارت میں جہان سیکڑوں حقیقی و مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک نہایت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع ہے، اور ہندوستان کی علمی تاریخ کا مرقع ہے، ایک گول ریڈنگ روم (مطالعہ کا کمرہ) اس کے ایک پہلو میں کتب خانہ ہے، دوسرے پہلو میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جو کتب خانہ کے مہتممون کے دفتر ہیں، مسٹر اسٹوری جو پہلے علی گڑھ کالج میں عربی پروفیسر تھے، وہ یہاں اسٹنٹ لائبریرین ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ جو کسی زمانہ میں علی گڑھ کے گذشتہ علمی دور کے ایک ممبر تھے وہ گو لائبریری سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن انڈیا آفس سے متعلق ہیں، میں ان دونوں بزرگوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے لائبریری کے دیکھنے میں ہر طرح مدد دی،

اس لائبریری میں عربی فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، ہندی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، عربی اور فارسی کی بعض نادر قلمی کتابیں نظر سے گذرین، قطعات کا ایک نادر مجموعہ یہاں دیکھا جو کبھی ممتاز محل کی بیگم کی ملک تھا، یہ وہی ممتاز محل ہیں جو شاہجہان کی جیتی بیوی تھیں اور جن کے غیر فانی نام کو تاج محل ہمیشہ زندہ رکھیں گے،

تصویروں کا ایک موقع مجھے دکھایا گیا جو داراشکوہ کی ملکیت میں تھا، اس میں شہزاد کے مختلف عہد کی، بچپن، تعلیم، جوانی کی تصویریں ہیں، کوئی خطا میں لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جو نہایت عتیق نسخہ تھا، یہ نسخہ قدیم عربی خط کے مطابق زیر و زبر اور نقطوں سے خالی ہے، مجھے ہندوستان میں تاریخ شیرشاہی کی تلاش تھی، یہاں اس کے متعدد نسخے دیکھے مگر افسوس کہ کتاب کی نوعیت کی نسبت جو ذہن میں خیال تھا وہ صحیح نہیں نکلا،

اس وقت سرسری طور سے مین کتب خانہ کی اردو کتابوں کے ذخیرہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں
 انڈیا آفس لائبریری تقریباً اسی وقت قائم ہے جبکہ اردو نے اپنی ترقی کا آغاز کیا ہو
 اور اگلے انگریزوں کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی تھی
 اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اردو کی قدیم ترین کتابیں جو ہندوستان
 میں ناپید ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ایک جلد میں
 جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے چھپی ہوئی، اس فہرست کو بلوم ہارٹ صاحب (H. Bloch)
 نے مرتب کیا ہے، یہ اردو کے فاضل ہیں اور کسی زمانہ میں ہندوستان بھی رہ چکے
 ہیں، قلمی کتابوں کی فہرست بھی ان کے زیر تحریر ہے، مٹراسٹوری نے اس کا مسودہ خالص
 طور سے منگو کر دکھایا، مگر چونکہ بلوم ہارٹ صاحب خود موجود نہ تھے، اس لئے ان کے
 بلا اجازت اس مسودہ سے فائدہ نہ اٹھاسکا،

بہر حال مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی
 اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی پا چکی ہو،
 کہ تین سو صفحوں میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست سن ۱۹۰۷ء میں چھپی ہے،
 اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر تعجب
 ہو کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ
 نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا
 لطف لگتا ہے اردو کتابوں کے ذخیرہ کے متعلق یہ پہلی اطلاع ہندوستان میں شائع ہوئی، "اس"

ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دُنیا میں موجود تھا،

بہر حال اردو کتابوں کی یہ فہرست، جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، چھ عنوانوں پر مبنی ہے، علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب علمی، الہیات، متفرقات، ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل قیمتات ہیں،

۱۔ علوم و فنون

۱	زراعت و نباتات،	۱۰	قانون
۲	صنعت و حرفت،	۱۱	انگریزی قانون،
۳	ہیئت و نجوم،	۱۲	ہندو قانون،
۴	علم الطبخ،	۱۳	اسلامی قانون،
۵	نیزگ و طلسمات،	۱۴	منطق و فلسفہ،
۶	علم المنزل و قواعدِ صحت،	۱۵	طب و تشریح،
۷	نقشہ کشی،	۱۶	علم الحرب،
۸	اخلاق،	۱۷	موسیقی،
۹	ورزش و سپہگرمی،	۱۸	نعت،

۱۹	علم السنہ	۲۲	علم المعانی والبیان
۲۰	طبیعیات	۲۳	اجتماعیات
۲۱	معاشیات	۲۴	طب حیوانات (بیطاری)

۲- تاریخ و جغرافیہ

۱	عام سوانحریان	۶	جغرافیہ و تقویم البلدان (اپوگرانی)
۲	سوانح محمد صلعم	۷	عام تاریخ
۳	سوانح ائمہ کرام	۸	مقامی تاریخ
۴	حالات قبائل و فرق	۹	سفرنامہ
۵	علم الانساب		

۳- ادبیات

۱	دواوین	۶	عام شاعری
۲	ڈراما	۷	تذکرہ شعراء
۳	خطوط و مکاتیب	۸	نذہبی شاعری
۴	انتقادات ادبیہ	۹	نذہبی ہندو شاعری
۵	شاعری	۱۰	نذہبی اسلامی شاعری

۱۱	محاورات و امثال،	۱۳	قصص منظومہ،
۱۲	قصص و افسانہ،	۱۴	قصص مشورہ

۴۔ تعلیمی کتابیں

۱	قواعد،	۱۱	علم جبر و مقابلہ،
۲	قواعد عربی،	۱۲	علم الحساب،
۳	قواعد برگنا (پشتو)	۱۳	علم حساب الکلیات و الجزئیات،
۴	قواعد انگریزی،	۱۴	اقیڈس،
۵	قواعد ہندی،	۱۵	علم المساحہ،
۶	قواعد ہندوستانی (اردو)	۱۶	علم وزن و پیمائش،
۷	قواعد کشمیری،	۱۷	علم المخروطات والاشکال،
۸	قواعد فارسی،	۱۸	علم المثبات،
۹	علم الخط،	۱۹	ابتدائی تعلیمی کتابیں، (ریڈرس)
۱۰	ریاضیات،	۲۰	انتخابات،

۵۔ الہیات

۱	برہمنی اور لامذہبی،	۲	عیسائی
۲	بودھی،	۴	بائبل،

۵	بائبل لٹریچر	۱۲	جینی مذہب،
۶	تاریخ کلیسا،	۱۳	اسلام،
۷	تعلیمات،	۱۴	عبادات،
۸	ادعیمہ و مزامیر،	۱۵	عقائد،
۹	قصص،	۱۶	قرانیات،
۱۰	مناظرہ و موازنہ ادیان،	۱۷	حدیث،
۱۱	ہندو مذہب،	۱۸	سکھ مذہب،

۶۔ متفرقات

۱	تعلیمات،	۴	مجموعہ ہائے تقریریں مضامین،
۲	تعلیم النسوان،	۵	رسائل موقت الشیوع،
۳	تعلیم الصبیان،	۶	روداد مجالس،

ذیل میں ان چھ عنوانوں میں سے چند کتابوں کے نام، مصنف کے نام اور تاریخ طبع اور مقام طبع لکھے جاتے ہیں، اس انتخاب میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں جو غدر سے پہلے یا اس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں، قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، کہ ہر شخص جانتا ہے، کہ اردو میں ان کا بڑا ذخیرہ ہے، صرف علمی کتابیں لی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس تیزی سے اردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی، جب تک وہ سارے

ملک کی متحد زبان تھی، اور اتفاق قومی سے نا آشنا تھی،

فن زراعت

- ۱ چائے لگانے کی کتاب، ۱۷ صفحہ، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء،
- ۲ گنگا کی نہریں ترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی صفحہ ۲۴، ۱۸۵۴ء، مطبوعہ آگرہ،
- ۳ کھیت کرم، مصنفہ کالی رائے، تین حصے، دہلی، ۱۸۴۶ء و ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء،
- ۴ پنڈ نامہ کاشتکاری، مصنفہ موتی لال، آگرہ، ۱۸۵۲ء،
- ۵ علم الفلاحہ، رابرٹ اسکاٹ برن صفحہ ۲۵۲، علی گڑھ ۱۸۶۵ء،
- ۶ علم الفلاحہ، میجر کاربرٹ، الہ آباد ۱۸۶۹ء،
- ۷ ریشم کا کیرا، موتی لال، لاہور، ۱۸۵۳ء،
- ۸ تجربہ بلخ، غلام نبی، میرٹھ، ۱۸۶۵ء،
- ۹ توصیف زراعت، کلب حسین خان، آگرہ، ۱۸۴۴ء،

سائنسک کتابیں

- ۱ بحر الحکمت، (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن، ۱۸۴۷ء، لکھنؤ،
- ۲ بخار کی کل، " ایشوری لال، ۱۸۵۵ء، بنارس،
- ۳ نور النواظر، احمد علی، کانپور ۱۸۵۴ء،

- ۴ علم تعمیر، کالی پرستا اور سید علی، ۱۸۷۳ء پٹنہ،
 ۵ قانون انطباع، (چھاپہ) سیٹل سنگھ دہلی ۱۸۴۸ء،

نجوم و ہیئت کی کتابیں

- ۱ خلاصہ نظام آسمانی، ہندت واسمی و ہیرا، اگرہ، ۱۸۵۲ء،
 ۲ منباج الافلاک، عبدالسلام، کلکتہ، ۱۸۳۳ء صفحہ ۲۷۲،
 ۳ نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ ۱۸۳۶ء،
 ۴ مختصر احوال نظام آسمانی، ۱۸۴۸ء، اگرہ،
 ۵ مختصر وقایع النجوم، بڑے صاحب گھٹاے، مدراس ۱۸۴۸ء،
 ۶ اصول علم ہیئت، رام چندر، دہلی ۱۸۴۸ء، صفحہ ۳۲۵،
 ۷ علم ہیئت، مترجمہ ٹھٹٹ میلس، لکھنؤ، ۱۸۳۲ء،

جغرافیہ

- ۱ ترجمہ مراصد الاطلاع، (عربی) درار دو، عبدالمومن ۶۲-۱۸۶۱ء پورٹ بلیر، علیہ
 ۲ فتح گدہ نامہ، (احوال ضلع فتح گدہ) کالی راس، دہلی ۱۸۴۹ء صفحہ ۲۰۴،
 ۳ علم جغرافیہ، مترجمہ میر غلام علی، کلکتہ ۱۸۵۱ء صفحہ ۲۲۰،
 ۴ جغرافیہ عالم، دہلی، ۱۸۵۳ء صفحہ ۱۰۹،

۵	خلاصہ علم الارض، (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۲۲ء،
۶	خلاصہ الجغرافیہ، آگرہ، ۱۸۵۴ء،
۷	مرآۃ الاقالیم، کلکتہ، ۱۸۳۶ء صفحہ ۱۸۰،
۸	مختصر بیان جغرافیہ ہند، پنڈت چننامنی کانپور ۱۸۶۷ء،
۹	جغرافیہ کا پہلا رسالہ، مترجم از انگریزی، میر غلام علی، مدراس، ۱۸۵۳ء،
۱۰	جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سواروپ نرائن دیواروپ نرائن دہلی ۱۸۶۸ء،

طبیعیات

۱	عجائب روزگار، رام چندر دہلی ۱۸۴۷ء،
۲	بجلی کی ڈاک، جے، ڈبلو، بیل، آگرہ، ۱۸۵۴ء،
۳	ہوا کا بیان، بدری لال، بنارس ۱۸۵۴ء،
۴	علم حکمت، (میکنکس) چالیس فنک، کلکتہ، ۱۸۴۳ء صفحہ ۳۰۱،
۵	معدنیات، جواہر لال، آگرہ، ۱۸۵۵ء،
۶	خلاصہ الصنائع، (ترجمہ از انگریزی) بھولانا تھ، آگرہ، ۱۸۵۴ء صفحہ ۱۱۲،
۷	مرآۃ العلوم، ہری درمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء،
۸	رسالہ مقناطیس، ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین، دہلی، ۱۸۵۰ء صفحہ ۲۷۱،
۹	تحصیل فی جبر الثقیل، سید احمد خان، آگرہ، ۱۸۴۴ء،

- ۱۰- اصول علم طبعی، ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد، دہلی، ۱۸۴۸ء صفحہ ۱۶۹
 ۱۱- اصول جراثیم، محمد احسن، بنارس، ۱۸۵۴ء
 ۱۲- اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد، دہلی، ۱۸۵۵ء صفحہ ۲۶۴
 ۱۳- مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی، سید محمد میر، ۱۸۴۱ء کلکتہ،
 ۱۴- دائرہ علم (ہنجرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ، ۱۸۶۶ء

معاشیات (پولیسکل اکانومی)

- ۱- ترجمہ معاشیات، وزیر علی، دہلی، ۱۸۴۴ء صفحہ ۴۱۸۰
 ۲- اصول علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، دھرم نرائن، دہلی، ۱۸۴۶ء
 ۳- اصول سیاست مدن، دھرم سمہا، علی گڑھ، ۱۸۶۹ء
 ۴- علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، ناتو ولیم سینیر، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء

علم معاشرت

- ۱- اقبالِ فرنگ، بیان عاداتِ آداب و احوالِ فرنگ، نواب اقبال لدو
 بہادر، کلکتہ، ۱۸۳۴ء
 ۲- دستورِ عمل امورِ شادی و غمی، چراغ شاہ ملتان، ۱۸۶۶ء
 ۳- اشتہارِ کینٹی، در باب تخفیف مصارفِ شادی، اگرہ، ۱۸۶۸ء

- ۴۔ ترمیم ضوابط شادی، اگرہ ۱۸۶۸ء،
 ۵۔ ضوابط شادی آرہ، ۱۸۶۸ء، ایضاً پٹنہ، ۱۸۷۴ء،

منطق

- ۱۔ ترجمہ شمس، مولوی سید محمد، دہلی ۱۸۴۴ء،
 ۲۔ میزان العلوم، سید عبد اعلیٰ، پٹنہ، ۱۸۶۹ء،
 ۳۔ خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد بدایونی، ۱۸۶۹ء،
 لائبریری کے بند ہونے کا وقت آگیا، اس لئے مجبوراً یہ فہرست تمام ہوتی ہے،
 ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس تمام ذخیرہ کا ایک سرسری جائزہ ناظرینِ معارف کے پیش
 کر سکتا،

(معارف ماہ جون ۱۹۲۰ء)

۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء

البرٹ ہال میٹن، لندن،

————— ❦ —————

انجمن اردو میاں علی کے چند سوالوں کے جواب

”دسمبر ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی جو بیٹائی گئی تھی، اس تقریب سے ہمارے دوست پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اردو سے چسپی رکھنے والے چند صاحبوں کے پاس اردو کی ترقی کے متعلق کچھ سوال لکھ کر بھیجے تھے، اور ان کا جواب مانگا تھا، میں نے ان کا جواب لکھا وہ موصوف نے جنوری ۱۹۲۶ء کے سیل میں چھاپا تھا، اس وقت اس جواب میں جو تجویزیں پیش کی گئی تھیں وہ اس وقت انوکھی معلوم ہوتی تھیں، مگر اب چودہ برس کے بعد دیکھئے کہ ان میں سے کتنی تجویزوں پر زمانے نے عمل کرا دیا، اور اب کتنی باقی ہیں،

یہ جوابی مضمون شروع کی تمہیدی سطروں اور آخر کے غیر اہم سوالوں کو چھوڑ کر درج ذیل ہے، سوالات یہ تھے،

۱۔ اردو میں ہندوستان کی مقبول اور مشترک زبان بننے کی کما تک صلاحیت ہے اور یہ مقصد کس طور پر حاصل ہو سکتا ہے

۲۔ اردو کو دنیا کی سنجیدہ ادبی زبانوں کی سطح پر لانے کیلئے آپ کیا تجاویز پیش کرتے ہیں

۳۔ ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار یا ناخوشگوار رکھنے یا بنانے میں اردو کا کمان ہنگ
 دخل ہے، کیا آپ کوئی ایسی تجویز پیش کریں گے جو اس کشاکش کا بطریق احسن ازالہ دیا
 افساد کر سکے،

۴۔ کیا ایسی مرکزی انجمن یا اکاڈمی کی ضرورت ہو اور اس کا قیام ممکن ہے جو عام طور سے
 اردو کے لئے مفید ہو، اور اس کی رہنمائی کر سکتی ہو، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اسکو
 قائم اور کامیاب بنانے کے لئے آپ کی تفصیلی تجاویز کیا ہوں گی،
 عبارت میں کہیں کہیں لفظی اصلاحیں کی گئی ہیں،

ہندوستان کا عموماً یہ حال رہا ہے کہ جس صوبہ میں جو راج بنا، اور جہاں تک وہ پھیلا
 وہیں کی بولی اس ملک کی زبان بنی اور پورے راج میں پھیل گئی، جب اس صوبہ کی
 سلطنت مٹ کر دوسرے صوبہ کی سلطنت قائم ہوتی تو پھر اس دوسرے صوبہ کی زبان
 کو عمومی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی، اس طرح ہندوستان میں جس طرح صوبوں کی سلطنت
 کا نشیب و فراز بدلتا رہا، اسی طرح زبانوں کا بھی اتار چڑھاؤ ہوا کیا، اس طرح ہندوستان کے
 مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کو ہندوستان کی عام زبان بننے کا فخر حاصل ہوا، اس
 آئے تو یہ درجہ فارسی کو حاصل ہوا، اسی کے ساتھ پنجاب، دہلی، اودھ، بہار، اور ڈھاکہ و
 مرشد آباد وغیرہ میں جہاں تک ان کی ادبی سلطنت پھیلی، وہاں کے نئے اور پرانے باشندے
 مل کر عام بول چال، خرید و فروخت، وعظ و نصیحت، سمجھانے بچھانے کے لئے ایک
 ملنوبہ زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، جس کا ابتدائی نام ہندی تھا، بعد کو اردو پڑا،

مسلمانوں کے بعد انگریزوں کی سلطنت آئی تو ان کو بھی پورے ملک کے سب سے ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے ہندوستانی کے نام سے اس کو اور فروغ دیا،

(الف) الغرض اوپر کی سطرون سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان کا ملک ہمیشہ ایک مشترک اور عام زبان کا محتاج رہا ہے، اور اس کی وہ زبان سیاسی انقلابوں کے ساتھ بدلتی رہی ہے،

(ب) ہندوستان کی حیثیت ایسی مختلف قوموں کے وطن کی ہے جن میں سے ہر ایک کی زبان دوسری سے مختلف ہے، اس لئے ایسے ملک کی کوئی دائمی مستقل اور مشترک زبان اگر بن سکتی ہے، تو وہی جو ہندوستان کی مختلف بولیوں کا مجموعہ اور سب قوموں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہو،

(ج) تصنیفات کی کثرت، مطبوعوں کے رواج، اخبارات کی اشاعت، ریلوں کی وسعت اور سفر کی آسانیوں نے پہلے سے بہت زیادہ اس ملک میں ایک مشترک زبان کی ضرورت ظاہر کر دی ہے،

(د) چونکہ مختلف قوموں کا باہمی میل جول ہی اس زبان کی پیدائش کا سبب ہے، اس لئے خود بخود جہان تک ریلوں کی لائنیں بچھتی جاتی ہیں، یہ مشترک زبان کسی نہ کسی جیس میں موجود ہے،

اس وقت ہندی نام کوئی بول چال کی زبان کسی صوبہ کی نہیں ہے، موجودہ

اردو اور ہندی میں جو فرق ہے وہ افعال اور حروف کا نہیں ہے، بلکہ صرف اسماء کا ہے، یہ اسماء ہر قوم اور صوبہ کے حسب حال کچھ نہ کچھ بدلتے ہی رہیں گے، مگر ہر حال وہ اردو ہی رہے گی، اور وہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے، ثبوت کیلئے نظری اور منطقی دلیلوں کی ضرورت نہیں، بلکہ خود عملی واقعہ اس کی دلیل ہے، پیشاور سے لے کر تم بلٹی تک سفر کرو، پھر کرچی سے لیکر ہمالیہ تک آؤ، ہر اسٹیشن پر ہر قری، ہر خانچہ فروش سے، ہر دوکاندار سے، ہر ساتھی سے، ہر گاڑی والے سے اگر تم اس صوبہ کی خاص زبان نہیں جانتے، تو یہی ہندوستانی زبان تمہاری رفیق ہے، اور وہی ہر جگہ تمہاری زبان سے نکلتی ہے اور نکلے گی، اس لئے معمولی کاروبار اور بول چال کی حیثیت سے تو وہ اس وقت بھی ہندوستان کی مشترک زبان ہے، جو کچھ بحث ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ہندوستان کی ساری قومیں اپنی علمی اور تعلیمی مشترک زبان مان لیں، اس وقت اردو کی حالت یہ ہے کہ جہاں تک عام اور مشترک ضرورت کا لحاظ ہے، وہ ہندوستان کی مختلف بولیوں والی قوموں کے درمیان جان پہچان اور بول چال کا رشتہ بنی ہوئی ہے، ہندوستان کی تمام بڑی بڑی قومیں ہندوستانی سمجھ سکتی ہیں، اگر وہ انگریزی نہ جانتی ہوں تو یہی سب کے کام آتی ہے، مختلف صوبوں کے مختلف بولیوں کے بولنے والے سفر میں جب اکٹھے ہوتے ہیں، تو یہی زبان ان کے درمیان کی کڑی ہوتی ہے، ہندوستان کے مسلمان جس صوبہ میں رہتے ہیں گوان کی مادری زبان ان کے صوبہ کی وہی بولی ہے، چہر بھی

ان کی دوسری عمومی زبان یہی اردو ہے، اور وہی ان کے جلسوں اور مجبوں کی زبان ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی آبادی کا جہان تک تعلق ہے، وہ ہندوستان کی عام زبان ہے، جن مقامات میں وہ نہیں بولی جاتی وہاں وہ سمجھی ضرور جاتی ہے۔ مدراس، بمبئی اور بنگال سے جہاں کی وہ مادری زبان نہیں، اردو اجار اور رسالے برابر نکل رہے ہیں، ہندوستان سے باہر ان تمام مقامات میں وہ پائی جاتی ہے، جہاں کسی ہندوستانی کا قدم پہنچا ہے، ہندوستان سے نکلا ہوا کوئی جہاز جس بندرگاہ سے عام طور سے گذر کرتا ہے ہر جگہ اردو کا قدم مضبوط کر گیا ہے، جہاں جہاں ہندوستانی نوآبادی قائم ہے یہ زبان ان کے دم کے ساتھ ہے، افریقہ کے مختلف حصوں اور عرب کے مختلف بندرگاہوں میں وہ بولی جاتی ہے، یہاں تک کہ سوئیڈن کی نہر جاری ہے، سنگاپور، مالدیپ، رنگون، جاوا، چین، افغانستان تک اس کا تھوڑا تھوڑا نشان ملتا ہے، ان واقعات سے یہ ثابت ہو گا کہ گویا زبان سے کتنا ہی انکار کیا جائے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہی ہندوستان کی مشترک اور عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی ایک زبان ہے جو آئندہ ہندوستان کی علمی اور تعلیمی زبان آسانی سے بنائی جاسکتی ہے،

اس وقت کوئی ایسا عقلمند ہندوستان میں نہیں جو اس ملک کے لئے ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت سے انکار کرے، اگر ہندوستان کو ایک قوم بتا ہے، تو مقامی زبانوں کے سوا ایک نہ ایک عام زبان اس کو بنانی پڑیگی،

اور جب یہ زبان اس حد تک پھیل چکی ہے اور مافی جا چکی ہے، تو اس کے سوا کسی اور دیہاتی زبان کو اسی حد تک پھیلانے اور بڑھانے میں کوئی دوسری قوم کیون اپنا وقت اپنا روپیہ اور اپنی محنت صرف کر رہی ہے، حالانکہ تجربہ ہے کہ جس چیز کو وہ پھیلا رہی ہے وہ اسی زبان کی ایک کم ترقی پائی ہوئی شکل ہے،

شہزاد اور دیہاتوں کی زبانیں بے شبہ مختلف ہیں لیکن یہ اختلاف ادنیٰ اور اعلیٰ کا ہے جہاں شہزادوں کا تعلق ہے، اردو ہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اسی کے فعل و حرف اور اسم بولے جاتے ہیں، دیہاتوں کا جہاں تک لگاؤ ہے وہاں ان صوبوں میں بھی جہان کی علمی و ادبی بلکہ مادری زبان اردو ہے، مختلف فعلوں اور اسموں کی کم درجہ اردو بولی جاتی ہے، اور وہ ہر جگہ کی علیحدہ ہے، اور وہ کی دیہاتی زبان، گورکھ پور کمشنری کی دیہاتی زبان، آدھ کی دیہاتی زبان، چمپارن کی دیہاتی زبان، سارن کی دیہاتی زبان، خاص بہار کی دیہاتی زبان، اسی طرح اطرافِ دلی کی دیہاتی زبان، اطرافِ سہارنپور کی دیہاتی زبان، علی گڑھ کی دیہاتی زبان ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے، حالانکہ ان تمام مقاموں کی علمی، تعلیمی، مجلسی بلکہ مادری زبان صرف اردو ہے، تو اگر ان ہی دیہاتی زبانوں کو ہندی لکچر ملک کی عام زبان بنانے کی کوشش ہے تو سوال ہو گا کہ کس مقام کی دیہاتی زبان اس کام کے لئے چنی جائے گی؟ ہندوستان کے باہر بھی دنیا کے ہر ملک میں ایسی دیہاتی زبانیں موجود ہیں مگر وہ عام علمی، تعلیمی، ادبی اور مجلسی زبان نہیں قرار پاتیں،

الغرض اردو کے عام اور مشترک زبان بنائے جانے پر دلیلیں یہ ہیں،

۱۔ ہندوستان جیسے مختلف ذاتوں، قوموں اور بولیوں کے ملک میں اردو ہی جیسی ملی جلی بولی، عام اور مشترک زبان بن سکتی ہے،

۲۔ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی، اور ان کی دوستی و محبت کی دائمی یادگار ہے، اس یادگار کو مٹانا سیاسی حیثیت سے حد درجہ خطرناک ہے،

۳۔ اس کو پشاور سے لے کر بنگال کی سرحد سی پٹی کے قلب اور دکن کے گوشوں تک سب ہندو مسلمان بولتے ہیں، اس لئے آسانی سے وہ پورے ملک کی مادری زبان بن سکتی ہے،

۴۔ سات کروڑ مسلمانوں کا جہان تک تعلق ہے وہ اس وقت بھی ہر صوبہ میں ان کی عام اور مشترک زبان ہے، ہر صوبہ میں ان کے اخبارات، پریس، کتابیں اور رسالے اسی زبان میں ہیں اور وہی ان کی تعلیم اور تقریر کی زبان ہے،

۵۔ جن صوبوں کی یہ مادری زبان نہیں وہاں بھی وہ عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کو وہاں اور ترقی دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں،

۶۔ ایک زبان جس نے ملک میں عام اور مشترک حیثیت یہاں تک حاصل کر لی ہو، اس کو اب مٹا کر دوسری زبان کو رواج دینے کی کوشش اگلے نسلوں کی صدیوں کی محنت پر پانی پھیر دینا ہے،

۷۔ جہان تک بیرون ہند کا تعلق ہے، یہی زبان ہندوستان کی عام زبان سمجھی

جاتی ہے، اس لئے اس کو مٹا دینے یا بدل دینے کی کوشش دنیا کو پھر نئے سرے سے ایک نئی زبان سے آشنا کرنے کے لئے محنت کرنا ہی،

۸۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ اس پاس کے دوسرے ایشیائی اور مشرقی ملکوں کی زبانوں سے بھی متعلق ہے، افغانستان، ایران، ترکستان، عرب، عراق، شام، مصر وغیرہ ملکوں کے لوگ نہایت آسانی سے اس کو سیکھ سکتے ہیں اور سیکھتے ہیں، اس لئے اگر یہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان مان لی جائے تو اس کا نہایت امکان ہے کہ آئندہ وہ تمام ایشیا بلکہ سارے مشرق میں وہ سمجھو کی زبان بن جائے اور یہ امر ہندوستان کی دائمی اور نہ مٹنے والی عزت کا سبب ہوگا۔ اب سوال کے دوسرے ٹکڑے کا جواب دینا ہے، کہ اس کو مشترک اور عام زبان بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ اور یہ مقصد کس طور سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اردو ہماری کوششوں کے بغیر یہاں تک پہنچی ہے، یعنی کسی نے کوئی خاص کوشش اس کے لئے نہیں کی ہے، تاہم وہ پھیل رہی ہے اور پھیلتی جاتی ہے، اور یہ اس لئے کہ وہ فطرت کی طلب اور تقاضے کے مطابق ہے، ملک کو ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت ہے، اور وہ اس ضرورت کی پیاس کو بجھاتی ہے، اس خود رو ترقی کے علاوہ حسبِ ذیل دوسرے ذریعوں کو بھی اس کے لئے اختیار کیا جائے تو مناسب ہو،

۱۔ اردو کے ہمدردوں اور ہندی کے حامیوں کا مشورہ کا ایک مشترک جلسہ

اس میں اردو اور ہندی کی بحثوں کے متعلق بہرہ رومی اور نیک نیتی کے ساتھ گفتگو اور سمجھوتہ ہو اور معلوم کیا جائے کہ وہ ہندی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اور ہم اردو کو کیا سمجھتے ہیں؟ کیونکہ دونوں قومیں ایک زبان کے پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتی ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دعوے کی کیا دلیلیں ہیں؟

۲۔ مختلف صوبوں کے اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں اردو ریڈنگ روم اور اردو کلب قائم کئے جائیں جنہیں داخلہ کی شرط یہ ہو کہ ان کو اردو بولتی پڑے گی۔
۳۔ چند جوان بہت اصحاب ایسے کھڑے ہوں جو کسی مرکزی انجمن کی طرف سے ہندوستان کے ان صوبوں کا دورہ کریں جہاں اردو بولی نہیں جاتی وہاں جا کر اردو کی ضرورت لوگوں کو سمجھائیں۔ وہاں کے مدرسوں میں اس کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں، اور اردو قرأت خانے اور کلب قائم کریں اور اردو رسالوں، اخبار اور کتابوں کا شوق دلائیں،

۴۔ سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور ادبی کتابیں اور قصہ کہانی کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھو اور چھپوائیں، اور ان کو نصاب میں داخل کرائیں، اور لوگوں کو مطالعہ کے لئے پیش کریں، ان کتابوں اور رسالوں کی تصنیف میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے (الف) زبان صاف، ہلکے اور سادہ ہو، جس میں موٹے موٹے عربی اور سنسکرت لفظوں سے پرہیز کیا جائے، جہاں تک ممکن ہو فارسی اور عربی ترکیبوں اور فارسی اضافہ اور صفت موصوف اور عطف سے بچا جائے، اور عربی و فارسی جملوں کی جگہ اردو

قاعدہ کے مطابق جمع بولین، مثلاً تجاویز کے بدلے تجویزین، تدابیر کی جگہ تدبیرین بکتب کے بجائے کتابین وغیرہ، اسی طرح سنسکرت کے حرف عطف وغیرہ سے بھی پرہیز کیا جائے (ب) فارسی، عربی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ کاٹ چھٹ کر اور خراپہ چڑھ کر اردو لفظ بن گئے ہیں، لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو غلط ٹھہرا کر صحیح طور پر عربی، فارسی سنسکرت لفظ بولے جائیں، یہی سختی سے مخالفت کی جائے،

(ج) اردو گرامر اور اردو سکھانے والی بول چال کی کتابیں بن گئی، تامل، تملگو، ملیالم، سندھی، گجراتی اور مرہٹی میں ان میں سہر زبان کے بولنے والوں کے لئے الگ الگ لکھی جائیں اور ہر ایک میں اردو دشمنی بنائی جائے،

(د) ایک دو ایسے اخبار اور رسالے خاص اسی ضرورت سے آسان، سہل اور بالکل سادہ زبان میں بنائے جائیں، جو مبتدیوں کے کام آئیں اور وہ ان کو پڑھیں، (ک) کوشش کی جائے اور نمونے پیش کئے جائیں کہ آئندہ ہماری تحریروں کے عام فہم نمونے یہ ہوں،

(و) اردو کی اس خوبی تے کہ اس میں ہر زبان کے لفظ آسانی سے چلن میں آسکتے ہیں، اس بات کا موقع دیدیا ہے کہ لوگ اس کی اس خوبی کو عیب بنا دیں، یعنی گویا ہر مفسر قی کو یہ عام اجازت دے دی گئی ہے کہ جس قدر لفظ فارسی یا عربی یا سنسکرت یا انگریزی کے وہ بڑھاتے جائیں وہ اردو ہی باقی رہے گی، اس طرح اردو کی مٹی پلید ہو رہی ہے، اس کی روک تھام ضروری ہے،

(ز) اس کے لئے ہمارے خیال میں یہ کیا جائے کہ چند مسلمان اور ہندو اہل قلم مل کر اردو کا ایک ایسا لغت لکھیں جن میں اردو کے قابل تمام کھرے لفظ چن لیں، اور ان ہی کو دوسرے لفظوں کے پرکھنے کا معیار بنائیں،

(ح) اردو ہی کے چھپے ہوئے معنی آرڈر، فارم اور کچری کے کاغذات اور دوسرے سرکاری کاغذات استعمال کئے جائیں اور اردو ہی میں خطوں پر پتے لکھے جائیں نہ کہ انگریزی پر بورڈ لگائے جائیں، اسٹیشنوں پر نام لکھے جائیں،

(ط) ایسے معنوں کے لئے جن کے لئے پہلے سے خالص اردو لفظ مل سکتا ہے غیر زبان کا لفظ استعمال نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اگر کسی غیر زبان کا کوئی لفظ اردو میں چل گیا ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا نیا لفظ نہ بولا جائے، مثلاً کوئلہ کی مجلس کی جگہ ”مجلس زغال“ ڈاک خانہ کی جگہ ”پوسٹ آفس“ یا توسط ”اسٹیشن کی جگہ“ ”محطہ“ پروگرام کی جگہ ”بروزنامہ“ وغیرہ،

اردو کو سنجیدہ علمی زبانوں کی سطح پر لانے کی تجویزیں یہ ہیں :-

(الف) اردو کی چھوٹی بڑی لغت کی کتابیں لکھی جائیں،

(ب) اردو میں انسائیکلو پیڈیا، ایک آف نالج، اور جیو گرافیکل اور ہٹارگل ڈکشنری کے طریقے پر عام معلومات کو بڑھانے والی کتابیں لکھی جائیں،

(د) نئی علمی اصطلاحوں کے بنانے کے لئے اب کسی نئی کوشش کے بجائے

ہندو مسلمان اہل علم کی ایک ایسی انجمن بنائی جائے جو اردو کی موزونی کے لحاظ

سے ان اصطلاحوں پر نظر ثانی کرے جو دارالترجمہ حیدرآباد دکن یا ہندی سبھا بنارس والہ آباد نے بنائی ہیں، اور ان دونوں میں سے ان اصطلاحوں کو چن لے جو ہندوستان کی عام تعلیمی زبان کے مناسب ہو اور ان ہی کو رواج دیا جائے،

(۸) غیر زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کئے جائیں،

(۹) مختلف مضمونوں پر خود اردو میں کتابیں لکھوائی جائیں،

(۱۰) ایسے سرمایہ والے اشاعت گھر ہوں، جن کے پاس اچھا مشورہ دینے والا

اشاف ہو اور وہ اردو مصنفوں سے حق تصنیف خریدنے، اور اس کے صحیح چھاپنے

کا کام کریں یا جو کسی سلسلہ تصنیف کو کسی خاص علم اور فن کے متعلق ترتیب دلائیں،

(۱۱) ایسے اشاعت گھر ہوں جو چھپی چھپی نہ ملنے والی کتابوں کو برابر چھپا

چھاپ کر بازاروں میں لائیں، آج اردو میں میں تیس برس پہلے جو اچھی کتابیں لکھی

گئی تھیں وہ منسل سے ملتی ہیں،

(۱۲) سب بڑی چیز یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ ملک کی عام مجلسوں، مثلاً اسلامی

تعلیمی کانفرنس، کانگریس، لیگ اور تمام سرکاری کونسلوں اور عدالتوں کی زبان

اردو ہوں،

(۱۳) اس سے بڑھکر یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہی تمام ملک میں تعلیم کی زبان

قرار دی جائے کم از کم قومی یونیورسٹیوں میں وہی تعلیم کی زبان ہو جائے، جامعہ عثمانیہ

نے اس راہ کو بہت کچھ آسان کر دیا ہے،

(۱) یونیورسٹیوں کے اعلیٰ مطالعہ و امتحان میں اردو کو بھی جگہ دی جائے اور بحیثیت ایک مستقل زبان کے اس کے لئے بھی سندرکھی جائے،

(۳)

تیسرے سوال کا طریقہ سوال صحیح نہیں ہے، اس سوال کے لفظوں سے یہ نکتہ ہے کہ اردو کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں خوشگوار یا ناخوشگوار می پیدا ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات کی ناخوشگوار کی بنا پر زبان کا مسئلہ معرض بحث میں آیا، اور ہندوؤں نے غلط فہمی سے اردو کو اکیلے مسلمانوں کی قومی زبان قرار دیدیا، اس لئے ہندی اور اردو میں کشاکش ہے، اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس سے مایوس نہیں ہیں کہ ہندی کے ہمدردوں سے اردو کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا، اسی کی کوشش کرنی چاہئے، بحث فطری ہے، کیونکہ روزمرہ کی بات چیت کے لحاظ سے اردو اور ہندی میں کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا، آج سے چند سال پہلے کے ہندی اور اردو پریس سے جو تحریریں نکلتی تھیں ان میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں تھا اب جیسے جیسے بعض مسلمان اہل قلم ایک نئی اردو عربی و فارسی کی بے جا آمیزش سے بنا رہے ہیں، ہندو بھی سنسکرت سے ملا کر ایک نئی زبان بنانا چاہتے ہیں،

ان دونوں قوموں کے تعلقات کی ناخوشگوار کی بعد ہندی تحریروں میں بالقصد سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کئے جانے لگے ہیں، اور ہندوؤں کی عام تقریروں میں سنسکرت کے اسی قسم کے الفاظ زیادہ سنے جاتے ہیں، لیکن ہمارا خیال

ہے کہ زبان کے مسئلہ میں یہ کشاکش موجودہ ناخوشگوار فضا کا نتیجہ ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ حالات سدھر جائیں گے، تو ہندوؤں میں سنسکرت الفاظ کے استعمال میں وہ غلو باقی نہ رہے گا جو اس وقت ہے، اس لئے زبان کی حیثیت سے اردو اور ہندی میں کوئی نمایان اور بہت زیادہ واضح امتیاز آئندہ قائم نہ رہیگا،

(۴)

ابھی مرکزیت کے سوال سے گزریں گے، اس کا فیصلہ طبائع اور رجحان پر موقوف ہے جس اکاڈمی یا بزم علمی کے خدمات زبان اردو کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے وہ خود بخود اپنی مرکزیت حاصل کرے گی، ہاں آپ مرکزیت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر (ورنہ آپس میں منازعات کے چھڑ جانے کا امکان ہے) ایک ایسی علمی انجمن بناسکتے ہیں، جو جوابات مندرجہ سوالات نمبر ۱ و ۲ کو بہتر سے بہتر طریقہ سے علمی جامہ پہنا سکے اس انجمن کے کام یہ ہوں،

الف، ہندوستان کے اعلیٰ پایہ مصنفوں کے خدمات حاصل کر کے ان کی تصنیفات کو شائع کرنا،

ب۔ مختلف کالجوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے ذوقِ سلیم کا اندازہ لگا کر ان میں سے کچھ کو تصنیف و تالیف، ماہوار رسالوں اور اخباروں کی ایڈیٹری کا کام کرنے اور دوسری ادبی خدمتوں کے لئے چننا، اس کے لئے ان سے معاہدہ لکھا کر ان کو وظیفہ دینا،

ح۔ جن صوبوں میں اُردو مروج نہیں، وہاں اس کو رواج دینے کے لئے ایسے اشخاص پیدا کرنا جو تکلیفیں اٹھا کر وہاں جائیں، اور تحریروں، تقریروں اور عام گفتگوؤں کے ذریعہ سے لوگوں کو ایک عام مشترک زبان کی ضرورت بتائیں ان کو اردو سکھائیں، وہاں سے ایسے اشخاص ان صوبوں میں لائیں، جو یہاں اردو دیکھیں اور اپنے ہاں جا کر اس کو پھیلائیں، اردو سکھانے کے رات کے مدرسے اور گشتی کتب خانے اور قراءت خانے جگہ جگہ قائم کریں، جنہیں ہفتہ یا مہینہ میں ایک دفعہ عام فہم اُردو میں تقریریں کیجائیں یا تحریریں پڑھی جائیں،

(سبیل علی گڑھ، جنوری ۱۹۲۲ء)



ہاشم علی کا مجموعہ مرثی

”یہ مضمون ہندوستانی ایکادیمی الہ آباد کی دوسری ادبی کانفرنس میں جولائی ۱۹۳۱ء

میں الہ آباد میں ہوئی تھی، پڑھا گیا تھا،

اردو کی بجائے پیدائش بننے کا فخر خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ کو حاصل ہو، مگر اس کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دکن ہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو شاعری کا بیج پہلے پڑا گیا، اور اس نے پودا بنکر نشوونما حاصل کی، شمالی ہند کے رہتے والوں نے جب اس پودے کے پھل پھول اور بو باس کو دیکھا، تو بے اختیار اس کی آبپاری کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اس کی قلم اپنی سرزمین میں لگا کر اس کو سدباہار بنادیا، قائم کے زمانہ تک اردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا۔

قائم امین غزل طور کیا ریختہ وژ
اک بات پرسی زبان کنی تھی

تاریخ اردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے، کہ اردو نظم نے دلی کے تخت طاووسی کے بجائے دکن کے چتر و مند کے زیر سایہ نشوونما پائی، سلطان قلی قطب شاہ نے ۱۵۱۸ء میں جب قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی تو بیجا پور، احمد نگر اور گولکنڈ

تینوں میں شیعیت اور تفضیلیت کی اشاعت ہوئی، ساتھ ہی عرب اور سیلا کی مجلسین قائم ہونے لگیں جنہیں مختتم کاشی وغیرہ کے فارسی بندوں کے ساتھ ملک کی دیسی زبان میں بھی مرتبہ پڑھنے کا رواج ہوا،

یہ بات اردو زبان کی تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ اردو میں عشق و محبت کی داستان سرایوں سے پہلے مذہبی نظموں کی ترانہ سنجی پیدا ہوئی، چنانچہ سلطان قلی اول اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ، اور دوسرے شعراء شجاع الدین نوری اور نصرتی وغیرہ نے مرتبہ لکھے، لیکن غالباً مرثیوں کی صنف میں سب سے زیادہ جو شخصیت نمایاں ہو وہ ہاشم علی برہان پوری کی ہے،

ہاشم علی برہان پوری کے مجموعہ مرثیہ کا نام دیوان حسینی ہے، شاہ اودھ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ تھا جس کا ذکر اسپرنگر کے کیٹلاگ میں ہے، انگلستان میں ادنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ملتا ہے جس کا ذکر آجکل کی بعض تحریروں میں کیا گیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۹۳۱ء کے سفر پونہ میں مجھے پروفیسر شیخ عبدالقادر دکن کا برج پونہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک مکمل نسخہ میری نظر سے گذرا جس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مرثیہ کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوئیں،

ہاشم علی برہان پوری نام کے سوا اس شاعر کا حال کسی تذکرہ میں نہیں ملا، جو کچھ معلوم ہوتا ہے

لے راقم نے پنجاب کے ایک اخبار میں اس کا ایک اقتباس پڑھا تھا، بعد کو معلوم ہوا کہ اس نسخہ پر ایک لائق صاحب قلم کا مفصل مضمون ہے، لے یہ مضمون پونہ میں سفر کی حالت میں لکھا گیا تھا،

خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے، اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کے آخرین خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا، چند سطریں حوالہ قلم کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خان ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب و غریب مرکب تخلص ہی، چنانچہ اس دیوان کے آخرین ہے:-

”تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خان دام ظلہ تخلص ہاشم علی“۔

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، اس کی ولادت اور وفات کا سال نہیں معلوم، مگر اس کے اس دیوان میں اس کے ایک مرثیہ کی تہید میں ایک فارسی عبارت ہے، جس میں مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۴۸ھ کو اس کے ہم مشرب و ہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو اپنے مرثیہ سنانے کی فرمائش سنا دی، عبارت یہ ہے:

”از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام بانی

فضل الدین در عالم رویا بتاریخ ہشتم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ھ مشاہدہ نمود (شہ)

اس کے بعد اس دیوان میں ایک مستط مرثیہ ہے، جس کا نام شاعر نے درود نامہ رکھا ہے، اس کے آخرین یہ دو شعر ہیں:-

جب منجم نے کیا اس درود نامہ کا حسنا
غین وقاف سین ط آیا رقم اندر کتب
سُن کے یو تاریخ کون سینہ میں ڈل ہوا گنبا
نختم گر ہاشم علی قاسم کی شادی کا بچن

اس حساب سے یہ ولی دکنی کا معاصر ہے جس کی وفات کا سال ۱۱۵۵ھ ہے، عاظم

سے ہاشم علی اس کا نام سمجھا جاتا ہے، مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس کا نام علی محمد خان تھا اور ہاشم علی پورا اس کا تخلص ہے، گو تخلص کا یہ اسلوب شعرا کی طرز و روش کے خلاف ہے، مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ اس کا تخلص ہی، نام نہیں چنانچہ اس کے دیوان کے ہر قصیدہ، اور نظم کے آخر میں یہی تخلص آیا ہے، مثلاً

چو طرف ہاشم علی ہے سرسبز انقلاب و فتنہ و آشوب و شر

بول تو نابل صفت ہاشم علی صبح دم میں مدح اولادِ علیؑ

زندگی دنیا کی ہر ہاشم علی خوابِ خیال جو رہا سویا وہ چوکا، جاگنا ہیگا محال

تجھے ہاشم علی محترمین دریاے گنہ سیتین بھروسہ ہے وہ شہ اوپر وہاں سین پارتا ^{ریگا}
عام طور سے اس کو برہانپوری کہتے ہیں، شاید یہ اس کی جاے پیدائش ہو، مگر اس کے دیوان میں ایک شعر یہ ہے:-

گجرات میں پڑی جب یہ مرثیہ کون یارا سنکر چلے ہیں رونے دھنی دکن کو اپنے
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا قیام گجرات میں تھا،

دیوان حسینی | چونکہ ہاشم علی کا یہ دیوان سراسر مرثیوں کا مجموعہ ہے اس لئے شاعر نے اس کا نام ”دیوان حسینی“ رکھا ہے، چنانچہ وہ خود کہتا ہے:-

تو نکھا ہے کربلا کا یوں بیان ہاشم علی
 ہے یو "دیوان حسینی" نام اس دیوان کا
 معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر سال ماہ محرم میں نیا مرثیہ تصنیف کرتا تھا، کہتا ہے،
 تجھ کو ہاشم علی حسین سرور
 ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں
 اپنی شاعری کی برتری کا بھی اس کو خیال تھا:

شاعروں نے شعر بولے گر پھر نگین دلکشا
 اے عزیزان یونخن ہر اس دل بریاں کا
 عربی سے بھی واقفیت تھی، بعض مصرعے پورے عربی میں ہیں:-

یہ بشارت بہشت کے در پر
 ادخلوا خالداً دین سلام علیک
 ربنا اغفر لنا خطایا نا
 بالنبی الامین سلام علیک

فارسی میں بھی بعض مرثیے کہے ہیں، جن کی زبان اچھی خاصی ہے، حافظ کی فارسی
 غزل "دل میر و دزد و ستم صاحب دلاں خدا را" پر مصرعے لگائے ہیں،
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیوں کے علاوہ وہ غزلیں وغیرہ نہیں کہتے تھے، چنانچہ
 ایک جگہ مقطع میں یہ اقرار ہے:-

بجز مدح نہیں شعر ہاشم علی
 کھو راستی کے سخن پر سلام
 دوسری جگہ ہے،

شاعری میں یوں مقرر جو تجھے ہاشم علی
 جز ثنا و مرثیہ شعر و گر کہنا غلط
 ایک اور مرثیہ کا مقطع ہے:-

شعر ہاشم علی کے تین یاران
 مدح مولا سنی و کھیسو خاص

ہاشم علی ہمیشہ شاہ خان شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا تین

موجودہ نسخہ | دیوان حسینی کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال میں نہایت ہی پرانا ہے اور خود مصنف کی زندگی میں لکھا گیا ہے جیسا کہ دام ظلہ سے ظاہر ہے، یہ نسخہ ۲۸۳۴ھ کی تقطیع پر پرانے کتبی کی غلطی پر غلط نسخہ نقل میں لکھا ہوا ہے، جدول اور بیچ کی لکیریں سرخ میں اصل دیوان اسی خط اور جدول میں ہے دیوان حروف ابجد کی ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ہے، مگر شروع میں، اور بیچ میں بعض بعض حروف کی ردیفوں کے بند اور آخر میں بعض نئی نظمیں جدولوں کے بغیر دوسرے خط میں بڑھائی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ہیں، وہ اپنی اپنی جگہ پر اپنے حروف میں بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ نسخہ مذکور کے آخر میں یہ تصریح بھی ملتی ہے،

”ایں چند نامرثیہ ہندی نو کہ در دیوان مرزا صاحب شفق مرہبان نیس خنی و علی محمد

علی سلمہ ربہ نبود، احقر عباد محمد علی غفر اللہ تعالیٰ ذنبہ براسے یاد و بود نوشت، امید کہ

ہر کہ بخواند بدعاے خیر فقیر حقیر را یاد نماید“

نوشتہ باند سید بر سفید نویندہ رانیت فردا امید

مست تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی“

اس نسخہ میں ۴۲۰ صفحے ہیں، اور ہر صفحہ میں تقریباً سترہ شعر ہیں، اور یہ کل کے کل مرثیہ

مرثیے اسلام اور مصائب کربلا کے بیان میں ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے جنہوں نے صرف مرثیوں کا ایسا ضخیم مجموعہ

یادگار چھوڑا، اور اس حیثیت سے یہ مجموعہ غالباً ہندوستان میں اپنی طرز کا تنہا اور یکتا ہے
 زبان | زبان کی خصوصیتیں وہی ہیں جو ولی کے کلام میں ہیں، مثلاً

ستین اور سین	بجائے	سے	آنجھو	بجائے	آنسو
یو	"	یہ	تم	"	تم
کوں	"	کو	ہم	"	ہم
سوں	"	سے	ہیگا	"	ہوگا
منی	"	میں	کسوں	"	کسی
میاں	"	میں	سونے	"	سنے
کتین	"	کے تین، کیلئے	ایتا	"	اتنا
بجے		مجھے			

جمع الف نون کے ساتھ، یہاں تک کہ ہندی لفظوں کی بھی، جیسے اُکھیاں، پلکان
 'آنجھوان' (اور آج تک دکھنی اردو میں اسی طرح نئے جمعین بنائی جاتی ہیں) مت (کلمہ
 نفی) کو "متہ" (ہائے کے ساتھ) چنانچہ ایک مرثیہ کو جس میں ردیف متہ ہے، ت کے
 بجائے ہ کی ردیف میں جگہ دی ہے،

ہندی لفظوں کا بکثرت استعمال، جیسے بچن بات کے معنی میں، کھ منھ کے معنی میں۔
 رو رو سکینہ غم سوں کی پھر نہیں سونے بابا کے کھ سوں مٹھی بچن کر بلا متی

میں سر کے معنی میں "نمانا" جھکانا "من" دل کے معنی میں "دولن" بجائے دلن

بیٹھی گھونگھٹہ میں سینس نا درو سیس خوش روتی ہے آج من میں دولن کر بلا منی
سجن بمعنی محبوب :-

ع جب سین چلے ہین میرے سجن کر بلا منی

دیے بمعنی دیکھے ع چہرہ خورشید سا دیسے تیرا
" باج بمعنی بن " آج تجھ باج سیہ پوش ہوا کعبہ ز غم
" جگت بمعنی دنیا " ہاشم علی ہو جگت میں سبھی ملال
" اندھکار بمعنی اندھیرا " آج تجھ باج جگت سیچہ ہوا اندھکار میں
" اوجاری بمعنی اجالا " دو جگ کے اوجاری پر ایتا ستم

چندر بمعنی چاند

پھر محرم کا چندر آیا نہ ہوتا کاشکے قتل سرور کی خبر لایا نہ ہوتا کاشکے

ع کرن بمعنی کان " دو نو گالوں او پر زلفان پری چھوتی کرن ہو کر
" نین بمعنی آنکھ " کیا نور نین ہے ہے

چرن بمعنی قدم " افسوس ہونہ لائی گھر میں چرن توں اپنی
" اکاس بمعنی فضا " غم کے داغان سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام

اے شہر دین کترین ہاشم علی ہے تمہارا بندہ و مملوک داس
ذرا اوپر کے دوسرے مصرع کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو،

نگر یعنی شہر،

سن نگر میں شورِ محشر ہر گلی ہے شبِ قتلِ شہیدانِ الٰہِ رات

اس نگر سے کوئی خاص شہر غالباً مراد نہیں، کیونکہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے،

اس دروسوں ہاشم علی لاگے لان میں تلمیے نگر و نگر، گلیوں گلی کہتے ہیں یا رانِ وحشیں

صاف شعر | اس قدامت کے باوجود مرثیہ میں بہت سے شعر صاف بھی ہیں :-

ظلم کیا برملا ہاے فلک کیا کیا فاطمہ کا دل جدا ہاے فلک کیا کیا

جسکے گلے مصطفیٰ بوسہ لیا بارہا شمر کا خنجر رکھا ہاے فلک کیا کیا

عابدین بیمار تھا شاہ گرفتار تھا تجھکوں سزاوار تھا ہاے فلک کیا کیا

شکوہ دوراں لکھس غم کی یو باتاں کھوں کاں رکھا تلک ہر دم کو ہاے فلک کیا کیا

جن وقت شاہ دن سون پایا سا جگر سدا بیتاب کھول سر کوں زینے یوں پکارا

دیکھو رسول احمد، فرزند کون تم اپنے افسوس کر بلا میں بے سر پڑا ہے مارا

یہ کو فیانِ بیدین اہمان بولائے ہم کو بن جو رہن جفا سوں کرتے نہیں مدارا

ہوا پھر کر محرم کا مہینا نبی کے آل کا ٹوٹا سفینا

سدا ہا اتشہ لبِ فردوس کوئی جہاں میں کوئی نہ تھا جس کا قرینا

سیمانِ تخت کو چھوڑا ہر روتا گرا خاتمِ نبی کا جب نگینا

کما شہ نے حرم سوں نہیں ہی چارا مجھے شربتِ شہادت کا ہی پینا

نہ یہ تبدیل پاوے آج تقدیر ہو۔ حق کے قضا اوپر رضینا

سکینہ نے کہا وہ دن نہ آئے جہاں میں بے پدر ہو مجھ کو جینا

یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

کلام کا نمونہ | ان مرثیوں میں سر تا پا پر درد مضمون، ماتم، بین، یتیمی، اور کسی کے حسرت انگیز

واقعے بیان کئے گئے ہیں، قدرت کے منظر، لڑائی کا نقشہ، گھوڑے کی تعریف، تلوار

کے تشبیہی مضمون اور مبالغہ کی رنگ آمیزی مطلق نہیں، بلکہ درد و غم کے صرف

فطری مضمون ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں، ایک مرثیہ کی سرخی ہے :-

”توجہ نو دن شہر بانو بعد از شہادت امام زادہ علی اصغر بیان کردن حالات

و مکالمہ نمودن با او“

دیکھئے کہ ایک محصوم ننھے بچہ کی موت کا کتنا پر اثر فطری بیان ہے۔

کتین بانو آج میں کس کا جھولاؤں پانا

بائے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پانا

اوجان مادر کہاں ہو تو پھر کرمیں تھک کو کہاں ملوں

بیٹھی کیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پانا

بریں سولاؤں میں کسے دو دپلاؤں میں کسے

جاماں پناؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پانا

سویا ہے گردن ڈال کیوں لچو زلف کے بال کیوں

رنگیں لو ہو میں گال کیوں کس کا جھولاؤں پانا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں تو بول بتیاں میں سنوں
 روتا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پانا
 تو چھوڑ مجھ کو کہاں گیا، توں دو د کسکا کیوں پیا
 بسرا ہے میری کیوں میا کس کا جھولاؤں پانا
 بھیگا لبوں میں ہو گا، لیتی ہوں تیری میں بلا
 توں پاس اپنے مجھ بولا کسکا جھولاؤں پانا
 جاؤں کدھر میں کیا کروں، یہ گود خالی لے پھروں
 اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پانا
 یہ دیکھ میرا حال توں، توڑیوں سر کے بال کوں
 میں دل کی حالت کیا کہوں کسکا جھولاؤں پانا
 تھے کھیلنے کے دن ترے، کیا عمر تھی کیا سن ترے
 نہیں چین مجھ کو بن ترے کس کا جھولاؤں پانا
 نہیں بھولی مجھ کو توں کہوں تجھ یاد کرنے میں رہوں
 رو رو کے تجھ بن دن بھروں کسکا جھولاؤں پانا
 یہ بن تیری نگہاں، بیٹھی ہے روتی زار زار
 تو اٹھ سکیں کر پوکار کس کا جھولاؤں پانا
 توں روٹھ ہٹ کر کہاں گیا، میں تجھ کوں لاؤں پھرنا

متہ ہوئے مجھ سون تو جدا کس کا جھولاؤں پانا

تیری صورت پر مین فدا پھر تا نظر میں توں رہا

جب کہ لڑ میں توں گیا کس کا جھولاؤں پانا

جاتا نظر میں نور کیوں، توں مجھ سوں ہوتا دور کیوں

اڑتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پانا

کہاں میں چل تھی گھات میں گئی لیکر تجھ کو بات میں

بالا کی بات میں کس کا جھولاؤں پانا

اے میرے پیارے لاڈلے پھر کے لگتے مجھ گئے

انجھوں میں ہیں بہ چلے، کس کا جھولاؤں پانا

کہاں کھیتا ہوا راج تو، خالی یہ گھر تجھ باج یوں

جاتا ہے میرا راج کیوں کس کا جھولاؤں پانا

ہاشم علی کون نہیں تو اں، بانو کا لکھنا سب بیاں

کہتی تھی ہر دم باغیاں کس کا جھولاؤں پانا

حضرت قاسم کی شادی اور شہادت کا پُراثر سماں ان لفظوں میں کھینچا ہے جس سے

آج سو دوسو برس پہلے کے رسم و رواج بھی ظاہر ہوتے ہیں،

محبانِ غم شہیدان کا دلوں میں جھولاؤ متہ

جگر میں شہ کی فرقت کی اگن جلتی بوجھاؤ متہ

حن کی جب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھیانے
 کہا نصت کرو زن کوں، چنگل میں بہا و دمہ
 نہیں سامان شادی کا مصیبت سب میا ہے
 یہ سرکاٹیں گے رن میا نے اسے سہرا بندھاؤ متہ
 پلا دیں گی مجھے شربت شہادت کا حوراں سا سی
 نہیں پانی پیاسوں کوں سو شربت کر پلاؤ متہ
 براتی ساتھ نہیں میرے چلے بن سب شہید ہو کر
 میرے سر پر قصا پھرتی دگر چھپتے سر پھراؤ متہ
 طبق دیکھے ملائک کوں لے آتے نوکے رن میں
 کہا قاسم نے اے اماں بری میری لے جاؤ متہ
 لہو میں لال ہووینگے، مرے دو ہاتھ لنگن کے
 نہیں حاجت مجھے ہندی، انجھو تیں گندھاؤ متہ
 سینہ کے دف رہیں بچے میری شادی کے تاخیر
 سو غم کی الج تم نوبت میرے بھیا کے بجاؤ متہ
 لو ہوا و خاک رن میا نے لگی میرے تن او پر
 او بتنا تیل متہ لاؤ، مجھے روتی چڑاؤ متہ
 زمیں کے تیج پر سونا مجھے ہو گا لحد میا نے

رہے گی یہ سب خالی نہیں فرصت بچھاو متہ

جدائی آج ہے قسمت نہیں یہ روز اجل ہے گا

سو دولہن ساتھ تم میرا یہ عقد غم پڑھاو متہ

مقرر مثل ہے گی شہادت رن میں پائے کوں

سو جلوہ میں ادا کرنا یہ نقد جاں دلاو متہ

اجل میں تلخ اب ہوتا میرا شیریں دہن دیکھو

جگر اس غم بسن ہٹو کرے بناتاں کو چوناو متہ

کہاں دولہن ستین روتا سو تخت جلوہ سین اوٹھ کر

میری دوری کی آتش سوں دل اپنا تم جلاو متہ

عزوی کل قیامت کوں ہماری ہیگی جنت میں

رکھو تھناک میں اپنی سہاگ اپنا لٹاو متہ

شہادت سن میری ہرگز سنگار برن تنور و تم

سو کابل کو نین ستیں بہا انجھوٹا دو متہ

روا ہے الحج دولہن کوں سرا پا لال جلوہ کا

مرے لہو میں رنگو آنجل دگر رنگ تم رنگاو متہ

اس نسخہ میں ایک بات خاص لحاظ کے قابل یہ ہے کہ اس میں اکثر تخیل ہندوئی ہے

کو خفیف لکھا گیا ہے مثلاً بیٹھے کی جگہ بیٹھے، توڑو کی جگہ توڑو، لوٹاؤ کی جگہ لوٹاؤ، اوٹپنا

کی جگہ او بتنا وغیرہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک فارسی کی عادی زبانیں ہندی حروف کے ادا کرنے پر پوری طرح فائز نہیں ہوئی تھیں، الف ممدودہ کو الف پر مد دے کر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے، یعنی ”آج“ کو ”آج“ وزن میں بعض حروف نے گرنے کی پروا اس نے نہیں کی ہے، بین کی جگہ نین، نہیں کی جگہ نیں، اسی طرح عربی لفظ عروس کو عاؤس باندھا، غزل گو میر و مرزا سے پہلے کے پرانے اردو شاعروں کے غزلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں جن سے ہماری زبان کی تدریجی ترقی ظاہر ہوتی ہے مینا ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میر و مرزا سے پہلے کے اس مجموعہ مرثیہ کو بھی شائع کیا جائے تاکہ یہ چلے کہ وہ کیا زین تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیوں سے آسمان بنا دیا، اور معلوم ہو کہ ان مرحوموں نے جن گلستان سخن کو سدا بہار بنا دیا، اس کی بہار کا آغاز کیونکر ہوا؟

اس نسخہ کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے، جو حمد میں ہے:-

ابتدا ہر نامہ و ہر کام کا لازم آیا ذکر تیرے نام کا
اور آخری شعر یہ ہے:-

یہی ہوا زو دل میں تجھو ہائیم سلی دائم کہ مولا کے کرم سستیں نجات اور کر بلا دیکھے
مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے بڑھائے گئے ہیں، اس کے لحاظ سے الف کی ردیف میں پہلا شعر یہ ہے:-

افسوس ہو ہزار کہ نوشہ گد رگیس روتی دو لہن کوں چھوڑ گھونٹھ میں گد رگیس
اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کا فارسی بند ہے:-

لے میر تقی میر
لے میرزا سوتا
لے میرزا نہیں
لے لے لے لے لے

داشت ہاشم علی چوروسے ارادت بہ نیاز

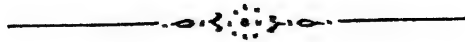
کرد منظوم چہیں واقعہ درسوز و گداز

مجموعہ کے شروع میں غالباً اسی زمانہ کے ایک اور مرثیہ گو شاعر کے دو مرثیے
ہیں جنکی زبان بھی اسی قسم کی ہے، اور ان میں شاعر کا تخلص تقی آیا ہے، یہ حسب معمول
چو مصرعے ہیں، تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتھا پورے مرثیہ میں ایک قافیہ اور
روایت کا اسود آٹک نے اسی رنگ میں مرثیے لکھے ہیں،

نامہ اعمال کا اس کے ہر گن ہوں سین سیاہ تجھ میں امی شفاعت ہر تقی کو اس شاہ
تجھ سوا کوئی کی دہجہ میں نہیں رکھتا پناہ از ازل تیرے چرن سینتیں لگا ہر ہا کو

(ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۱ء)

سہ قدم



اُردو کی نو کھپید بولی

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی پچیس سالہ یادگار مجموعہ میں جولائی ۱۹۳۳ء میں چھپا)
ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب تک ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک میں
کبھی ایک بولی نہیں بولی گئی، اور حقیقت یہ ملک ایک بڑا غم ہے جس میں ہر زمانہ
میں مختلف توہین اور مختلف نسلیں جو مختلف بولیاں بولتی تھیں، آباد تھیں، آباد ہیں، اور
آباد رہیں گی، دنیا کی زبانوں کی تین مشہور اصلیں آریائی، تورانی اور سامی تینوں یہاں
پروش ٹی جلی ملتی ہیں، ڈرویڈی زبانوں کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبوں
کی دوسری زبانیں آریائی ہیں اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے،

چند مشہور راجاؤں کے زمانوں کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصوں پر حکمران رہے، ہندوستان
کا اکثر یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے، مختلف مستقل ریاستوں کی صورت میں رہے، ان صوبوں
کی وسعت، راجہ کی قوت اور فتوحات کے دائرہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی
ہر ریاست کی زبان اس کے صوبہ کی مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی
حیثیت رکھتی تھی، اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا، اسی حد تک اس زبان کا خزانہ
دائرہ کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتا،

پھر ویسٹل یعنی ٹھٹھ کی بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے:-

”ویسٹل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چاروں طرف تنو کاٹون کے قریب
اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے، سب سے داکر
ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے“

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ء میں ترتیب دی ہے، سندھ کی زبانوں
کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے:-
”یہ لوگ مختلف زبانوں، اور مختلف مذہب والے ہیں اور ان کے کھنے کے کئی
خط ہیں، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ
ان کے ہاں دو سو خط کے قریب متعل ہیں، میں نے (ہندو کے) قصر حکومت میں
ایک بُت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے کہا گیا کہ یہ بودھ کی صورت ہے!
... اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا“

اب وہ زمانہ آیا، جب سلطان محمود کا باپ بکتگیں اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر
کھڑا کر رہا تھا، اب ہندوستان کی یولیون میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت
آیا، اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے،
آمد و رفت، لڑائی بھڑائی، اور صلح و پیام کے لئے دونوں قوموں کی زبانوں میں احتلاط
کا موقع آگیا تھا، اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی
لے سفر نامہ بشاری ۴۷۹ء، ۴۸۰ء، ۴۸۱ء، ۴۸۲ء، ۴۸۳ء، ۴۸۴ء، ۴۸۵ء، ۴۸۶ء، ۴۸۷ء، ۴۸۸ء، ۴۸۹ء، ۴۹۰ء، ۴۹۱ء، ۴۹۲ء، ۴۹۳ء، ۴۹۴ء، ۴۹۵ء، ۴۹۶ء، ۴۹۷ء، ۴۹۸ء، ۴۹۹ء، ۵۰۰ء، ۵۰۱ء، ۵۰۲ء، ۵۰۳ء، ۵۰۴ء، ۵۰۵ء، ۵۰۶ء، ۵۰۷ء، ۵۰۸ء، ۵۰۹ء، ۵۱۰ء، ۵۱۱ء، ۵۱۲ء، ۵۱۳ء، ۵۱۴ء، ۵۱۵ء، ۵۱۶ء، ۵۱۷ء، ۵۱۸ء، ۵۱۹ء، ۵۲۰ء، ۵۲۱ء، ۵۲۲ء، ۵۲۳ء، ۵۲۴ء، ۵۲۵ء، ۵۲۶ء، ۵۲۷ء، ۵۲۸ء، ۵۲۹ء، ۵۳۰ء، ۵۳۱ء، ۵۳۲ء، ۵۳۳ء، ۵۳۴ء، ۵۳۵ء، ۵۳۶ء، ۵۳۷ء، ۵۳۸ء، ۵۳۹ء، ۵۴۰ء، ۵۴۱ء، ۵۴۲ء، ۵۴۳ء، ۵۴۴ء، ۵۴۵ء، ۵۴۶ء، ۵۴۷ء، ۵۴۸ء، ۵۴۹ء، ۵۵۰ء، ۵۵۱ء، ۵۵۲ء، ۵۵۳ء، ۵۵۴ء، ۵۵۵ء، ۵۵۶ء، ۵۵۷ء، ۵۵۸ء، ۵۵۹ء، ۵۶۰ء، ۵۶۱ء، ۵۶۲ء، ۵۶۳ء، ۵۶۴ء، ۵۶۵ء، ۵۶۶ء، ۵۶۷ء، ۵۶۸ء، ۵۶۹ء، ۵۷۰ء، ۵۷۱ء، ۵۷۲ء، ۵۷۳ء، ۵۷۴ء، ۵۷۵ء، ۵۷۶ء، ۵۷۷ء، ۵۷۸ء، ۵۷۹ء، ۵۸۰ء، ۵۸۱ء، ۵۸۲ء، ۵۸۳ء، ۵۸۴ء، ۵۸۵ء، ۵۸۶ء، ۵۸۷ء، ۵۸۸ء، ۵۸۹ء، ۵۹۰ء، ۵۹۱ء، ۵۹۲ء، ۵۹۳ء، ۵۹۴ء، ۵۹۵ء، ۵۹۶ء، ۵۹۷ء، ۵۹۸ء، ۵۹۹ء، ۶۰۰ء، ۶۰۱ء، ۶۰۲ء، ۶۰۳ء، ۶۰۴ء، ۶۰۵ء، ۶۰۶ء، ۶۰۷ء، ۶۰۸ء، ۶۰۹ء، ۶۱۰ء، ۶۱۱ء، ۶۱۲ء، ۶۱۳ء، ۶۱۴ء، ۶۱۵ء، ۶۱۶ء، ۶۱۷ء، ۶۱۸ء، ۶۱۹ء، ۶۲۰ء، ۶۲۱ء، ۶۲۲ء، ۶۲۳ء، ۶۲۴ء، ۶۲۵ء، ۶۲۶ء، ۶۲۷ء، ۶۲۸ء، ۶۲۹ء، ۶۳۰ء، ۶۳۱ء، ۶۳۲ء، ۶۳۳ء، ۶۳۴ء، ۶۳۵ء، ۶۳۶ء، ۶۳۷ء، ۶۳۸ء، ۶۳۹ء، ۶۴۰ء، ۶۴۱ء، ۶۴۲ء، ۶۴۳ء، ۶۴۴ء، ۶۴۵ء، ۶۴۶ء، ۶۴۷ء، ۶۴۸ء، ۶۴۹ء، ۶۵۰ء، ۶۵۱ء، ۶۵۲ء، ۶۵۳ء، ۶۵۴ء، ۶۵۵ء، ۶۵۶ء، ۶۵۷ء، ۶۵۸ء، ۶۵۹ء، ۶۶۰ء، ۶۶۱ء، ۶۶۲ء، ۶۶۳ء، ۶۶۴ء، ۶۶۵ء، ۶۶۶ء، ۶۶۷ء، ۶۶۸ء، ۶۶۹ء، ۶۷۰ء، ۶۷۱ء، ۶۷۲ء، ۶۷۳ء، ۶۷۴ء، ۶۷۵ء، ۶۷۶ء، ۶۷۷ء، ۶۷۸ء، ۶۷۹ء، ۶۸۰ء، ۶۸۱ء، ۶۸۲ء، ۶۸۳ء، ۶۸۴ء، ۶۸۵ء، ۶۸۶ء، ۶۸۷ء، ۶۸۸ء، ۶۸۹ء، ۶۹۰ء، ۶۹۱ء، ۶۹۲ء، ۶۹۳ء، ۶۹۴ء، ۶۹۵ء، ۶۹۶ء، ۶۹۷ء، ۶۹۸ء، ۶۹۹ء، ۷۰۰ء، ۷۰۱ء، ۷۰۲ء، ۷۰۳ء، ۷۰۴ء، ۷۰۵ء، ۷۰۶ء، ۷۰۷ء، ۷۰۸ء، ۷۰۹ء، ۷۱۰ء، ۷۱۱ء، ۷۱۲ء، ۷۱۳ء، ۷۱۴ء، ۷۱۵ء، ۷۱۶ء، ۷۱۷ء، ۷۱۸ء، ۷۱۹ء، ۷۲۰ء، ۷۲۱ء، ۷۲۲ء، ۷۲۳ء، ۷۲۴ء، ۷۲۵ء، ۷۲۶ء، ۷۲۷ء، ۷۲۸ء، ۷۲۹ء، ۷۳۰ء، ۷۳۱ء، ۷۳۲ء، ۷۳۳ء، ۷۳۴ء، ۷۳۵ء، ۷۳۶ء، ۷۳۷ء، ۷۳۸ء، ۷۳۹ء، ۷۴۰ء، ۷۴۱ء، ۷۴۲ء، ۷۴۳ء، ۷۴۴ء، ۷۴۵ء، ۷۴۶ء، ۷۴۷ء، ۷۴۸ء، ۷۴۹ء، ۷۵۰ء، ۷۵۱ء، ۷۵۲ء، ۷۵۳ء، ۷۵۴ء، ۷۵۵ء، ۷۵۶ء، ۷۵۷ء، ۷۵۸ء، ۷۵۹ء، ۷۶۰ء، ۷۶۱ء، ۷۶۲ء، ۷۶۳ء، ۷۶۴ء، ۷۶۵ء، ۷۶۶ء، ۷۶۷ء، ۷۶۸ء، ۷۶۹ء، ۷۷۰ء، ۷۷۱ء، ۷۷۲ء، ۷۷۳ء، ۷۷۴ء، ۷۷۵ء، ۷۷۶ء، ۷۷۷ء، ۷۷۸ء، ۷۷۹ء، ۷۸۰ء، ۷۸۱ء، ۷۸۲ء، ۷۸۳ء، ۷۸۴ء، ۷۸۵ء، ۷۸۶ء، ۷۸۷ء، ۷۸۸ء، ۷۸۹ء، ۷۹۰ء، ۷۹۱ء، ۷۹۲ء، ۷۹۳ء، ۷۹۴ء، ۷۹۵ء، ۷۹۶ء، ۷۹۷ء، ۷۹۸ء، ۷۹۹ء، ۸۰۰ء، ۸۰۱ء، ۸۰۲ء، ۸۰۳ء، ۸۰۴ء، ۸۰۵ء، ۸۰۶ء، ۸۰۷ء، ۸۰۸ء، ۸۰۹ء، ۸۱۰ء، ۸۱۱ء، ۸۱۲ء، ۸۱۳ء، ۸۱۴ء، ۸۱۵ء، ۸۱۶ء، ۸۱۷ء، ۸۱۸ء، ۸۱۹ء، ۸۲۰ء، ۸۲۱ء، ۸۲۲ء، ۸۲۳ء، ۸۲۴ء، ۸۲۵ء، ۸۲۶ء، ۸۲۷ء، ۸۲۸ء، ۸۲۹ء، ۸۳۰ء، ۸۳۱ء، ۸۳۲ء، ۸۳۳ء، ۸۳۴ء، ۸۳۵ء، ۸۳۶ء، ۸۳۷ء، ۸۳۸ء، ۸۳۹ء، ۸۴۰ء، ۸۴۱ء، ۸۴۲ء، ۸۴۳ء، ۸۴۴ء، ۸۴۵ء، ۸۴۶ء، ۸۴۷ء، ۸۴۸ء، ۸۴۹ء، ۸۵۰ء، ۸۵۱ء، ۸۵۲ء، ۸۵۳ء، ۸۵۴ء، ۸۵۵ء، ۸۵۶ء، ۸۵۷ء، ۸۵۸ء، ۸۵۹ء، ۸۶۰ء، ۸۶۱ء، ۸۶۲ء، ۸۶۳ء، ۸۶۴ء، ۸۶۵ء، ۸۶۶ء، ۸۶۷ء، ۸۶۸ء، ۸۶۹ء، ۸۷۰ء، ۸۷۱ء، ۸۷۲ء، ۸۷۳ء، ۸۷۴ء، ۸۷۵ء، ۸۷۶ء، ۸۷۷ء، ۸۷۸ء، ۸۷۹ء، ۸۸۰ء، ۸۸۱ء، ۸۸۲ء، ۸۸۳ء، ۸۸۴ء، ۸۸۵ء، ۸۸۶ء، ۸۸۷ء، ۸۸۸ء، ۸۸۹ء، ۸۹۰ء، ۸۹۱ء، ۸۹۲ء، ۸۹۳ء، ۸۹۴ء، ۸۹۵ء، ۸۹۶ء، ۸۹۷ء، ۸۹۸ء، ۸۹۹ء، ۹۰۰ء، ۹۰۱ء، ۹۰۲ء، ۹۰۳ء، ۹۰۴ء، ۹۰۵ء، ۹۰۶ء، ۹۰۷ء، ۹۰۸ء، ۹۰۹ء، ۹۱۰ء، ۹۱۱ء، ۹۱۲ء، ۹۱۳ء، ۹۱۴ء، ۹۱۵ء، ۹۱۶ء، ۹۱۷ء، ۹۱۸ء، ۹۱۹ء، ۹۲۰ء، ۹۲۱ء، ۹۲۲ء، ۹۲۳ء، ۹۲۴ء، ۹۲۵ء، ۹۲۶ء، ۹۲۷ء، ۹۲۸ء، ۹۲۹ء، ۹۳۰ء، ۹۳۱ء، ۹۳۲ء، ۹۳۳ء، ۹۳۴ء، ۹۳۵ء، ۹۳۶ء، ۹۳۷ء، ۹۳۸ء، ۹۳۹ء، ۹۴۰ء، ۹۴۱ء، ۹۴۲ء، ۹۴۳ء، ۹۴۴ء، ۹۴۵ء، ۹۴۶ء، ۹۴۷ء، ۹۴۸ء، ۹۴۹ء، ۹۵۰ء، ۹۵۱ء، ۹۵۲ء، ۹۵۳ء، ۹۵۴ء، ۹۵۵ء، ۹۵۶ء، ۹۵۷ء، ۹۵۸ء، ۹۵۹ء، ۹۶۰ء، ۹۶۱ء، ۹۶۲ء، ۹۶۳ء، ۹۶۴ء، ۹۶۵ء، ۹۶۶ء، ۹۶۷ء، ۹۶۸ء، ۹۶۹ء، ۹۷۰ء، ۹۷۱ء، ۹۷۲ء، ۹۷۳ء، ۹۷۴ء، ۹۷۵ء، ۹۷۶ء، ۹۷۷ء، ۹۷۸ء، ۹۷۹ء، ۹۸۰ء، ۹۸۱ء، ۹۸۲ء، ۹۸۳ء، ۹۸۴ء، ۹۸۵ء، ۹۸۶ء، ۹۸۷ء، ۹۸۸ء، ۹۸۹ء، ۹۹۰ء، ۹۹۱ء، ۹۹۲ء، ۹۹۳ء، ۹۹۴ء، ۹۹۵ء، ۹۹۶ء، ۹۹۷ء، ۹۹۸ء، ۹۹۹ء، ۱۰۰۰ء

افغانستان و ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے۔ امیر سکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے،

”و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شد از ہند و فلج و از ہر دستی“

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جو بچپن میں شیراز پہنچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی،

”خطے نیکو بہ ہندی فارسی و مدتے دراز بکثیر رفتہ بود و شاگردی کردہ ...“

و اورادیری و مترجمی کر دے با ہندوان“

ابو الفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سکتگین میں اپنے زمانہ یعنی سلطان مسعود ^{۵۴۱ھ} سے ^{۵۴۳ھ} کے عہد میں اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا،

”ہم چنان بیربل بدیوان ما“

سلطان محمود کے دربار میں جہان عجب و عجم کے اہل علم تھے، وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریکِ بزم رہتے تھے، کانجھر کے راہب ندانے ^{۵۴۳ھ} میں جب سلطان کی شان میں ہندی شعر لکھ کر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ میں ہے:-

”و نذا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان اس را

لے تاریخ بیہقی ۷۲۷ و ۵۰۷ کلکتہ ۱۷۵۷ ایضاً ۵۳۵ تاریخ بیہقی ۵۰۳، ۵۰۴ مطبوعہ نو لکھنؤ ۳۷ جلد ۱

ہندی	اردو	ہندی	اردو
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناش (خراب)
ویچار	بچار	اگنی	آگ
کھتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلا مانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا ساپخ	سچ
ورشارت	برسات	کشنب	کشم (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پائین	پانی
بادر	بادل	دوہے	دہی
دُودھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھن بھن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورالملک ایک تھا اور ہمیشہ آمدورفت لگی رہتی تھی، اس لئے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رُل گئے، خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی، کہیں یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کے بولنا شروع کیا، تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاتنے والے، ایک لفظ سے

دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ،
 خاک و صول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتا، دلع
 دھبا، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رتم، کبھی فارسی لفظ میں ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے
 ہیں، جیسے جن، مجبور، یا مزدور، یعنی مزدور، لونڈی باندی (پندی، بندہ یعنی غلام)
 ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہئے کہ ان دونوں
 کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالیں جنکو دونوں نباہ سکیں

(معارف جولائی ۱۹۳۳ء)

بہار کے نوجوان

اور

ادب کی خدمت

اگر کوئی پوچھے کہ صوبہ بہار کی مادری زبان کیا ہے؟ تو جواب ہر طرف سے یہی ملے گا کہ ہندوستانی جس کو عام طور سے اردو کہا جاتا ہے، اس زبان کے عروج کا جو زمانہ دلی اور لکھنؤ میں تھا بعینہ وہی صوبہ بہار میں تھا، اور یہ بات اہل ادب میں بے تامل مانی جاتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد اس زبان کا تیسرا مرکز عظیم آباد بن گیا تھا، جو صاحبِ کمال بھی اپنے گھر سے بے گھر ہوا، اور اجڑی دلی کو چھوڑ کر نکلا، اس نے پہلے لکھنؤ میں قسمت آزمائی کی، اگر بخت نے یہاں یاوری نہ کی تو پورب کی سمت اور پڑھا، اور عظیم آباد پہنچ کر دم لیا، اگر یہاں کی آب و ہوا بھی اس کو راست نہ آئی، تو بنگال میں مرشد آباد کی طرف نکل گیا،

اس رسالہ کے کسی پہلے سالانہ نمبر میں، میں نے حضرت خندوم شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے وہ چند فقرے لکھے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے صوبوں کے قدیم بزرگوں کے دہن مبارک سے اس بولی کے متعدد فقرے نکلے ہیں، اس کے بزرگ بھی اس کو بولتے اور سمجھتے تھے، اس کے بعد جیون جیون یہ بولی ترقی کر زبان بنتی گئی، اس کی اس ترقی میں یہ قطعہ ہند بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتا رہا، اور یہ حالت

اس وقت تک قائم رہی جب تک نئی حکومت نے اس صوبہ کو بنگال میں ملا کر اس کی مستقل حیثیت کو مٹا دیا، اور بہار کے تمام دفاتر اور صیغوں میں بنگالیوں کا تقرر عمل میں نہ آیا، جو ہندوستانی کے ایک حرف سے آشنا نہ تھے، صوبہ میں ہندوستانی کے ساتھ بنگالی اور اوڑیادو اور زبانیں شریک تھیں۔

اس درخت پر دوسری کھماڑی اس صوبہ کے ایک مشہور گورنر نے ماری، جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو اور ہندی کے دو حصوں میں بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرہ کو بھی بہا دیا، ۱۸۵۷ء میں بہار و بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفاتر کا خط قرار دیا اور اسی اثنا میں یہاں بنگال کی ہمسائیگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روز افزون ترقی ہوتی گئی، تو اس زبان پر اس صوبہ میں مردنی چھا گئی، عدالتوں اور دفاتر کی ضرورت سے کون آزاد ہے، ہندی رسم خط نے عوام میں ہندوستانی رسم خط کی جگہ لینی شروع کی، اور خواہ میں جو دن پر دن انگریزی تعلیم پڑھتے جاتے تھے، وہی زبان کی وقعت گھٹی چلی گئی، یہاں تک کہ دوستوں میں خط و کتابت، گھروں میں بات چیت، مجلسوں میں تقریر تحریر سب انگریزی میں کی جانے لگی، بلکہ یہ کہنا مانع نہ ہو گا کہ وہی زبان میں بونانا و دولت اور بے توقیری کا مرادف تھا،

یہ کیفیت قریب قریب پچاس ساٹھ برس رہی، اس طویل عرصہ میں بزرگوں کی ادبی دولت برباد ہو گئی، اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا، صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی دھن نہ رہی، انگریزی اسکولوں میں جو مدرس اور ماسٹر پڑھاتے تھے ان میں بڑا حصہ بنگالیوں

کا تھا، وہ جیسی ہندوستانی بولتے تھے، اسی کے قریب قریب ان کے شاگرد بھی بولنے لگے، اگر اس عہد میں قاضی رضا حسین صاحب رئیس عظیم آباد اور ان کے ہم نشین اہل علم و ادب کا مختصر سا گروہ پنشنہ میں نہ ہوتا تو یہ رہی سہی یادگار بھی ملیا میٹ ہو جاتی،

قاضی صاحب کی ادب آفرین، اور علم آموز مجتہدین جو نوجوان آکر شریک ہوئے اس پورے پچاس برس کے زمانہ میں وہی اسلاف کی اس یادگار کو اپنے سینے سے لگا رہے، اس گروہ میں شہر عظیم آباد کے علاوہ اس کے قصبات کے نوجوان شرفا بھی برابر شریک تھے، ظہیر الحسن شوق نیوی، عبدالغفور شہباز، عبدالغنی وارثی، سید رحیم الدین، حافظ فضل حق آزاد، حافظ محب الحق وغیرہ دیہات اور قصبوں کی پیداوار تھے، اور شہر کے باشندوں میں سے دو نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، قاضی ہند حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اور حضرت شاہد ایک اور نام ذکر کے قابل ہے، وہ مولوی اعظم صاحب کا ہے جو اپنے وقت کے انشا پرداز تھے، اپنے چھوٹے چچا مرحوم مولوی ایوب ست صاحب کے ساتھ انکی سربراہی میں پنشنہ میں ہوئی، لہذا قد و گداز بدن، چہرہ پر بھری داڑھی، میرے چچا نے مجھ سے فرمایا کہ صوفیہ مشہور بہ ولایتی بیگم کے مشہور افسانہ کے اصلی مصنف یہی ہیں، چچا مرحوم بھی اسی آغوش صحبت کے پروردہ اور اسی گروہ کے ہم نشین تھے، اسی لئے اس بارہ میں ان کا بیان و ثوق کے قابل ہوگا،

دوسرا نام منشی مصاحب حسین کا ہے، یہ بھی دیہات کے باشندہ اور اسی خوشہ پرو کے ایک دانہ تھے، اپنے زمانہ میں خوب پھلے پھولے اور کلکتہ جا کر وہاں کے مشہور اخبار

اردو گائڈ وغیرہ کے مدتوں ایڈیٹر رہے، چچا مرحوم مین اوران مین برادرانہ محبت تھی، ان ہی کے ساتھ ایک دودھ ان سے ملاقاتیں ہوئیں، دپلے پتلے سے تھے، لمبا قد تھا، سیاہ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے،

یہ چند نام برسبیل تذکرہ اس لئے آگئے، کہ شاید آجکل کے ہمارے نوجوان ادیبوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے نام پڑ جائیں اور صوبہ کی ادبی ترقیوں کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کو فراموش نہ کریں،

یہ تعاقب کا زمانہ رفتہ رفتہ رخصت ہوا، اور اب چند سال سے نظر آرہا ہے کہ خود آذر کے گھرانے میں ابراہیم پیدا ہو رہے ہیں، یعنی انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جن کے ہاتھوں سے ہندوستانی ادب کا قتل عام ہوا تھا، اب ایسے مسیحا دم پیدا ہو رہے ہیں، جن کی کوششوں سے اس کے تن مردہ میں نئی جان پڑنے کی امید بندھ رہی ہے، نئی تعلیم کے تیز و تند جھونکوں نے ہماری محض ادب کی جن شہنوں کو گل کیا تھا، اب ان کی جگہ برقی قندیلوں نے لے لی ہے، جن کو اب زمانہ کا طوفان حوادث گل کرنے کے بجائے خدائے

چاہا تو اور زیادہ تیز کرتا جائیگا،

یہ پورا انقلاب میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے، حالات کی تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ ملک کے پچھلے سیاسی انقلاب کا ہے، بنگال کی شورش کے اثر سے ۱۹۱۱ء میں بہار کو بنگال سے علیحدہ کیا گیا اس علیحدگی سے بنگال کا اثر اس صوبہ سے آہستہ آہستہ کم ہونے لگا، اور خود صوبہ کو اپنی ادبی خود مختاری کا فرمان ملا، سر علی امام مرحوم کا یہ احسان وطن کی گرون

پر ہمیشہ رہیگا۔ یہ خود مختاری ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اس کے بعد ہی دنیا کے سیاسی انقلابات اور اسلامی دنیا کے تیز تیز تغیرات نے یورپ کی طرف سے نفرت اور نفرت اور وطن کی محبت پیدا کی، اس نے ہندوستانیوں کے دلوں سے انگریز مآبی کا رعب اٹھایا اور بتا دیا کہ بوٹری، شیر کی کھال، اوڈھ کر شیر نہیں بن سکتی، نہ انگریزوں کی نقالی ہندوستانیوں کو انگریز بنا سکتی ہے، اس تحریک کی آندھی نے بدیسی چیزوں کے ساتھ بدیسی زبان و ادب کے بڑا پن کا بھی خاتمہ کر دیا، اور دیسی زبان کی ترقی کا خیال روز بروز بڑھنے لگا، ملک کی بڑی بڑی سیاسی مجلسوں میں جہاں انگریزی کے سوا ہر زبان ناقابل فہم تھی، انگریزی اس طرح شہرہ رک گئی کہ انگریزی بتوں کے بڑے بڑے پرستاروں کو بھی ہندی اور ہندوستانی میں بولنے سے چارہ نہ رہا،

کانگریس، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں ہر صوبہ کے نمایندوں کو ہفتہ ہفتہ اور مہینہ مہینہ سمٹ کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جمع ہونا پڑتا اور دوسروں کی تقریریں سننی اور اپنی سنانی پڑتیں، ہر صوبہ میں کانگریس و خلافت کی شاخوں میں کارکنوں کے اجتماع اور جلسوں میں مجبوری یا شوق سے ایک ایک کو تقریریں کرنی پڑیں، جن میں غلطیوں پر ہنسی اڑائی جاتی تھی، اس لئے مقرروں کو اپنی بول چال اور تقریروں میں احتیاط کی پوری کوشش کرنی پڑتی تھی، اسی تحریک کے اثر سے یہاں اخبارات نے جنم لیا، اور اسی کے پیٹ سے رسالوں کی ولادت بھی عمل میں آئی،

اس طوفان کا دائرہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، دوران تک بھی پہنچ گیا جو اس بادِ موسم سے

پوری حفاظت کے ساتھ بچا کر رکھے گئے تھے یعنی انگریزی اسکول اور کالج اب انگریزی خط و کتابت، اور تقریر و تحریر کا امتیاز کا نشان اور غرور کا سامان نہیں رہی اور لوگ اپنی دیسی زبان سے محبت کرنا یہ سیکھنے لگے، مادری زبان کی تعلیم کا مطالبہ روز افزوں ہوا، اور یونیورسٹیوں کو بھی اس سخت مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا، بلکہ خود صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی بعض کمشنریوں میں ہندوستانی رسم خط کو اس کی جگہ دینی پڑی، یہ معمولی سی مثال اس اصولِ فطرت کی ہے کہ ڈھونڈو تو پاؤ گے اور ٹھٹکھاؤ تو کھولا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ ہم اس اصول کو بار بار آزمائیں اور اس وقت تک دم نہ لین جب تک ہندوستانی زبان اس ملک کی عام زبان اصولاً اور عملاً تسلیم نہ کرنی جائے، اب یہ صوبہ اور بھی خالص ہو رہا ہے اور لوگ گردن سے تلی کھوٹی جا رہی ہے یعنی اڑیسہ بہار سے الگ ہو رہا ہے، اور اب اس صوبہ میں صرف ایک زبان جس کا نام ہندوستانی ہو جاتی ہو گئی ہے،

اب توقع ہے کہ اس صوبہ کے باشندے یہ مطالبہ کریں کہ چونکہ اب اس صوبہ کی زبان خالص ہندوستانی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ حکومت اب اس کی تعلیم و اشاعت پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرے،

اس سلسلہ میں ہم کو غور کرنا ہے کہ اس کو صوبہ کی عام اور مقبول زبان بنانے کے لئے کیا کیا تدبیریں عمل میں لانی جائیں، ہر دست حسب ذیل صورتیں ذہن میں آتی ہیں،

۱۔ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتبوں اور پائٹ شالون میں اس کو مناسب جگہ دیا جائے، اور اسلامی مکتب گانوں گانوں کھولے جائیں، اور اس کے لئے دیہاتی

رقبون کے مسلمان خاص کوشش کریں،

۲۔ اسکولوں میں اس کی تعلیم باقاعدہ ہو، اور اس کے لئے اچھے معلم بہم پہنچائے جائیں،
یعنی جو صحیح لکھ سکیں اور بول سکیں،

کیا یہ سنکر آپ کو انوس نہ ہوگا کہ پورے صوبہ میں انٹرنس کے امتحان میں ہندوستانی کی
۵۰۰ جوائی کا بیان بھی شکل سے ہون گی،

۳۔ یونیورسٹی نے اردو کا اعلیٰ امتحان کھولا ہے، مگر اب تک اس کا معیار اور تعلیم بلند
نہیں، یونیورسٹی کو مجبور کرنا چاہئے کہ اس کے لئے لائق پروفیسر مقرر کئے جائیں،

۴۔ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہئے کہ اس زبان کی بہترین کتابوں پر سلا
الغام دے،

۵۔ وکیلوں اور مقدمہ بازوں کو چاہئے کہ ہندوستانی کے فارمون کو استعمال کریں
اور اسی زبان و خط میں تحریریں داخل کریں،

۶۔ صوبہ کے مشورہ شہروں اور قصبوں میں اس زبان کے لکھنے والے اور قرائت خانے
ریڈنگ روم، بکسٹریٹ قائم کئے جائیں،

۷۔ ہر جگہ اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کے لئے چندہ سے دارالمطالعہ کھولے جائیں

۸۔ مدرسوں، اسکولوں، اور کالجوں میں ہندوستانی زبان کی علمی وادبی مجلسیں بنائی
جائیں جن میں طالب علم ہندوستانی میں تحریریں لکھ کر سنائیں یا تقریریں کریں،

۹۔ ہر سال صوبہ کے طالب علموں کا ایک مقابلہ کا جلسہ ہو، جس میں اس زبان کے

سب سے اچھے بولنے والے کو انعام دیا جائے،

۱۰۔ صوبہ کی عام زبان میں جن غلطیوں کا علانیہ ارتکاب کیا جاتا ہے، ان کی تصحیح

کی جائے، اور اس پر رسالے لکھے جائیں، جو عام طالب علموں میں تقسیم کئے جائیں،

۱۱۔ صوبہ میں اعلیٰ تصنیف و تالیف کے لئے خواہ دارالمصنفین کے طور پر یا ہندوستانی

ایک اڈائی کے اصول پر ایک ادبی ادارہ قائم کیا جائے،

۱۲۔ ڈاک خانہ کے ہندوستانی فارم خصوصیت سے استعمال کئے جائیں، اسی طرح

پکھریوں کے وہی فارم لئے جائیں جو ہندوستانی میں ہوں،

اس اظہار میں ہم کو خوشی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس برس کے عرصہ میں ہندوستانی

نے اس صوبہ میں گوکیت کے لحاظ سے نین مگر کیفیت کے لحاظ سے خوش آئند ترقی کی ہے،

غلیان کم ہو رہی ہیں، لہجہ بدل رہا ہے، نوجوانوں میں مضمون نگاری، شعر و سخن، اور

تقریر و خطابت کا چرچا ہے، قافلہ جیب رخت سفر باندھ کر صبح کو روانہ ہو تو وہی وقت ہے

کہ وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ جس راہ پر وہ قدم رکھ رہا ہے وہ منزل مقصود تک سیدھی جاتی

ہے، یا نہیں اس وقت ہمارے کاروانِ ادب کے لئے وہی وقت ہے،

زبان کی صحت | سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر زبان کی صحت پر نظر رہے، اس کے لئے

خاص کاوش کی جائے، اور تذکرہ و تائید اور صحیح روزمرہ کا دھیان رہے اور بعض دوسرے

صوبوں کی طرح اپنی غلطیوں پر ہٹ دھرمی نہ کی جائے، اس میں شک نہیں کہ ہمارے قدامت

کے بہت سے پرانے لفظ بولے جاتے ہیں، جو اب متروک ہیں اور ان میں کھٹو اور دلی

کی تقلید چندان ضروری نہیں لیکن ہمارے ہاں اصل غلطی یہ ہے جو زیادہ تر دیہاتوں میں ہے کہ کسی ایک لفظ کی تذکیر و تائید یکساں نہیں رہنے پاتی، ایک ہی فقرہ میں ایک لفظ ابھی مذکر استعمال ہوا، تو ابھی مؤنث ہو گیا، اگر پابندی کے ساتھ ایک لفظ کو مذکر یا مؤنث ہمیشہ یکساں بولا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ اس دیار کی زبان میں یہ لفظ مذکر یا مؤنث ہے جیسا کہ دلی اور لکھنؤ میں بہت سے لفظوں کی تذکیر و تائید میں اختلافات ہیں، اور یہ زبان کا عیب نہیں،

شعر و سخن | شعور سخن کا عصر جدید ہمارے صوبہ میں بھی پیدا ہو گیا ہے، اور بعض اچھے اچھے شاعر اس میدان میں کمال کا جوہر دکھا رہے ہیں، ہمارا بوڑھا لیکن ہمہ دان شاعر فضل حق آزاد ہمارے صوبہ میں اس عہد جدید کا بانی ہے، معاصرین میں تنہا پھلواروی، فہون بخنوری میں کامل ہیں، ڈاکٹر عظیم الدین کا تخیل بڑی رفعت رکھتا ہے، نجم گیلانی اگر توجہ کرتے تو شاعری کے آسمان میں ستارہ ہو کر چمکتے، رسا ہمدانی نے بھی طبع رسا پائی ہے، خود ہمایہ دوست و رفیق درس نجم صاحب کسی سے کم نہیں، مگر کاروباری طبیعت نے ان کی شاعری کو بھی کاروباری بنا دیا ہے، یعنی مجبور ہون گے تو کہیں گے ورنہ نہیں، نوجوانوں میں رضی عظیم آبادی، صبار شیدی، نجم ندوی وغیرہ ابھر رہے ہیں، مقصود ناموں کا گنا نہیں، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ طبیعتیں آمادہ ترقی ہیں، رضی صاحب کو اگر خدا نے موقع دیا تو وہ شاعر فطرت ہون گے،

ضرورت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء ان بے راہیوں سے بچیں جنہیں اس عہد

کے دوسرے صوبوں کے نوجوان شعراء مبتلا ہیں، ایک یہ کہ کلام کی اشاعت میں جلد بازی اور عجلت سے پرہیز کریں اور بار بار کی نظر سے جب تک صحتِ لفظی و معنوی کا یقین نہ ہو جائے اس کو منظر عام میں پیش نہ کریں۔ ہو سکے تو پرانے عہد کے ممتاز شعراء سے اصول فن کے نکتے سیکھیں، فن سے جہالت نوجوانوں کی عادت بن رہی ہے، سطحی اور عریان جذبات کے اظہار میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے،

فارسی ترکیبوں کا استعمال اعتدال کی حد سے زیادہ نہ ہو، پھر یہ لحاظ رہے کہ جوئی ترین کیمین پیدا کیجائیں وہ فارسی کے محاوروں کے مطابق صحیح بھی ہوں، اچکل کے نوجوان شعراء جو لفظی شان و شکوہ کے طالب ہیں، فارسی کا صحیح علم نہ رکھنے کے سبب ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جنکو سنکر علم و دانش کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے،

خوشی ہے کہ صوبہ میں مضمون نگاروں کی تعداد کم نہیں، مگر یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اسی وبائے عام میں مبتلا ہے جس میں دوسرے صوبوں کے نوجوان اہلِ قلم مبتلا ہیں، سطحی باتیں، پست خیالات، تفریحی مشاغل، بیسود مباحث، نصب العین سے دور ادب لطیف سے میرا اور ادب عالی سے معرا، سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے کچھ بنیادی اور اصولی خیالات ہوں جنکو عمدہ اور دھچپ پیرالون میں، معلومات سے مدلل اور واقعات سے مبرہن کر کے پیش کیا کریں، ہر تحریر سبق آموز، اور ہر بیان دماغ افروز ہو، جس کے پڑھنے سے ناظرین کے علم میں اضافہ، دانش میں ترقی اور خیال میں وسعت پیدا ہو، صوبہ میں اس حیثیت سے پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر نجیب اشرف، ڈپٹی ولی امر

وغیرہ ہر حیثیت سے معتقد ہستیاں ہیں اور ان سے مستقبل کو بڑے بڑے توقعات میں عبدالمکات صاحب آرومی بھی اس فرست میں ہیں، بشرطیکہ ان کو ان کے حوصلہ کے مطابق منافع حاصل سکے، نوجوان علما میں سید محمد طہ اشرف (امتھو گیا) مسعود عالم ندوی اور محمد نظام ندوی اور دوسرے ندوی وغیرہ مستقبل میں چمکنے لگے،

لیکن نظر آتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں دوسرے صوبوں کے ان شاعروں اور نثاروں کی تقلید کا عیب پیدا ہو رہا ہے، جن کو عوام کے طبقہ سے واہ واہ کی دادیں ملتی ہیں، ہمارے شاعر ان گویے شاعروں کی تقلید میں ہیں جو جگہ جگہ گا کر اپنے نام و نمود کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ موسیقی کے جادو سے اپنے کلام کا عیب دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دیں، ہمارے نثاران بے مقصد نثر نویسوں کی نقالی میں لگے ہیں جن کی تحریریں نوجوانوں کی عقل میں شورِ تحسین برپا کرتی ہیں، زندگی اور زندگی کے مشکلات واقعہ ہیں، ان واقعات کی تلخی کو لفظی شراب اور معنوی شراب کے نشہ سے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہی، بہادر وہ ہیں جو واقعہ کو واقعہ سمجھ کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں، اور کامیاب ہوتے ہیں وہ نہیں جو ان کو بھلا کر غم غلط کرنا چاہتے ہیں،

اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب و صاحب قلم و شاعر اس کو سنکر برا مانیں، لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے خلوص سے لکھا گیا ہے اس لئے امید ہے کہ نوجوانانِ سعادت مندرجہ آفتاب کی طرح راقم کو بھی معاف فرما کر ”پند پیرانہ“ پر توجہ فرمائیں گے،

(ذی قعدہ ۱۹۳۵ء)

سفرِ گجرات کی یادگار

جولائی ۱۹۳۳ء میں بڑودہ کی مجلسِ سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عربی جو علماء دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے وہ پہلے یہیں اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے، ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سینکڑوں دیہات حرمینِ محرمین کے مصارف کے لئے وقف تھے، دوسرے ملکوں سے جو نامدار اور تحفہ خیزین یہاں آتی تھیں وہ پہلے یہیں پہنچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علماء، امراء، اور عام مسلمان اسی راہ سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیوا جی کی سیاسی کشمکش کا میدانِ جنگ یہی خطہ تھا اور اس لئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بن جاتا تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال ادھر کا رخ کرتے تھے،

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندوؤں کی کثرت، زور و قوت، درسیلاب تمدن میں غرق ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستان خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لئے یہاں کے دیہاتوں اور قبضوں میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی سلطان عالمگیر کی دور بین نگاہوں سے ان وجوہ و اسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علما، صوفیہ اور مذہبی معلمین کی قطار در قطار آباد کر دی، مؤذن، خطیب، امام اور ملا، جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے، موروٹی مقرر کر دیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک ان کے خلفاء کے قبضہ میں ہیں، وہاں کے دیہاتوں میں جن تک ان ہی ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے، یہاں تک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرنا چاہتا ہے، تو یہ خون ان ہی کے ہاتھوں سے کرتا ہے۔ یہاں اب بھی آپے سیکڑوں ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو ان ہی مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقات دیئے گئے، جن پر وہ آج تک قابض ہیں اور ان ہی کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں،

بھڑچ | بھڑچ جس کے کنارے دریائے زہدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحر عرب میں ملتا ہے، عربوں کے جنگی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروہس کہتے ہیں، ۱۲ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا،

ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آکر لگے تھے، سفر کے آثار میں جب میں بھڑچ پھنچا اور زبرد
 کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو تھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں
 کے سامنے کر دیں، اور گوین شاعر نہیں، تاہم جذبات کے تلاطم نے موزون ترانہ کی شکل
 اختیار کر لی،

نرید اے نرید! اے جادہ بھر عوب	گر چہ تو ہندی ہی، لیکن زادہ بھر عوب
جانتا ہی تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز	تیرے دروازہ پہ ٹھہر تھا مہلا جہاز
تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے	ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتہ ہند و عرب تجھ ہی ہوا تھا استوا	تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہی اسکی یاد گار
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو	چار صدیوں تک ہا اسلام کا دمساز
آج کس کو یاد ہو وہ داستانِ پاستان	تیرے ساحل پر جب اتر تھا عوب کا کاروان
تو ہر دریائی پری یا شاہِ عالم ہے تو	اس سمندر کے گھلے کی شہِ رگِ عظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سرشار جام	اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑنا کج کام
اے بھڑچ! اے خاتمِ گشتِ دُورِ نرید	عہدِ مہنی کی تری عزت رہی باقی سدا
تو تیا ہے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہے	ذرہ ذرہ پر تو نورِ شید ذی لولاک ہے
یادگارِ عہدِ خیرِ القرن ہی تیری زمین	مطلعِ انوارِ ذی التورین ہی تیری چین
چشمِ عبرت کی نگاہیں جبے ہی نہ ٹھٹھیں	تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطرین

یہ ترانہ مالِ سراورِ رزم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھرن

بھڑوچ کا ایک پرانا | بھڑوچ میں عہد عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو میان مندر قضا
خاندان پر مشتمل تھا، اس خاندان کے موجودہ چٹم و چراغ جناب قاضی نور الدین

شیرازی صاحب ہیں، لب دریا ان کا فضیلت کدہ یادگار زمانہ ہے، ایک موروثی
کتب خانہ ان کے اسباب زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب
موجود نہ تھے، اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کر سکا، مگر میرے ایک عزیز نے ان کا
کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسب ذیل چند نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

اس خاندان کے چند نوادر کتب | (۱) شرح ثنوی مولانا روم (۹) جلد پنجم، آخرین ہے،

”ذوالقعدہ ۱۰۵۸ھ میں بسنت رائے نے قصیدہ مچھڑ ہٹہ سرکار خیر آباد میں تحریر کیا“

(۲) حقائق السحر فی دقائق الشعر، مولفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری المعروف برشید

وطواط، آخرین ہے،

ثم الكتاب بعون الملك الوهاب وحسن توفيقه على يد العبد الضعيف

محمد الحافظ الاهروى، تحريراً في يوم الاثنين، ثانی عشر من ربيع

الاول سنة اثنين وستين وثمانمائة الهجرية النبوية

بدار السلطنة شیراز بزمان قید،

(۳) المحيط للسخی، جلد ثانی، جمع الامام المام مولانا رضی الدین محمد بن محمد بن محمد بن خسی

المحقی، آخرین ہے :-

لہ یہ کتاب ایران میں چھپی ہے، اور ملتی ہے،

كان الفراغ من كتابته في يوم الرابع ذوالقعدة سنة ١١٢٥، كاتب على
ابن علي بن رمضان العبادي الشافعي الزهري،

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یا قوت مستعصی نے اور اس نسخہ سے حکم جہانگیر سید جلال لدین
بخاری نے اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین، بن سید احمد حسن رضوی نے ۱۲۱۹ھ
میں نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی، شرح مشکوٰۃ فارسی، از کتاب الزکوٰۃ، تاکتال البیوع
دوسری، تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحہ اول مطابقت، تقطیع کلان، اس پر خواص خان غلام فرخ سیر بادشاہ غازی
کی ۱۲۵۵ھ ہے،

ابو معروف حسین ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دارالارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے،

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاویٰ) مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری، ناقص
از وسط، تقطیع کلان، مختلف نسخ شدہ ہمرین ہیں، آخرین ہے،

ثم کتاب الخلاصۃ من املا الشیخ محمد بن محمد بن نصر المدعو

بحافظ البخاری علی ید افقر عبیدہ محمد المدعو اصفی الدین بن

محمد الخلیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد، فی دولة

الملك محمد بن مراد بن سليم بن سليمان، بن سليم بن بايزيد
من شهر سنة ثلاث بعد الف سنة نقل من نسخة
تاريخها يوم الجمعة العشرين من شهر ربيع الاول سنة ثلاث
وتسعين وستة مائة،

(۴) مجمع البحرین، ترجمہ اپنکھت پرم ہنس "ازا تھرن وید فارسی، شاہ سرمد نے ۱۳۴۶ء
میں سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب مندرام ولد انت رام خط فارسی نستعلیق، ۱۳ x ۸
تقطیع، صفحات ۸۲،

ہندوستان کی سب | قاضی صاحب کے عزیز خاص جنکو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب
پرانی بھدرن کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، ان کا دو لکندہ بھی گزشتہ جاہ
جلال کا کہنہ مرتع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیرکرائی، انکی
عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر ۱۳۴۳ء کا یہ کتبہ لگا ہے،
”هذه العمارة القدیمة فی شہور سنہ“ اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ
بعد کو لگایا گیا ہے، بہر حال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس
صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملہ
بگرات سے چند سال بعد کی ہے جو بہر حال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہان کی سنگی جامع مسجد
اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ ۱۳۵۵ء ہے، بعد کو محمد تفلک کے عہد میں ۱۳۵۸ء میں دروازہ

کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

”در عهد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدین محمد تغلق، مقصد و بست و یک“

غائبان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی، انکشتور کا ایک خاندان [بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکشتور نام ہے جو سور کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے، خاندان کے بانی شاہ عبد العظیم صاحب دین، جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۵۵۷ء میں انھوں نے وفات پائی ہے، ان کی خاتواہ و مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حمید علی غلام علی انعام دار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں،

اس خاندان کے چند عربی کتابوں میں سب سے نادریز یہ بیان قدیم طب کی ایک کتاب نوادر کتب [تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۱۱۷۷ھ ہے، نسخہ بخط عرب

شیرہ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے،

حقہ کی تاریخ | یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ ”نانو بنی“ کے الفاظ سے نکالی گئی جس سے ۱۱۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے رستے

سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے،

بنائے سورت کی تاریخ | گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحر عرب سے جا کر ملتا ہے، دریا سے تپتی ہوئی اس کے ایک کنارہ پر شہر سورت آباد ہے اور دوسرے کنارہ پر راندھیر پہلے بحر عرب میں جانے والے ہما زون کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۷ھ نظر آئی، تاریخ کا مہر ع یہ تھا، ع

باد آباد بندر سورت

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس فتح کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی، بنا کر مسجد بجائے کنشت برالو انش انا فتحنا نوشت ۱۰۹۰ھ

راندھیر کی پرانی مسجد | چند دوستوں کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دو متمند ویتدار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت، اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں پورے ہندوستان میں کمین نہیں آئیں، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد جو نادوارہ ہے، یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گوشتی مسجد علی و درباب شریف ۷۹۵ھ

گر کے پرسدز تو نافع ازین مسجد شریف

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دین جنہیں سے
درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں،

لغت عربی و ہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا جس کے شروع کے
چند شعر یہ ہیں،

الحاق آفرید سر جہا	اللہ خدا ہے کرتار
الاحق نادان گنوار	الدنیا کہتی سنار
السمو دوزخ مرگ	الجدت بہشت سرگ
الشعر موی کیس	الیوم روز دیس
القول گفت بات	اللیل شب رات
السبع ہفت سات	السبیل راہ پاٹ
الموضع دیہ گاؤں	الاسم نام ناؤں
المقار جائیگہ ٹھاؤں	الظل سایہ چھاؤں
العشرین بست بیس	الراس سر سیس
الحیہ ریش پانکھ	العين چشم آنکھ
الورق برگ پان	الاذن گوش کان
السمم تیر بان	الطعام خوردن کھان

آخری حصہ۔

الفرح خوشی بلاس	القنوط ناامید نراس
الفخذ ران تہی جانگ	الجسم تن ہے انگ
المورد آب خورا دہارہا	السمی افسانہ پوارا
الکدر یترہ گد لا	القییم نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،

اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت میں ہے، مگر وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں،

الاحلہ پرستیدہ پوجیا	المعلوہ دانستہ پوجیا
المحمد ستودہ بکھانیا	المعروف شناختہ پچھانیا
الرسول فرستادہ بھجیا	الواضح روشن سنجیا
الاحل دودمان کنبہ	العنقود خوشہ لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں،

رسالہ فقیری چار پیر | اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

”بدانکہ بوجھ توں یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا
چودہ خانوادہ

ہے، بایر پوچھے دیکھے وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال۔ اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ

یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کبلی فقیری کیا ہے، اور قلمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے کئی صفحے ختم ہوئے ہیں تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے،

رسالہ فقہ ہندی | یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہیں،

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہاں لائق حمد ثنای کے اور نگو نہ جان

عالم شریعت نال وی بھیجا پاک رسول جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول

یار رب اپنے کرم سون بیج بھیج درود بنی محمد مصطفیٰ تسون ہوں خوشنود

پیچھو ان کی آل پر اور اصحاب تمام شس پیچھو احباب پر بہت درود سلام

کیئے مسئلے دین کے عبد رکھے میں فقہ ہندی زبان سے بوجو کر و یقین

مطلب مسئلے پوچھنا جو کچھ ہوئے زبان عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں خاتمہ میں

تصنیف کا سال ۱۰۸۵ھ بعد اور نگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ میں ہے،

فقہ ہندی کوں مومنوں کو زبان پریا مسائل آوین دین کے کبھو نہ ہوئے فنا

سنہ ہزار چہتر بیچ ماہ رمضان تمام اور نگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن

کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی

کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت | اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے، مصنف کا نام بدیع الدین ہے
ماہ رمضان | شروع کے شعر حسبِ ذیل ہیں،

سرنامہ از نام سبحان لکھوں کہ دل کی ورق پر سچل کر رکھوں
زبان کو ہے جو ہر اسی کی ثنا اسی کی سو قدرت ہو جگ میں عیاں
کریم و رحیم و وہ غفار ہے کرم عاصیاں پر کر مہار ہے
زہر حیر اس کی صنعت کا بیان کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما
آخر میں لکھا ہے،

کرو اسکی سب نعمتوں پر شکر مصیبت کے اوپر حکم ہے صبر
کہ تا عاقبت تیری ہوئے بھلی کہ شادی و غم جگ میں جئے چلی
بدیع الدین تعریفِ علی کی کرو کہ چھوٹک کی جسین توقع دھڑ
اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبین، اور قافیوں میں صرف صوتی ہم رنگی ہے
عربی الفاظِ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے، جس طرح ہندی میں بولے جاتے ہیں،
داستانِ قیامت | اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہر مارجوں گل بوستاں نصیحت کی باتاں سنو دوستاں
باسی مسماں کھاتے ہیں دست کہ کھاتے ہیں سب گائے بکری کا گوشت
باسِ شریعت کریں تن منین شریعت کی باتاں نہ کچھ من منین
بڑی ریشِ تسبیح خوشس پیرہن بھری دل میں کیوں بھانکے مکروں

آخری شعر میں اس نظم کا سال ۱۰۴۷ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایک ہزار و ستو تر نے سو لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتایا نوح غزہ میں ماہ بیر با تمام آل شد مدد و ستگیر

فقہ بین | یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے، آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بنام پاک رب الغلین سوں شروع کرتا ہوں میں فقہ بین سوں
بحق مقرر و مستبول مرسل سہی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل
مسائل فقہ کے بین اصل ایماں جو میں بوجہ سو وہ کیوں ہو مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ۴۰ مآخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل پھر طہارت، وضو، غسل وغیرہ، اس کے آخر میں بدعت کا رد اور جوئے کی برائی ہے، آخر میں ہجرت

یقین فقہ اہل کوں کرتے مخموم بحق دیں پناہ آل معصوم
صد ہشتاد و دو والف ہجرت بتایا نوح ہمایوں گشت تمت
اگھیا راسو میں اسی او پر دو سنہ ہجری نبیوں کے بتایو

رسالہ کے آخرین خاتمہ کی عبارت ہے،

”نحو قوت دین فقہ لہین تصنیف حضرت شاہ قسین رحمۃ اللہ علیہ“

اس سے مصنف کا نام شاہ قسین، کتاب کا نام قوت دین فقہ لہین اور تصنیف کا سال

۱۰۴۷ھ معلوم ہوتا ہے،

مثنوی کتھائی کسی رحم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے، وزن سے حرفوں کا گرنا، اس وقت
محبوب نہ ہوگا،

وفات نامہ حضرت نبیؐ آغاز:-

بنا اول کروں حمد خدا میں زبان او پر پس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت
بیچ کا ایک شعر ہے جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،
مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں بنا بھر نبی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہی
قصہ بانو | اس شہنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے، جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ
پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنو کان دھر اول فارسی تھی یہ دکھنی دگر
اتھا گودڑہ ایک شہر کا جو نام ہمیشہ مستح کا تھا واں مقام
بٹھے ایک دن اس جہنم مسجد منے اتھے خرد و بزرگ اوسارے بنے
وُتے میں مسافر نیا آن کر سلام علیک کہہ کے ٹھیک مگر
پوچھے رہنے اسکو توں کاں سو آیا شہر ہے دور ہے نام محمد جیا
لگا بونے کوں اوپوں سُنکے بات زینجا کا قصہ اونوں کے سنگات
مگر ساری مجلس نے سنکر کلام لگے بونے آفرین سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے، آخر میں ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زبان کہاں تک تو لکھیے اسکے بیاں
 زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ، خاص لحاظ کے قابل ہیں، ”تھا“ اور ”تھے“ کی جگہ
 ”اتھا“ اور ”اتھے“ اور ”کی جگہ“ ”میں“ ”کہاں“ ”کی جگہ“ ”میں“ ”وہ“ کی جگہ ”او“
 قصہ سوداگر عجم | یہ نظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان

میں ہے، آغاز اس طرح ہے:-

سنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں دروداں حمد کے پچھوں حکایت اک کہوں
 دروداں مصطفیٰ او پر دل جاس میں میں پڑھتا
 عزیزاں تم سنوں سکوں کھوں ل کون تیں حاضر
 آخر میں تاریخ ہے،

گھیارہ سواۓ پر چھپن برس گذرے تو تھی حیرت کے
 صفائی باطنی ہوئے اسے اور حضرت میراں
 تھی تصنیف میں آئے خواہد پیر حضرت کے

خاق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خاق باری کی تاریخ ایک نیا سما ہے۔
 اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشور ہے لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں
 شک ہے، ثجب کی بات ہے کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کے تھانہ
 میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں، اس سالہ تاریخ سے گو معتر ہے، مگر اس کے
 منتعلق حضرت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسو برس سے زیادہ عمر کا نہیں،

خاق باری کے پہلے شعور کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے، جو ”یا“ بڑا

پڑھا جاتا ہے، ع

واحد ایک، بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ تصنیفات خسرو مین جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ ”بدا“ چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے ”ع“ لکھا گیا ہے، لیکن عربی میں ”بدا“ کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے فاضل ہیں، اسکی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا، لیکن یہ بھی مغل ہے، بعض مطبوعہ نسخوں میں ”خدا“ چھپا ہے، اور شاید یہی صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ میں اول تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضماں میں قدامتِ زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے،

چوں بہ پرسی خسرو پرہ کیست، جو کا بھائی ہے	در خسرو پری جو کا باپ جن دی جانی ہے
ریخت اندر گوش خود سیما بی بورا بھیا	پنبہ پیک وئی گالا، جہم تن آمد - کیا
وان نہائی بستر و بالین تیکہ لے جواں	غلط بالا - لیٹ اوپر - اُس بچھاؤ، گستر

حسب ذیل شعر ایشیا تاک سو ساٹھی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر ۸۸ میں اس

طرح چھپا ہے،

عطشہ چھینک، شاخ سینک، کفش گرہے کفش دوز

گا ذر و خیت طہر دھوبی و درزی جامہ دوز

”نہم بُہد۔ رانی گلے پیچھا سنے“

اس قسم کے اختلافات اور جی نہیں گئے لیکن ہم تہذیبِ انیمیر کا معاملہ ہے، مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانہ نابعد کی انیمیرین کردی ہیں، مثلاً قدیم توں کی جگہ جدید توں بہت پرانی زبان میں منکم ہوں، تھا جواب بھی ہونا سے واحد منکم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ^{رحمۃ اللہ علیہ} نے میں پیدا ہوئے اور ^{رحمۃ اللہ علیہ} میں وفات پائی، اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ^{رحمۃ اللہ علیہ} میں وفات پائی ہے، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون ”ہندوستان میں ہندوستانی“ کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں واحد منکم اور واحد مخاطب کی ضمیرین ”ہوں“ اور توں استعمال ہوئی ہیں، بعینہ یہی دونوں ضمیرین پیش نظر نسخہ میں ہیں، مثلاً

خواہم گفت کہوں گا ہوں	خواہم کرد کردوں گا ہوں
خواہی آمد آویگا توں	خواہی نشست بیٹھیکا توں
خواہم دید دیکھوں گا ہوں	خواہی دید دیکھے گا توں
خواہم داد دہوں گا ہوں	خواہی داد دیویگا توں
خواہم دوید دوڑیگا ہوں	خواہی دوید دوڑیگا توں

مطبوعہ نسخہ میں ”ہوں“ کی جگہ ”میں“ اور توں کی جگہ ”تین“ ہو گیا، سفرِ گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں مگر دیکھتا ہوں کہ یہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو رہا ہے، سفر ناظرین کے ملال راہ کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ میں روک لی جاتی ہے،
(معارف ستمبر ۱۹۲۷ء)

بعض پر لفظوں کی تحقیق

”ہندوستانی ایچاڈی کی ادبی کانفرنس آباد ۱۹۳۳ء میں پڑھا گیا“

نعت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے، زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے، اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ تاریخ ہمارے نعت کا بڑا اہم باب ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کی طرف ابھی تک ہماری زبان کے نعت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے،

قوین اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں، اور ان کے واقعات کو کتنا ہی اٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت دار کی طرح پھل روتا کا ریکارڈ یا اسل ہمارے لئے تیار رکھتا ہے جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ اگر ہم یہ جانتا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں، تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لئے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا،

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں، اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سننے کے لئے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جنکو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہیں،

ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکون سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے قابل نیک بن سکے،

وام۔ ہماری زبان کا ایک پامال لفظ وام ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں، جسکی ایک ذیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھے اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے آج سے دو ہزار برس پہلے ہم کو لوٹ کر جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے، مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم (DRACHMA) تھا، اسنے عربی میں درہم اور فارسی میں سہری ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ہندوستان میں ایک ٹا درگر اور اسکی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر درم ہو گیا، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکے کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طبین دواؤن کا وزن درہم، اور فارسی طبین درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو درام ہو گیا، جو اب ہمارے انگریزی طبی کا بھون دواؤن

اور شفا خانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے،

ی
اکبر کے زمانہ میں ام چاندی کے سب سے چھوٹے سکے کے بجائے تانبے کے سکے کا نام تھا، (صفحہ ۱۰، نوٹس) اسکو پہلے پیسہ کہتے تھے، اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپے کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصہ کو چھتیل کہتے تھے، اب اس کو گندہ کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے، (صفحہ ۱۲)

اسی تقسیم سے ایک محاورہ یورپ کی زبان میں اور چلا ہے، ہر گانوں یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ آنے فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں ایک دام کا آدھا ادھیلہ اور اربع پاؤلہ، اور ارہ ڈٹری کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ جو دام قیمت کے معنی میں ہم بولتے ہیں، وہ اسی سکے کی یادگار ہے، جس سے پہلے چیزوں کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چالیس دام (پیسے) تیار ہوتے تھے،

تعلقوں کے زمانہ میں "درم سنگ" خرید و فروخت کی تول میں باٹ کے معنی میں

بولاجاتا تھا، (فیروز شاہی ضیاء برنی ص ۳۱۹)

کیرانت اودھ کے دیہاتی کاغذون میں ۱۶ آنے کی تقیم آنون پر اور آنون کی پائیو پر اور اس کے بعد کیرانت اور جو پر ہوتی ہے، لفظی بہروپیوں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو سکتی کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے، ایک عربی وینا میں ۲۰ یا ۲۴ قیراط ہوتے تھے، عربی میں قیراط یونانی سے آیا ہے، آج کل انگریزی میں یہی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے، اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیور اور چیزوں میں اسے کیرٹ گو لڈ کی اصطلاح کا عام رواج ہے۔

اشترنی درم اور قیراطیں طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں اسی طرح ہمارے سے قیمتی سکے اشترنی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکے سب سکون میں منت ہے، اس لئے اشترنی کہلایا، مگر فقہ ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ سکے اشترت نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہو، وہ اشترت تھا،

طلائی سکے کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے، مگر چونکہ عربوں میں یہ سکے جاری تھا اس لئے انھوں نے عبد الملک کے زمانہ میں سکہ یا سکہ میں جب اپنا طلائی سکے ڈھالا تو اس کا نام دینار ہی رہنے دیا، جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار

لے سان العرب لفظ قرط ج ۹ ۱۵ جرجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے، تاریخ تمدن اسلامی

ص ۱۱۹ ج ۱ ۱۵ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸

بھی ان کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج وقت کے ساتھ چند "دینا سرخ" رسی طور سے جاری ہے؛

تغلق کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکہ زر، یہ تنکہ سکہ معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا، (برنی ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵) اور اسی سے تتواہون کی تعیین ہوتی تھی، پیادے کی ماپانہ تتواہ ۴ تنکہ اور سوار کی ۸ تنکہ تھی، (برنی ص ۳۱۹) مخدوم زادہ بغداد کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا، (برنی ص ۴۹۶) مصری خلیفہ کا سفیر حلیہ محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو چند طبقہ پر از تنکہ زر و فقرہ برآں نثار شد (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکہ زر بولا جاتا تھا، غلی کے زمانہ میں ایک تنکہ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکہ فقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱) روپیہ کو تنکہ فقرہ، اور اس سے کم درجہ سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے (دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف)

خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج "ٹکے" کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؛
دوسرا لفظ مرز ہے، اس کو مر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نام نقش ہوتا تھا ہنر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے،

لے ڈاکٹر تاجہ صاحب نے بتایا ہے کہ تنکہ سنکرت میں سکہ کو کہتے ہیں،

سلطان محمد مرہٹس پیدا اور دوسرا نداد کہ مرہٹس دا خرید و فروخت چنانچہ مرہڑو

نقرو جاری است، (ص ۴۷۵)

یہی مرہڑو اکبر کے زمانہ میں بھی زبان و قلم پر تھا، آئین اکبری میں اکبری سکون کے بیان میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، (ص ۱۷۷) اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لئے سہنسہ، رہس، آتمہ، چگل، بعل، جلائی، آفتابی وغیرہ الفاظ بنائے اور چلائے، مگر مرہٹا نقش بھی مٹا نہیں، بلکہ پرانی شاہی اشرفی کو آج بھی مرہٹے کہتے ہیں،

دکن میں طلائی سکے کا نام "ہون" تھا، جو آخرین مخففت ہو کر بن ہو گیا، اور آج بہار زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں "بن برسنا" ایک یادگار رہ گیا ہے، روپیہ کا لفظ اور سکے شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجیب نہیں ہے کہ روپا سے بنا ہوا سونے کے سکے کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نور الدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں جن گنگو بہنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے :-

۲۷۴
"زنجیر را در گردن ظریف ملو از اشیاء فی طلائی و طلا سے غیر مسکوک وید" (فرشتہ نوکلشوی)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ مسلمانہ سے ۱۵۳۳ء تک ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات و دکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ہندوستان وارد ہوئی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ سونے کے سکے کے لئے افریقہ کی طلا خیز اور زریز زمین ہی سب سے زیادہ موزون ثابت ہوئی ہے، انگریزی گنی کا مولد افریقہ کا ملک گائنا یا گنی قرار

پایا ہے جس کو عرب غانہ کہتے تھے اور بلاد التبر (سورنہ کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے،
اور وہیں سے سونا لاتے تھے، وہم پہنچتا ہے کہ غانہ کا تعلق عربی کے غنی اور غنا سے تو نہیں؟
بہر حال ہماری اشرفی کا مولد و منشا بھی ہندوستان نہیں، بلکہ ایشیا بھی نہیں، افریقہ ہی کا ایک
گوشہ ہے، مگر دوسری طرف کا یعنی مصر،

مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک ہر سبائی تھا، اس نے ۸۲۵ء سے ۸۴۱ء
تک حکومت کی ہے، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصلد
و معدن ہے، مشہور عرب جہازران ابن ماجد اسد البحر نے جس نے ۹۰۴ء (۷۹۸ء) میں
واسکو ڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی
پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا
زمانہ نوین صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا، یہ بحر ہند اور بحر عرب کا
ایک نڈر جہازران تھا، بحرانی ہندو بیوپاریوں کی طرف سے اس کو کٹکا کا سنسکرت خطا
ملا تھا جس کے معنی ماہر یا مضمی دان کے ہیں، رد و لکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی ص
۱۳۰-۱۳۶) اس کی اسی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک
خاص سلسلہ میں لکھا ہے،

گیا رہواں بادشاہ بر سبائی

والحادی عشر ہر سبائی الاشرف

اشرف ہے جو اشرفی سک کا چلا

ضارب سکتہ الاشرفی،

والا ہے،

(ص ۴۰ طبع پیرس)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحرِ ہند میں داخل ہوا تھا اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا، ابن ماجہ نے اپنی یہ کتاب ۹۵۷ھ میں لکھی ہے اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۷۵ھ میں لکھی اور اشرفی علانی کا نام دیا ہے، یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہوں کے سونے کے سکون کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں، یہیمہ روپیہ اور اشرفی کی تقریباً وہ طریقہ یاد آیا، جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ہیں، جس کو ہم آپ ہیہ کہتے ہیں، خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ہے، اور جہاں سے یہ نئے طریقے آئے ہیں، وہیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے، مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گذرا، جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے، اللہ میں عالمگیری کی تحت نشانی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ہے،

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں کے مہاجنوں کے ذریعہ سے ترسیلِ زر کا حال لکھتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے،

”لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی گتہا ہی نا آشنا اور انجان ہو، گو اہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں روپیہ امانت مرافون کے حوالے کر دیتا ہے یہ صرف بھی ایسے سچے ہوتے ہیں کہ جب ان سے امانت واپس مانگیے

بلا حیلہ حوالہ کیے بے وقت واپس کر دیتے ہیں، اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکے تو وہ ان کے حوالے کر دیتا ہے، دیانت دار صرف ان روپیوں کو اپنی تحویل میں لے کر ہندی میں اپنے کارندوں کے نام جو ہر شہر میں ان کی طرف سے سچائی کی دوکان کھولے رہتے ہیں، ایک پرچہ لکھ کر دیدیتے ہیں، اس کو یہاں کی زبان میں ہندی کہتے ہیں، یہ کارندے اگرچہ سیکڑوں میل کی مسافت ہو اس پرچہ کو دیکھنے کے ساتھ بلا حجت اس کو روپیہ دیتے ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس پرچہ کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے، اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ پہنچنا چاہے تو اتنے ہی روپے اس کو فوراً مل جائینگے، صرف یہ ہوگا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتع) اس سے لے لے گا۔ اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے،

”عجیب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق ہائیکہ اقمشہ و امتعہ و دیگر اموال آہنما بجنس در قراگاہ سلامت رسانیدہ ہا لکان عائد می نمایند، وآں را بزبان این مردم بمیاگویند اس عبادت سے یہ معلوم ہو گیا کہ پرانے ہندوستان میں ہنی آرڈر بھیجے، بنک چیک استعمال کرنے، اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بھیج کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا، اور اس لفظ ”بمیا“ کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا،

”بزبان این مردم بمیاگویند“ سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا مگر میں نے ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتہ بتا

نہ رکھا، اس سے وہم ہو جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ ”بیم“ بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو، سجان
راے نے اس بیان کا آغاز بھی ان لفظوں سے کیا ہے :-

”و طر فرائد اگر بنا بر خوف سالک مالک شخصے مبلغناے نقد بسافت دور و نزدیک

تواند برد“

۱۔ اس لفظ ”خوف“ سے بھی ادھر ہی خیال جاتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی
کتا بون میں یہ لفظ نہیں ملتا، انیسویں صدی عیسوی کے آخرین سید تصدق حسین نامی ایک
بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت نشی نو لکشور صاحب کے نام
سے لکھا ہے، اور نو لکشور پریس میں سولہ مین چھپا ہے، مولف نے مقدمہ میں یقین لایا
ہے کہ تمام لغات دیکھ کر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ہے، اس میں ”بیمہ“ کے لفظ کے
نیچے اس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ہے،

”بخوف رہزنی جو کسی سا ہو کار کو محمول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دین اور وہ اس کی

حفاظت کا ذمہ دار ہو“

لغات کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمہ کے فارسی ہونے
میں کوئی شک نہیں رہ جاتا،

ڈاک - بیمہ کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک، ڈاک خانہ اور ڈاک گھر کی طرف
چلا گیا ہوگا، موقع ہے کہ آپ کے اس حسن التفات سے ہم فائدہ اٹھائیں تعجب ہوگا کہ اس ڈاک
کا ہمارے لغت میں پتہ نہیں،

عربی میں ڈاک کے لئے برید کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مسلمانوں میں امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے اس نظام کو قائم کیا، اور برید اس کا نام پڑا، ہمارے عجمی اہل لغت اس کو فارسی بریدین سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک کے لئے دم برید یعنی دم کئے گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے اس لئے ڈاک کو برید کہنے لگے، حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ہوتا تو زبر کے بجائے ب کو پیش ہونا چاہئے تھا، اب نئی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی اور لاطینی سے عربی میں آیا ہے، اور وریڈ اس کی اصل ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ پہلے ہی لفظ آیا پھر ترکی لفظ اولاغ چلا، (برنی ص ۴۷ کلکتہ) مگر فوراً ہی اس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا، اور وہ لفظ دھاوا ہے، چنانچہ تعلقون کی تاریخ میں یہ لفظ بولا گیا ہے، ابن بطوطہ نے سفر نامہ میں بعینہ یہی لفظ لکھا ہے (ص ۱۷ مصر) برنی نے فیروز شاہی میں اسی لفظ کا استعمال کیا ہے، (ص ۴۷ کلکتہ)

مگر اس کو دھاوا کیوں کہتے تھے؟ اس کا پتہ ہم کو اپنوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہؒ سے بیگانے سے چلتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنی اہل ہند میں تہائی میل کے ہیں، چونکہ یہ ہر کارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے، اس لئے اس کو دھاوا کہتے تھے، اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے، لیکن غریب نا آشنا سے زبان کو اس میں غلط فہمی ہوئی ہے، دھاوا کے معنی سنسکرت میں دوڑنے کے ہیں، چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لئے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر وہ دھاوا ہو گئے، اور ہر تہائی میل پر جہان ٹھہرتے تھے وہ دھاوا ہو گیا،

دھاوے کے ان پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پر دلی سے یکسر دولت آباد تک بنی ہوئی تھیں، پیادہ گھنگرو دار لاٹھی کو کندھے پر رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے پر پہنچتا تھا، وہاں دوسرا پیادہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا، وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑاتا تھا، اس طرح سندھ سے دلی ۵ دن میں ڈاک پہنچتی تھی (ابن بطوطہ)

اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا، آج بھی موجود ہے، اور دھاوے کے پیادے کو پانک کہتے تھے، چوپیک کی صورت میں محرم کی تقریب میں امام کے نقلی قاصدوں کا ہم نے نام رکھا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا، چنانچہ اکبر کے زمانہ میں جب بدایونی نے اس لفظ کا استعمال کیا تو اس کو اس کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی، سلطان محمد تغلق کے حال میں کہتا ہے:-

”درستہ سلطان محمد تغلق عزیمت دیوگر کوہ از دہلی تا آنجا برسر کروہ دھاوہ

یعنی پانکجاں خبردار نشاندہ“

فرشتہ نے جہانگیر کے زمانہ میں اپنی کتاب لکھی تو ”دھاوہ“ کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا، مگر کہتا ہے کہ اس کو پہلے یام (می ام) کہتے تھے، سلطان علاء الدین کے حال میں لکھتا ہے:-

”از دہلی تا آنجا ڈاک چوکی کہ بزمان سلف یام می گفتندی نشاندہ“

یہ یام فارسی استعمال میں ہے، دکن میں مدراس سے لے کر پونا تک اس کے لیے ٹیم

ٹیال اور ٹیہ خانہ بولا جاتا ہے، ریاست حیدر آباد کا سرکاری لفظ یہی ہے،

بہر حال ڈاک کا لفظ جانگیر کے عہد میں یا اس سے کچھ پہلے سے بولا جانے لگا، اسکی اصلیت پر میں غور کرتا رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ اس کے معنی منزل کے ہونگے، چونکہ یہ منزل بمنزل جاتے تھے، اس لئے اس کو ڈاک کہنے لگے، اور اس کے برٹراؤ کو ڈاک چوکی چوکی بمعنی پہرہ جس کی ایک یا دو گار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے، اسی لئے انگریزوں نے اسی اصول پر بنگال سے الہ آباد تک اپنے منزل بمنزل سفروں کے لئے جو مختصر قیام گاہ بنائیں ان کو ڈاک ہنگامہ کہا، اور اب بھی وہ یہی کہے جاتے ہیں، اور اگر تخت گھر نے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہوں کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈاک اور بنگال کی حد پر ڈھاکہ، اور دوسری طرف موتی ہار می من نیپال کے پاس دوسرا ڈھاکہ اسی منزگاہ کے باقی نشان ہیں، بہر حال منزل نے راستے کی، اور راستے نے خط و لفافہ اور اشیائے ڈاک کی صورت اختیار کی، اور اب وہ ریل گاڑی جو بہت کم منزل کرتی ہے مگر ڈاک لے کر چلتی ہے، ڈاک گاڑی کہلاتی ہے، ڈاک کے پچھلے معنی کی یادگار ڈاک بٹھانا، ڈاک لگانا یعنی جلدی جلدی منزل بمنزل یا ہاتھوں ہاتھ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا رہ گیا ہے،

فیض ساتی نے مرے ڈاک لگا رکھی ہے،
(راسخ)

روح ہے ہر جم میں مشتاقِ اخبارِ اجل،

اس لئے یہ آمد و رفتِ فُض کی ڈاک ہے،
(راسخ)

اسی سے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ہے، یعنی نیلام میں منزل بمنزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا
 کچھ دن ہوئے ایک قلمی ہندوستانی فارسی لغت برادرم پروفیسر سید نجیب اشرف
 ندوی (اسماعیل کالج بمبئی) کے پاس نظر سے گذرا، یہ لغت کسی ایرانی یا پارسی نے لکھا ہے، لہذا
 کا سنہ نہیں معلوم، اس میں ایک لفظ ڈانیکہ دیکھا جس کے معنی نقیب کے لکھے ہیں، نقیب
 شاہی درباروں میں درباریوں کو بادبے ہنے کے لئے زور سے آواز لگایا کرتے تھے، ڈانکنا
 کے معنی زور سے آواز لگانے کے ہیں، اس سے دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ ڈاک کی اصل
 ڈانک، اور ڈانیکہ کی ڈانیکہ ہے، چونکہ ڈاک کا چوبدار آواز دیتا ہوا چلتا تھا، اس لئے اس کو
 ڈانیکہ اور اس کے کام کو ڈانک کہا گیا، اور ڈانک نے ڈاک کی صورت بدل کر منزل بمنزل
 رفتار کے معنی اختیار کر لئے،

اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے
 تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت
 سن لیجئے،

قمری ہماری زبان میں ایک خوش نو پرندے کا نام قمری ہے، یہ نام عربی و فارسی
 سے آیا ہے، مگر اس کی اصلیت کے بتانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں، فارسی کے جا
 لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں، مؤید الفضل میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ہے،
 یہ لفظ ملتا ہے، اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں، پھر اس سے
 اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے اور قمری اور فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے، اور

اس کی آواز کے تو یا کو کو کی ہوتی ہے، گلے میں طوق ہوتا ہے، اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک سفید کافوری اور دوسری صندی، اور اس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ہے، تاج کے مشہور نام سے جو ہری کی تاج اللہ کی طرف خیال جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جو ہری نے قمری کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کتے ہیں، بہر حال یہ فارسی نہیں، عربی بھی نہیں، کیونکہ اول تو عرب اس سے واقف نہ تھے، ان کے شعروں میں اس کا ذکر نہیں، قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں، اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں، اس کے اخیر میں جو یا سے مشدوہ ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے، اور اسی نسبت کی طرف اکثر اہل لغت گئے ہیں، جو ہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قمر سے مشتق ہے جس کے معنی سپید کے ہیں اور اس سے صفت بنی اقمر یعنی سپید، اس اقمر کی جمع ہوئی قمر جیسے احمر سے حمرا اور اب یہ ہوا کہ سپید پر ندون کو جمع کے ساتھ یون بولے طیر قمر، اب اس جمع کا واحد جمر ہے ہوا تو جمع کی طرف یا سے نسبت لے کر قمری واحد بنا لیا، جیسے روم سے رومی، زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی) مگر اس تحقیق میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے، عربی میں اس محنت سے کسی اور پرندے کا نام نہیں رکھا گیا،

مجد فیروز آبادی نے قاموس میں قمریہ لکھا ہے، اور بتایا ہے کہ بوتر کی ایک قسم ہے، مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زختری سے لیا ہے، بعضوں کا دعویٰ ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے، اس کی جمع قمر ابو عامر نام ایک جاہلی عرب شاعر کے کلام میں ہے،

ماقہ قمر الواد باس شاق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہیں،

قری کے آخرین جوئی ہے، اس کو کوئی صاحب یاے مبالغہ سمجھتے ہیں، مگر اکثر ان کی رائے یہی ہے کہ یہ یاے نسبت ہے، اب رہی یہ بات کہ کس کی طرف نسبت ہے، تو بعض لوگ اس کو اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں، اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہیں، علامہ تفضی زبیدی نے تاج العروس میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاد نے شرح کفایہ میں اس کی تحقیق کی ہے،

اب اہل لغت کے دربار سے اٹھکر ہم آوارہ گرد جغرافیہ نویسوں کے مسافر خانوں میں پہنچتے ہیں، یا قوت رومی معجم البلدان میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ہے، ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے، مقریزی خط مصر میں دریائے نیل کے منبع کی تلاش میں نکلتا ہے اور بحر ہند کے جزایرون کو دیکھتا بھانپتا چلتا ہے، اور اسی اثنا میں جزیرہ قمر کا ذکر کرتا ہے، اور جن کا دوسرا نام جزیرہ ملائی بتاتا ہے، جسکو آج ہم ملایا کہتے ہیں، ان ہی میں سے ایک جزیرے کا نام قمریہ بتایا ہے، اور اس کے بعد کتابت والیہا ینسب (الطائر القمری طائر مصر) اور اسی جزیرہ کی طرف قمری پرند منسوب ہے،

البیرونی نے کتاب الہند میں ملایا کے کچھ جزایرون کا نام قمریہ بتایا ہے، (صفحہ ۱۰۳) پرندوں کے نام ان مقاموں کی نسبت سے رکھا، جان پہلے پہل وہ پرندے کسی

لے ہاے دوست ڈاکٹر ناچند نے بتایا کہ انگریزی و فرنیچ میں اس کو اب بھی کھمر KHEMER کہتے ہیں

خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہوں، عام بات ہے، ترکی چینی، شیرازی وغیرہ کی مثالیں ہیں،
 اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا ستانے کے لئے غالب کے اس شعر کا مطلب
 حل کیجئے،

قری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے،
 فارسی شاعروں نے گل و بلبل کی طرح سر و قمریٰ میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے،
 قمریان پاس غلط کردہ خود می دارند ورنہ یک سر و دینِ بلغ بہ اندامِ تو نیست
 ایک اور یارے نسبت حل طلب ہو،

سو سی ہمارے ملک میں رنگین باریک دھاریوں کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے جسکو
 سو سی کہتے ہیں، اسلامی زمانہ کے اکثر بنے ہوئے کپڑوں کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام
 یا اس امیر یا بادشاہ کے نام ہیں کام کے نام پر رکھے جاتے تھے جو اس کپڑے میں خاص
 سے کیا جاتا تھا، جیسے تاقہ، باقہ، زرتی، کارچوبی وغیرہ، یا مظفری، محمودی، علی قلی خانی وغیرہ یا
 کاشانی، بنارسی، بھاگلپوری وغیرہ، انگریزی میں ٹیل کو جو میلین کہتے ہیں، وہ موصل کی طرف نسبت
 سو سی نہ تو شخص کا نام ہے نہ ہندوستان کے کسی مقام کا، یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی نسبت
 سو سی کی طرف ہے، سو سی کے نام سے ایک شہر ترکستان میں ہے، اور دوسرا مغربِ اقصیٰ
 یعنی ملک مراکش میں ہے، مگر یہ دونوں مقام پارچہ بانی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، لیکن
 ہے یہ وقتی شمالی افریقہ کے ایک صنعتی مقام کا نام، اس کا نام سو سہ ہے، یہ عربوں کی رتی
 کے عہد میں پارچہ بانی کا بڑا مرکز تھا، اور یہاں کے بنے ہوئے کپڑوں کو سو سی کہتے تھے پھر

اس نمونہ پر جہان جہان کپڑے بنے جانے لگے ان کو سوسی ہی کہنے لگے، یہ گویا ایک طرز کا نام ہو گیا، یہ کپڑے کہی اس شان کے بنے جاتے تھے کہ ان کے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی، جعفرانی ڈکنسری بمحکم البلدان کا مصنف یا قوت حموی رومی جس نے ۱۲۶۵ھ میں وفات پائی ہے، سوسہ کے ذکر میں لکھتا ہے، (لفظ سوسہ)

”صحیح یہ ہے کہ سوسہ ایک چھوٹا سا شہر افریقیہ کے اطراف میں ہے۔۔۔ یہاں کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہیں، یہ بیش قیمت (یا باریک) سوسی کپڑے بنتے ہیں، اور جو کپڑا دوسری جگہوں پر دیا جاتا ہے وہ ان ہی کی نقل ہے، (یا ان ہی کے مشابہ تم) ان میں سے ایک تھان کی قیمت وہاں دس دینار ہے۔۔۔۔۔ اور جو دھاگا دانا کتا ہے اس کے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے“

لیکن ہماری ہندوستانی سوسی بہت سستی ہے، اور غریبوں کی ستر پوش ہے، اکثر غریب عورتوں کے پاجاموں میں کام آتی ہے، چیز وہ نہیں رہی، طرز وہی ہے، وہ ریشمی ہوگی یہ سوتی ہے،

ایک بھول یا بے نسبت ہمارے ایک خوش ذائقہ کھانے میں بھی ہے،
فیرنی - یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے جس کے مزے سے ہم سب واقف ہیں، مگر اس کی لفظی اصلیت سے ہم سب ناواقف ہیں، پتہ یہ چلتا ہے کہ فرنی اصل میں فرنی (بالضم) ہے، چوتھی صدی کا مصنف محمد خوارزمی جو غزنویوں کا معاصر تھا، اپنی کتاب فی تاریخ العلوم میں بیارون کی غذاؤں کے سلسلہ میں فرانی نام لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس غذا کی تیاری کی صورت

یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی توری پھولی ہوئی (پاؤروٹی سمجھیے) روٹی کو دودھ میں جھگو
 شکر ڈال کر تیار کی جاتی ہے، (نان بر شیر کیسے) اس کا واحد فرنی ہے، اس کو فرنی اس لئے کہتے
 ہیں کہ یہ موٹی روٹی تورین جس کو عربی میں فرن کہتے ہیں، تیار ہوتی ہے، گویا فرنی کو توری
 کے معنوں میں سمجھیے، ہندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی ہوئی روٹی کے بجائے اس میں
 چاول اٹنے لگے اور اب شکر قند ہو سا بودانہ ہو، جس چیز کو آپ دودھ شکر میں پتلا کر کے
 بنائیے وہ فرنی ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنی ترمیم اور کیجئے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجئے،

یہی مصنف ہمارے بھات کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جن سے کھیر کی خوشبو آتی
 ہے، وہ کہتا ہے بھتہ (بھٹ) سندھی لفظ ہے، چاول میں دودھ اور گھی ڈال کر بناتے ہیں
 کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے، سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں
 جس سے ہماری یہ کھیر کٹی ہے، اور اسی لئے کھیر کہلاتی ہے، بھات سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے
 جو میت کے کھانے کو کہتے ہیں، کیونکہ صاحبو! انگریزی ملازمون کا بھتہ اسی بھات سے تو
 نہیں ہے، جس کا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا ہوا اس کے معنی خرچ خور
 کے ہوں، ۱۷۵۵ء، ۱۷۷۷ء میں لارڈ کلایون نے جو اصلاحات کیں، ان میں ایک یہ بھی ہو
 کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ "بھتہ" دیا کرتی تھی، لکھایون نے اس زمانہ
 میں اس کو بند کر دیا، اس واقعہ سے بھی اس لفظ کا اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے،
 رقم اس بھتہ سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے، کہی آپ دوسروں کے ذمہ
 اپنی رقم نکالتے ہیں، اور کہی دوسرے آپ کے ذمہ، مگر کہی آپ نے یہ سوچا کہ یہ رقم آپ کو

کہاں سے ہاتھ آیا!) آج ہم رقم روپیہ کی ایک مقدار کو کہتے ہیں، رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے مگر اس معنی میں نہ عربی میں مستعمل ہے نہ فارسی میں، بلکہ یہ خاص ہندوستانی ہے،

رقم کے معنی عربی میں نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہیں، حدیث میں ہے، **الرقمافی ثوب**، اس سے لکھنے کے معنی ہوئے جیسے **کالرقم علی الماء**۔ عربی میں حساب اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لئے رقم کا لفظ پسند کیا گیا، اور اس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیہ کے لفظ ہیں، اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنی میں استعمال ہو چکا تھا، اس لئے اسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لئے مناسب معلوم ہوا، یہ جمع کے ساتھ اقلام اور ارقام بولے جاتے تھے، بیرونی نے کتاب التندین خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے (ص ۷۸)، اسی سے اعداد کے علامات خصوصاً روپیہ کے اعداد کے علامات کے لئے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے ارقام ہندیہ مستعمل ہوا، اور جب حساب کی اصطلاح میں ارقام اور رقم کا لفظ آگیا تو نقد روپیہ کے لئے اس کا استعمال پاجانا کتنی بڑی بات تھی،

ہندسہ رقم سے "ہندسہ" کی طرف خیال گیا چونکہ ارقام "ہند" سے عربی میں لیے گئے ہیں، اس لئے عوام ہندسہ کو زبرد کے بجائے زیر روئے کر ہندسہ بولتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ "ہند" سے ہے اس لئے ہندسہ ہے، اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبر المقتضب

لے انوس ہو کر میری کتاب عرب و ہند کے مصحح نے اپنی غلط تصحیح سے میرے صحیح کو غلط کر دیا ہے، دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ اکاڈمی ص ۱۲۵)

کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اس وہم میں مبتلا ہے (ص ۱۹۶ و ص ۱۹۷) مقدمہ گریزی
 (۱۸۳۱ء) فارسی لغت برہان قاطع کے مصنف بھی اسی غلطی میں گرفتار ہیں، کہتے ہیں،
 ”ہندسہ بکسر اول و ثالث و فتح سین بے نقط یعنی اندازہ و شکل باشند وارقاعے رانیز
 گویند کہ در زیر حروف کلمات نویسد ہجو ایچد ہوز حطی۔“

یہ بیان تا متر غلط و در غلط ہے، ہندسہ بفتح اول و ثالث و رابع ہر وزن فعلتہ فارسی
 لفظ ”اندازہ“ کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے، معنی اندازہ کرنا، اور اس سے مراد عمارت کا ناپنا اور
 نقشہ بنانا یعنی فن تعمیر ہے جس کو آج انجینئرنگ کہتے ہیں بعضوں نے اس کو فارسی ”اندیشہ“
 کا عرب بتایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، خواہ رزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم میں کہتا ہے،

اما الہندستہ فکلمۃ فارسیہ لیکن ہندسہ، تو یہ فارسی لفظ کا متر

معربۃ و فی الفارسیۃ ہے، فارسی میں اندازہ ہے، یعنی

اندازہ اسی المقادیر قال مقدار خلیل نے کہا ہے کہ مهندس

الحنیل المهندس الذی وہ ہے جو نہروں کے نکالنے کا اندازہ

یقدر بجاری القتی و موا وپیمائش کرتا ہے، تاکہ نہریں کھوی

حیث تحتقر وہی مشتقہ جائیں، اور ہندزہ سے بنا ہے، اور

من الہندزۃ وہی فارسیۃ وہ فارسی ہے، تو ”ز“ کی جگہ ”س“

فصیرت الزای سبنا لاند نے لی، کیونکہ عربی میں دال کے

لیس بعد الدال زای فی بعد ”ز“ نہیں ہوتا،

لیکن ہندسہ، تو یہ فارسی لفظ کا متر

ریاضیات ہندسہ سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی، عربی میں روض کے دو معنی ہیں، زمین کی سرسبزی و شادابی، اس نے باغ و بہار کا مفہوم پیدا کیا، اور ریاضِ جنت کے پھول کھلائے، دوسرا مفہوم سواری کے جانوروں اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے سکھانے اور پھیرنے کا ہے، عربی میں فعالہ کا وزن پیشہ، فن اور صنعت کے کام آتا ہے، اس سے ریاضہ بنکر گھوڑا پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا، گھوڑے کو پھیر کر سیدھا اور شاہانہ سے صوفیہ نے نفس کو رام کر کے شایستہ بنایا اور ریاضتِ روحانی اس کا نام رکھا، ادھر گوشت و پوست اور جوڑ بند کے حق کے شائقوں نے جہانی مشق و ورزش کو ریاضتِ جہانی کہا، اہل علم کیونچپ رہتے، انھوں نے حساب و ہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا، جاہل اہل پیشہ نے کہا کہ ہم کو بھی اپنے کاموں میں محنت کم نہیں پڑتی، انھوں نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا، لیکن اس معنی میں یہ خالص ہندوستانی ہے، عرب حکیموں نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیون دیا؟ جب کہ ریاضیات کی خصوصیت نہیں، ہر فن مشق کا محتاج ہے، اہلیت یہ ہے کہ ہندیوں کی طرح یونانیوں میں بھی بچوں کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا، اسی لئے جب شروع شروع میں عربی میں یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمیات پڑا، کیونکہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، اب عربی فلسفہ میں اس اصطلاح کا اثر اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اس میں اب بھی ^{تعلیمی} جہت ہے لیکن تعلیمیات کی جگہ بہت جلد اس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی، اس لئے کہ بچوں کی مشقی تعلیم اسی سے شروع ہوتی ہے،

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں ”جو تعلیمی کے نیچے لکھے ہیں،
 ”ویسے ہی جیسا تعلیم یا اذی بحث عندہ فی العلوم والتعلیم ایہ الریاضۃ
 منسوبۃ الی التعلیم والریاضۃ فانہم کانوا یبتدؤن بها
 فی تعالیمہم وریاضتہم لنفوس الصبیان“

سیاست ریاضت کے وزن پر سیاست ہے، اور آجکل کیا کہنا کہ ساری دنیا
 میں اسی کی بہار ہے، مگر معلوم ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے، لغت میں اس کے اصل معنی
 جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے اور اسی سے امیر کی اپنی جماعت کی اور بادشاہ کی اپنی
 رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا، ظالم بادشاہوں کے ظلم نے اس کے معنی بدل
 دیئے، اسی سے ”سیاست گردن“ مراد لینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنوں میں
 استعمال ہوا ہے،

عوض اللہ اس کا محکمہ میں حشر کے لئے گا،

کرے گا جو سیاست عالم ظالم رعیت پر
 سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اتنا ضروری نہ تھا، مگر مجھے پروفیسر ڈیوڈ آرنلڈ
 (ماسٹرف علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا، سوار ایل فی معرفۃ المولود الخیل میں وہ کہتے
 ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے، چنگیز خان نے اپنی اولاد کے لئے جو چند ملکی قاعدے بنائے
 تھے، ان کا نام ”سیاسہ“ تھا، اسی سے عربی میں سیاست آیا ہے، مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے
 یہ لفظ عربی میں اتنا پرانا ہے کہ حدیث تک میں موجود ہے، ان الناس کان یسوسہم

الانبیاء (صحیحہ مسند) پہلی صدی ہجری کے آخرین محمد بن قاسم نے جب، ابرس کی عمر میں سندھ فتح کیا تو ایک شاعر نے اس کی مدح میں کہا، ساس الرجال سبع عشرة حجة (اس نے ابرس کی عمر میں لوگوں کی سیاست کی)، ابن ندیم نے فرست میں جو ۳۵۷ھ میں تاتاریوں سے صدیوں پہلے لکھی گئی "سیاسیات" کا لفظ سیاسی ٹکٹی کتابوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے پھر قدیم کتب لغت میں اس کی اصل موجود ہے،

ہاں اپنی زبان کے لحاظ سے یہ کہنا رہ گیا کہ ہماری زبان میں سائیس اور سئیس کا لفظ اسی سیاست سے بنا ہے، اس کی اصل سائیس ہے، مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے، نہ عربی ہے اور نہ فارسی، مگر خوشی معاف! آپ نے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سئیس دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی، دونوں نگرانی اور نگہبانی کرتے ہیں، سیاسی اچھل جبکہ کہتے ہیں ہمارے تازہ دکھنی نوجوانوں نے اس کے لئے سیاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے، مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے، یہ لفظ واوی ہے یا ئی نہیں، دھوکا سیاست اور سیاسی کی "سی" سے ہوا ہے، مگر واؤ کی جگہ "ی" قاعدے سے ہے اور سیاس میں واؤ کی جگہ ی بے قاعدہ ہے، اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سواس ہوتا، سیاس نہیں، اب یہ سیاس چل نہ جائے غلط العام فصیح کے حدود میں نہیں آسکتا،

بحث "سیاسیات" کی خطرناک الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہی ہے، اس لئے

خاموشی ہی بہتر ہے،

(ہندوستانی جولائی ۱۹۷۷ء)

(۲)

بعض پرانی نقطوں کی نئی تحقیق

اس مضمون کا پہلا نمبر سیاسیات کی الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہا تھا، اس لئے جیسے ہی بنا اس کو وہیں ختم کر دیا گیا ہے، لیکن اتنے دنوں میں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے، اب یہ سننے میں آتا ہے کہ سیاست کا پہلی میدان لاکھوں مربع میل کا وہ میدان نہیں ہے جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے، اسی کی خاطر سب کچھ ہے، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے ”خوردن برائے زمین است، زمین برائے خوردن“ یعنی کھانا جینے کے لئے ہے، نہ جینا کھانے کے لئے۔ حضرت مسیحؑ کہتے تھے، ”کہ آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا“ لیکن آجکل کی سیاسیات نے یہ دو دنوں مقولے جھٹلا دیئے، اب یہ ہے کہ ”جینا کھانے کے لئے ہے نہ کھانا جینے کے لئے“ اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے، چنانچہ آجکل کے بوشنزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں، پیٹ پر ہے،

پیٹ کے لئے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے

اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میرا خیال ہے وہی اکثر ان کا ہے یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا ناشتہ ہے، صبح سویرے اٹھ کر منہ میں کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لئے ڈھارس ہو جاتی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ ناشتہ کے لئے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے، میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک یورپ کی اور ایک پچھم کی یعنی عربی اور انگریزی، دونوں میں یہی بات ہے، اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا، عربی میں اس کو فطور کہتے ہیں، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس افطار کریں اس کو افطاری کہتے ہیں، فطور کے معنی توڑنے کے ہیں، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا نقطہ ہے، فارسی میں اس کے معنی اس بھوک کے ہیں جس صبح سے کچھ نہ کھایا ہو، (مؤید الفضلہ و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا،

اسی معنی میں ایک اور لفظ ہمارا آپ بولتے ہیں، ”ہمار منہ“ یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھو کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا لگتا ہے کہ گویا ہندوستانی ہی ہے، اس کی اصلیت ”ناہار“ ہے، ”نا“ نفی کے لئے ہے اور ”ہار“ کے معنی غذا کے ہیں، ”ناہار“ یعنی نہیں کھایا ہوا، (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی ”ہمار“ تیار ہوئی جو صبح کو ہمار منہ کھائی جائے

اور لکھنؤ اور دہلی میں یہ خاص چیز ہو گئی، جو بازاروں میں بچی پکائی بہت چٹنی ملتی ہے،
 "تاہا" سے آہا ریا د آیا، آہا ر آٹے کی اس لٹی کو کہتے ہیں جو کاغذ اور کپڑے پر اسلئے
 چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے، آپ سُن چکے کہ آہا ر غذا کو کہتے ہیں، جو بدن
 کی تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس سے اس لٹی کو بھی کہنے لگے جو کاغذ اور کپڑے کی
 قوت کو بڑھا دیتی ہے، (برہان قاطع)

ناشتہ کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے
 عربی میں اس کو سُلْفہ کہتے ہیں، اسی سے سَلَف (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے، عربی کا یہ
 سُلْفہ ہمارے ملک میں کھانے کے دسترخوان پر دوبارہ نہ پاسکا، مگر پینے کی یارادہ محض
 ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نور الدین جہانگیر کے زمانہ میں مہمان کو امریکہ سے
 ہندوستان آیا، اور حکیم گیلانی کی پر حکمت ترکیبوں سے تو اعظم، حقہ اور نے کی شکل پیدا
 ہوئی، یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کے لئے بڑا وقت، بڑا سامان اور
 اور ایک دو ملازم چاہئیں اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت، نہ اتنا سامان نہ ملازم
 انھوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سُلْفہ جلدی جلدی تیار کر لیا، اور پی پلا کر اپنے کام پر روانہ
 تکلف کے کھانوں کو قابول میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ قُتُب ہے، اس کے
 معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں، جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا جائے، (لسان) لیکن
 ترکی میں اور اس سے فارسی میں "قَاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں، اسی لئے
 عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قَاب کہتے ہیں، اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن

کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے،

یہی حال رکابی کا بھی ہے، رکاب فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں اس سے رکابی بنی، اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے طرف کو کہتے ہیں، اور اسی سے ہندوستانی امرکیلئے رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے،

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں، قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قلیہ ہو سکتی ہے، عربی میں قلی بھوننے کو کہتے ہیں اس سے قلیہ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں، ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے،

شوربا تو صاف عربی کا شرابہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہیں، عربی میں شرابہ اس کو کہتے ہیں جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیوں نے شوربا بنالیا، اور گوشت کے پانی کو کہنے لگے، انھوں نے شوربا کو پھر شوربا ج بنالیا، مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا تو شرابا ہو گیا،

اسی عربی شراب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا، شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے، یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہی ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اس کو متوالی شراب

مراد لی، اسی سے یورپی زبانوں میں سیرپ (SYRUP) تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا، لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں، میٹھے کے بعد نمکین چیز یا دآئی کہا اب، صورت عربی ہے، معنی عربی نہیں، کب عربی میں اوندھے کرنے کو کہتے ہیں، اب جس گوشت کو اوندھا کر کے آگ پر رکھئے اس کو کباب کہتے،

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں، قالین سے بڑھ کر خوشنما، خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین کے فرش پر نہیں بیٹھے وہ بھی کریسون کے نیچے اس کو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ آیا کہاں سے؟ ہندوستان میں تو اس کو مسلمان لائے مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہاں؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے،

ایشیائے کوچک میں آرمینیا کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قالینا ہے، چوتھی صدی ہجری میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اس کی طرف جب نسبت کی جاتی تھی تو قالی کہتے تھے، عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے ابوعلی قالی کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی شہر کی صنعت اور کاریگری ہے اسی لئے اس کو فرش قالی پہلے نسبت کیساتھ کہا گیا، پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یا قوت رومی متوفی ۷۶۲ھ اپنے جغرافیہ بحسب البلدان میں قالینا کے نیچے لکھتا ہے:

تعمل بقایقلا هذه البسط یہ فرش جسکا نام قالی ہے قایقلا ہیں
المستماة بالقالی، اختصروا بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکا پن کیلئے
فی النسبة الى بعض اسمه نسبت میں اختصار مد نظر رکھا ہے،
لشقله (ج، م، مصر) (یعنی قایقلا کی جگہ صرف قالی کہا جی)

مؤید الفضلارمین جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو قالی لکھا ہے، اور ایک شعر نقل کیا ہے، فارسی شعراء نے بھی قالی ہی باندھا ہے، اور جس چیز کو ہم قالیچہ کہتے ہیں عجب نہیں کہ وہ قالیچہ ہو یعنی چھوٹا قالی، اب آخر کا لون جو قالین میں ہے، وہ میں ہے جو نسبت کے معنی بخشتا ہے، جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہوا، ایک سی چونکہ پہلے سے موجود تھی، اس لئے دوسری سی نہیں لگی، تحقیق میری ایجاد ہے، معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط،

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھڑیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لئے بنایا جاتا ہے ہماری زبان میں شاگرد و پیشہ کہتے ہیں، بیچارہ مولوی نور الحسن صاحب نیر مرحوم (تور اللغات کے مؤلف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد و پیشہ کیوں کہتے ہیں، میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مدحی کرنے لگے تو نوکر چاکر چلیہ کھلانے لگے جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا کوچہ چیلان دے رہا ہے، اسی چلیہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی، اور شاگرد و پیشہ اس گروہ خدام

کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصّہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے،
 کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شیمہ بانو کو گلستان پڑھا رہا تھا اُس میں وہ حکایت
 آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے،
 این حکایت شنو کہ در بغداد رایت و پردہ را خلافت افتا
 علم شاہی نے جھک کر پردہ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر میں اور لڑائیوں میں
 تو مارا مارا میں پتھر پھونک رہا ہوں اور قریب سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کینزدون کے ہاتھوں
 میں رہتے ہو، اور

من فتادہ بدست شاگردان

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم و حشم کے ممنون میں یہ پرانا لفظ ہے اور
 اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان میں محنون کے اس حصّہ کو کہنے لگے جو
 خاص طور سے ان کے لئے بنائے جاتے ہیں،

ایک ہندوستانی لفظ کی اہلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا، ایک دفعہ میں عربی
 کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا کہ لفظ راز پر نظر پڑی اس کے معنی اس
 استاد اور ماہر کے لکھے تھے، دفعہ میرا دھیان اپنے ہندی راج اور راجگیر (معا)
 کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں بھی کتابوں میں
 تحریروں میں برتا نہ گیا ہو وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آگیا ہو گا، لیکن دل
 ہی کہتا تھا، کتابین اٹین پٹین، دیکھیں، مگر سرخ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں

کی تعطیل میں برادر عزیز پر وفیسر نجیب اشرف ندوی سے پتہ میں نصاب لہجیان
کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملاجس میں فارسی اور عربی الفاظ کے
مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں، اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو،
کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہوا رسالہ کا نام "لسانِ فارسیات" لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے
ہندوستان کے کسی نووارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے
اس میں پیشہ ورون کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگر پر نظر پڑی جس کے معنی اس نے
کر دیا یعنی "کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کاٹنا آج نکل گیا، اور معلوم
ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی خدا بخش خان کے کتب خانہ میں چلا گیا
فارسی لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں، مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی
عبدالرشید ٹھٹھوی میں یہ عبارت نکلی،

رازہ معمار و سردارانِ گلکاران بہ ہندی راج گویند، لیکن بدیں معنی عربی است،
عجمی گوید

بہ یکے تیرہم فاش کند ستر حصار دربر و کردہ بود، قیر گل کار راز
اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آکر بہانِ قاطع میں دیکھا تو یہ لکھا پایا
و بتا، و گل کار راز گویند و عبری طیان خوانند و بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر
و بزرگ بنایاں باشد،

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں،

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے کہ یہ اہل مین مسطری ہے، مسطر اس
 آلہ کو کہتے ہیں جس سے مسطری دی کی جاتی ہے، پرانے زمانہ میں ایک موٹے کاغذ
 پر موٹے تاکہ کو سیدھ سے ناپ کر آجکل کے رولڈر کاغذ کی طرح سی دیتے تھے، اس
 پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطرون کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے میں سطرن سیدھی
 ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی، عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے
 کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر ہوا، اور اس مسطر سے جو ماہر فن
 دیکھ بھال اور ناپ کر عمارت کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا تھا وہ مسطری
 کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مسطری کا مستری ہو گیا،
 اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے، اور ماہر کاریگر کے معنی میں بولا جاتا ہے،

بڑھینوں کی بول چال میں ایک لفظ خراو اور خراونا ہے، میزکری یا پلنگ
 وغیرہ کے پاؤں کو پھیل کر کہیں موٹا، کہیں پتلا، کہیں گاؤم وغیرہ شکلیں بناتے ہیں
 یہ خالص عربی لفظ خراط ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح پھیلنے کے
 ہیں کہ اس کی اوپری پرست اتر جائے، اس سے خراط بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی
 کو اس طرح پھیلا جائے، وہ خراط ہمارے ہاں خراو ہوا، اور اس سے خراو پر چڑھنا
 محاورہ اور خراونا مصدر بنا،

یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے
 ذریعہ ہندوستان میں آئی، اور پھیلی،

معارون کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساہول ہے، جسے
تاگمین ایک وزنی لوہا یا اور کوئی دھات گول سی بندھی ہوتی ہے، اس کو نیچے لٹکا کر
اونچائی سے دیوار کی سیڈھ دیکھتے ہیں، خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام
شا قول لکھا ہے، اور اس کی تشریح یہ کی ہے ہو ثقل یشتد بہ فی طرف جہل
یبتدء سفلی محتاج الیہ الجارون والبستاقون (لیڈن صفحہ ۲۵۵) یعنی وہ ایک
بوجھل چیز جو رستی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں، اس کی ضرورت بڑھوٹوں اور سماروں
کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شا قول
ہے، عربی میں شقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں، مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شا قول ش سے
نہیں بلکہ نا قول ش سے ہو یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی؛ مگر ہیئت کی کتابوں میں
بھی شا قول ہی دیکھا گیا ہے، کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے،

اسی کتاب میں بڑھوٹوں کے ایک اوزار کا نام الکوینیا بتایا گیا ہے، اور اسکی
تشریح یہ کی ہے یقتد سادون بھا الزاویۃ القائمة (۲۵۵) یعنی اس سے زاویہ
قائمہ نکالتے ہیں۔ کوئی کچھ کہے، ہونہ ہو یہ لفظ ہمارا کوینیا ہے، جسکو آج بھی ہمارے کادیگر
بولتے اور برتتے ہیں، اور اس کا تلفظ کٹینا ہے، یعنی وہ آلہ جس سے کوئہ (زاویہ) ناپیں
ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیاں ہوتی ہیں جنکو بخط مستقیم جوڑ کر کوئہ زاویہ قائمہ نکالتے ہیں
اور اسکی صورت یہ ہوتی ہے —

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ یہ لفظ اسے پرانے

زمانہ میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسط ایشیا تک کیسے چلا گیا، اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل میں اس کے لفظی معنی تو "سامان کرنے" کے ہیں، اس سے تجریر بنا جس کے جہاز یوں میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہر یار کے سفر نامہ میں ہے،

انہ جھڑم کبلاہ الی الزابجہ اس نے اپنا ایک جہاز سامان لا کر

جہاز بھیجا،

(ص ۱۰)

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی، لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامان تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے، حدود العالم میں جو ۳۶۱ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے، شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا، بعد کو سمجھ میں آیا کہ ابھی یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کر کے فقط "سامان" کی منزل میں پہنچا ہے،

و جہاز ہاے ہندوستان بدیں شہر کما افتد و انجا بردہ

ہندو جہاز ہندوستان افتد، (ایران)

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آگیا، اور سامان

تجارت کے بجائے سامان تجارت لیجانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے
ہندوستان میں اکبر کے زمانہ میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہو
وگفتہ فرنگیان جہازات متروک ساختند، (رج ۲ ص ۳۷، نو لکھنؤ)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا، اور سامان
تجارت اس سے رخصت ہو گیا،

اسی سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں، ایک جہیز اور دوسرا
تجہیز، جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف لڑکی کو ملتا ہے اس معنی میں
یہ لفظ بھی خاص ہندوستانی ہے، اس کی اصل جہاز ہے، سامان دنیا، یا سامان
کرنا، فارسی کے قاعدہ سے الف میں امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا ہے، اور اس
جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہیں رہا،

جہاز مردہ کے کفن و دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں، جس سے مصدر
تجہیز بنا، یعنی سامان کرنا، اس سے ہماری زبان میں کچھیر و تکفین کا لفظ پیدا ہو گیا،
ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتے اور معنی بدلتے ہیں ذرا اسی
ذرا پر غور کیجئے کیا عربی کا ذرہ نہیں جسکو آپ ذرہ بے مقدار کی صورت میں اچھی
طرح پہچانتے ہیں، مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا کے بہت ہی تھوڑے
کے معنی ہو گئے۔ اور ایسے ہو گئے کہ اب اس کو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا،
ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی سرخی یعنی عنوان ہے، دیکھئے

تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بنگیا، بات یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لئے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپہ ایجاد ہوا تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اس کو سیاہی ہی سے لکھیں، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آتی تھی، مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے نسخہ ہاتھ آگئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی ہر لگ گئی، شیخ نصیر محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آل محبوب بنشتہ بودند برائے سرخی بنشتہ
آں سپیدی بنشتہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند.....

ذات لفظ صلوة سرخی بنویسند؛ (کتبخانہ حکیم عبدالغنی مشرقی جالندھر شہر)

کا غذات کی مسل (دم س ل) ایک عام و فخری اصطلاح ہے، اس کی اصل عربی لفظ "مثال" ہے، سرکاری شاہی کا غذات کی اصل تو دو فقرتین رہتی تھی، اور اس کی بعینہ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوئے، اور اس کی جمع امثلہ اور مثل بنی، مثال اور مثل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی، مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخون میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے،

نستعلیق ایک خاص فارسی خط کا نام ہے، یہ اصل میں نسخ اور تعلیق کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ یہ کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں تو بیچ کا ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہیں، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں، اس مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا، تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونوں سے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانہ میں بنا، یہی خط ہے جس میں آجکل اردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق بول چال کی تشکیل پیدا ہوئی، چراغ ہدایت میں ہے،

”نستعلیق گوئی حرفہارا ساختہ گفتن و عبارت را بہ تکلف و اداسختن اثر گوئی“

”نستعلیق گویا قوت لب، ریحاں خط داغ“

اس کی ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی کہ نستعلیق لباس نستعلیق چال اور نستعلیق بول چال بن گئے بعض لفظوں کی ظاہری شکل و صورت کیسا دھوکا دیتی ہے، کتنے ہندوستان ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں کہ ولایتی معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سونلے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ چلیلا، جو غزل گو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اس کی شکل تو ہندی ہی ہے مگر ہے ایرانی، برہان قاطع میں ہے،

”جُلْبُلُہ بضم اول و باے اجد بروزن سُنْبُلہ شتاب واضطراب راگوئید“

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ جھیل بل سی ہے، اب غور کرنا پڑیگا
لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں، موٹے کپڑے کو ہم گفٹش کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہ
سے، فارسی میں اس کی صورت گبز ہے، رفیع اول و سکون ثانی و زائے نقطہ دار،
ہر چیز گندہ و قوی و وسیط راگوئید (برہان قاطع)، اس کی دوسری شکل غفص کی ہے، صورت
تو عربی ہے، مگر عربی نہیں،

اُھدی کے معنی ہماری زبان میں سست اور کابل کے ہیں، مگر ان سست کا بلو
کی پیداوار تاریخی ہے، اُھدی، اُھدی ہے، اُھد کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپا
جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو اُھدی (اکیلا)
کا لقب بخشا، یہ اُھدی کھاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے، کوئی کام کاج
ان سے متعلق نہ تھا، اس لئے زبانِ خلق نے اس کو سست و کابل کے معنوں میں
اکھڑکا را، زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے،

ہماری زبان میں ایک لفظ قلعی ہے، ایسے اسکی بھی قلعی کھولیں، ہم لکھتے کو قلعی
مگر بولتے قلعی ہیں، ہماری زبان میں اس کے معنی پیدید اور صفائی کے ہیں، بتونوں
پر قلعی کیجاتی ہے اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے،

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے، قَلْعَی عربی میں
(لسان) اور اس سے فارسی میں (مؤید الفضلاء) رائے کو کہتے ہیں، مگر رائے کو قلعی کہتے

کہتے ہیں، لسان العرب کا بیان ہے کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قم نچھتی تھی اس لئے اس کی طرف نسبت کر کے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں، اور چونکہ اسی رانگے سے تاجے کے برتنوں پر سپیدی پھیری جاتی ہے، اس لئے اسکو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکالون پر سپیدی پھیری گئی تو اس کو بھی قلعی پھیرنا کہنا، ہماری زبان ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے تو وہ اس پر قلعی پھیرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کر کے سب کو دیکھا جائے تو وہ قلعی کھولنا ہوا،

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے لیکن معنی عجیب ہیں، یہ تماشے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں، اس کو باب تفاعل میں لے گئے تو تماشہ ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے، عجیون نے تماشے کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنایا، جیسے تمہنی کو تماشا بنایا چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند اجاب ساتھ ل کر چلتے ہیں، اس لئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا،

بجرم عشق تو مارا کشند غوغا نیست

تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا نیست

(معارف - مئی ۱۹۳۹ء)

تہنید

”تہنید“ کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو ”ہندیا نا“ کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے چلی، وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خرا دو کر اس کو عربی بنا ڈالتے تھے، تو وہ اپنے اس عمل کو ”تعریب“ کہتے تھے، یہی علما فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اس کو ”تفریس“ کہا، یعنی فارسی بنالینا، اب جب اہل ہند یہی کریں، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش کر کے اپنی زبان میں ملا لیں تو اس کو ”تہنید“ کہیں گے،

یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں کہ زبان ترقی پاسکے،

بات یہ ہے کہ زبان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور ادلتی بدلتی رہتی ہے، جو زبان بڑھنا چاہے گی اس کو دنیا کی دوسری زبانوں سے سروکار رکھنا پڑے گا اور قوموں کے میل جول کے ساتھ ان کی بولیوں اور لفظوں کی آمد و رفت بھی لگی

رہیگی، اس کا اثر یہ ہوگا کہ اس میں دوسری زبانوں کے لفظ ملتے رہیں گے اور بدلتے رہیں گے،

ہر زبان کے لفظوں میں حرفوں کی خاص ترتیب، اور اس ترتیب کے خاص شکل پیدا ہوتی ہے، جس طرح انسان انسان سب برابر ہیں، پھر بھی فرنگی، چشتی، ہندی، چینی، ترکی سب کی شکلیں ایک نہیں ہوتیں، ہر ایک کا رنگ، روپ اور ناک نقشہ ایک نہیں ہوتا، یہی مختلف بولیوں اور ان کے لفظوں کا حال ہے، اسی لئے ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ پتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ ہی کرے مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکیگا وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، اور نہ وہ ہمارے لچہ سے ہمارے لفظوں کو نکالے گا، وہ اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کر سکتے، ع، ا، اور الف میں اور ث، ص، اور س میں اور ط میں وہ فرق نہیں کر سکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے یہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بریکنگ چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت

اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

سہار کے معنوں میں راج کی اصل عربی اور فارسی میں نہ تھی مگر ہمارے ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تہی ہے، مگر فارس والوں نے اس کو یا تو متنا کر دیا اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا، عربی تہاشی کو ایرانیوں نے تہاشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تہاشا پسند آیا، لائین کی اصل لٹرن ہے، مگر ہم کو لائین ہی کی روشنی پسند ہے، بن انگریز ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو تمام ہے جو ٹین کی بگڑی ہوئی شکل ہے،

لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیون نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادلہ بلوانے کی کوشش زبردستی ہے۔

تھا ذ کی عربی اصل محاذی، اور ہندوستانی ورے (دنی میں بولا جاتا ہے) کی اصل عربی وراہ ہے، مگر اب محاذ اور ورے کو چھوڑ کر ان معنوں میں محاذی اور وراہ نہیں بولا جائیگا، تبدیل کے مقابلہ میں تبدیلی غلط ہی ہو، مگر وہ ہمارے ہاں صحیح ہے، خود صحیح کو سستی ہم نے کر دیا ہے، اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لئے ہیں، احوال عربی میں جمع ہی کیون نہ ہو مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے، معنی کا لفظ عربی میں واحد ہے، مگر اردو والے اس کو جمع بولتے ہیں، "تحت" عربی کے لحاظ سے بے ہے مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح اور بامعنی لفظ ہے، آشا ہندی کا چاہے کھ لفظ ہو مگر ہماری زبان میں وہ اس ہنکریا ہے، اور وہی صحیح ہے، ہندی میں وچار لفظ ہو ہو مگر وہ ہمارے ہاں بچار ہے،

اسی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور یورپ کی زبانوں کے ہزاروں لفظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان میں ایسے رل مل گئے ہیں کہ ان کو پہچان پہچان کر اگر ہم ان کی اصلی شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی، اور ایسے پریسیوں کی بھیڑ ہر جگہ دکھائی دیگی جو ہمارے دس کے قانون کو نہیں مانتی، اس لئے ان پریسیوں کو اس دس میں رہنے سننے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ہمارے دسی قانون کو قبول کر کے دسی بنجائیں، دسی لفظی شکل و صورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات ہیں، ہزاروں عربی اور فارسی کے ایسے لفظ ہیں جن کے معنی خالص ہندوستانی ہیں، جنکو عربی اور فارسی والے جانتے بھی نہیں، اور وہ اسی قاعدہ کے مطابق بنے ہیں،

اسی سے کسی زبان کی خود مختار حکومت کا پتہ چلتا ہے، لفظ خواہ کسی قوم اور ملک کے ہوں، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو انکی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو پیدا کیے ہوئے ہوں، لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بن جاتے ہیں تو اسی دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے،

کسی لفظ کو ہندوستانی بنالینے کے بعد ہم کو حق ہے کہ ہم اس کے وہ معنی سمجھیں جو اصل معنی سے مجاز کے طور پر یا اس کے قریب ہونے یا کسی اور لگاؤ کی وجہ سے ہمارے

زبان میں پیدا ہو گئے ہیں،

اسی فقرہ میں دیکھئے کہ ”وہ“ عربی لفظ ہے، عربی میں اس کے معنی ”منہ“ کے ہیں، اس سے رُخ کے معنی پیدا ہوئے، اور اس سے سبب کے معنی پیدا ہو گئے، خود سبب کیا ہے؟ عربی میں اس کے معنی رستی اور ڈوری کے ہیں، جس سے کسی کو باندھا جائے، اس سے عربی میں ذریعہ کے معنی پیدا ہو گئے، اس سے اہل فلسفہ و فاضل اور اردو والوں نے اس کو علت اور وہم کے معنی میں بول دیا، اور لیجئے اس کی جمع اسباب بنائی اور اس کے دو معنی قرار دیئے جب اس کو مفرد کے طور پر بولیں تو سامان سمجھیں اور جب جمع بولیں تو وہ سبب کی جمع ہے،

اسباب کے معنی سامان کے نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں، خالص ہندوستانی میں ہیں۔ میں نے معارف میں ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھ دی تھی، میرے مخدوم دوست تید مقبول احمد صاحب سمدانی نے جو بڑے نستعلیق انشا پرداز اور نقاش پسند اہل قلم ہیں خط لکھ کر مجھے فوراً لٹوکا کہ ”عربی میں اثر کی جمع آثار ہے، اثرات نہیں“ میں نے مذاقاً جواب دیا کہ میں نے وہ لفظ اردو میں لکھا ہے، عربی میں نہیں، لیکن یہ مذاق میں ٹالنے کی بات نہیں، خدا جانے اور کتنے فضلاء اس قسم کی بالارادہ غلطیوں کو لکھنے والوں کی جہالت سمجھتے ہوں گے، مگر بات یہ نہیں، عربی میں ”اثر“ کے معنی زمین پر قدم کے نشان کے ہیں، قرآن میں ان ہی معنوں میں

یہ لفظ آیا ہے، اہل فلسفہ کو اپنے لئے لفظوں کی ضرورت پڑی انھوں نے اسکو لیا اور اس سے تاثیر اور تاثر اور اثر بمعنی نتیجہ کئی لفظ بنائے، اس سے فارسی اور اردو میں اثر نتیجہ کے معنی میں آگیا، یعنی جس طرح قدم اٹھ جانے کے بعد قدم کا نشان رہ جاتا ہے، اسی طرح کسی شے کے ہٹ جانے یا مٹ جانے کے بعد اس کا جو نشان رہ جائے اس کو اس کا اثر کہنے لگے، اب اس کے بعد اثر خاصیت کے معنی دینے لگے، جیسے فلاں دوا کا اثر یہ ہے، میری بات کا اثر یہ ہے، ملک میں ان کا اثر ہے،

اب جمع میں آئے، اس کی عربی جمع آثار بنی، لیکن اردو میں اس کے معنی قرینہ کے ہون گئے جیسے آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر دیوار کا آثار ہے، یا پرانی یادگار کے معنی میں ہے، جیسے آثار قدیمہ اسی لئے اثر نتیجہ یا تاثیر کے معنی میں جب بولین گے تو اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی، خواہ وہ عربی کے محاط سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو،

قرینہ ہی کا لفظ دیکھئے، عربی میں قرون کے معنی ملانے کے ہیں، قرین ان دو جانوروں میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں جن کے پاؤں ایک رستی میں ملا کر بانڈ دیئے جائیں، اس سے قرین کے معنی عربی میں ہمسر کے اور قرینہ کے معنی بیوی کے ہو گئے، لیکن اردو میں قرین کے معنی قریب، نزدیک اور پاس کے ہیں اور قرینہ کسی شے کے ہونے کے قیاسی لوازم، جیسے قرینہ یہ کہتا ہے، قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، اب لوازم کو دیکھئے، عربی لزوم اور لزوم سے نکلا ہے، لازمہ کی جمع ہے،

کسی شے سے چپک جانے کو لزوم کہتے ہیں، اس سے اہل منطق نے ایسے مفہوم
 و معنی میں جس کا کسی دوسری شے سے چپکار ہونا ضروری ہے یا وہ اس سے الگ
 نہیں ہو سکتا اسکو استعمال کیا، اسی سے ہماری اردو میں لازم کے معنی ضروری کے
 ہو گئے۔ اس کی جمع کسی طرح لوازم بنی، اب اردو میں اس کی جمع لوازمات بنائی
 گئی، اور اس کے معنی کسی شے کے ضروری سامان و اسباب کے ہو گئے۔ لوازمات
 کے اس معنی کا اردو واحد سنئے لوازمہ، جس کو عربی سے ادنیٰ تعلق نہیں!

جنس کا لفظ کون نہیں جانتا، مگر یہ جنس عرب کی نہیں، یونان کی ہے، عربی
 میں منطق والے لائے، اور اس کی تعریف کر کے اس سے جنس، مجانست،
 تجانس وغیرہ مصدر بنائے، جنس منطق کی اصطلاح میں اس کلمی (عام چیز) کو کہتے
 ہیں جس کے تحت میں کئی مختلف حقیقتوں کی اشیاء داخل ہوں، جیسے حیوان کہ
 انسان اور گھوڑے گدھے، گائے بھینس، بکری وغیرہ ہر جاندار کو کہتے ہیں، اب
 اس سے ادبی جنس پیدا ہوئی، یعنی کسی حقیقت مشترکہ کے مختلف افراد، اس سے
 بنائے جنس بنایا (ایک جنس کے بیٹے) یعنی ایک حقیقت کے سارے شریک
 جیسے سارے انسان آپس میں ابنائے جنس ہیں، اب اس سے بھی خاص ہو کر
 ہم جنس بنا،

کنہ ہم جنس با ہم جنس پر واز

کبوتر با کبوتر باز با باز

اب اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں جنس کے معنی قسم ہو گئے، اور خاص طور سے غلہ کی قسم کے ہو گئے، کہتے ہیں نقد و جنس "نقد کے معنی روپیہ پیسے کے اور جنس غلہ یا سامان، اس کی جمع اجناس جو بتی، تو یہ غلن کے اقسام پر مشتمل ہو گئی، اور نرخ اجناس کی صورت میں اس کی جنس ہی بدل گئی،

لفظ نقد کو تو دیکھئے کہ یہ کیا ہے، نقد کے عربی معنی پر کھنے کے ہیں، اس سے ریو کے معنوں میں آجکل نقد یا تنقید بولتے ہیں، چونکہ پرکھے سکے جاتے ہیں، اس سے فارسی میں نقد کے معنی سکے کے ہو گئے، اور دام کی صورت میں سکے دیئے جاتے ہیں، سئلے اردو میں نقد دام کے معنی اس دام کے ہوئے جو فوراً دیئے جائیں، اور نقد اور ادھا دو مقابل کے اردو لفظ ہو گئے،

خیر، عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی بھلے اور نیک کے ہیں، ہماری زبان میں یہ لفظ ایک تکیہ کلام کی صورت میں ہے، اور اکثر ذرا وقفہ کے طور پر یہ بول دیا جاتا ہے پھر ہم نے اس کی اور ت لگا کر اس کو خیریت بنا دیا، اور اس کے معنی اچھی خبر کے ہو گئے، ات لگا کر اسکی بے قاعدہ جمع خیرات بنا دی تو صدقہ کے معنی ہو گئے،

عربی میں مؤنث لفظون کی جمع سالم بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے آخر میں ات لگا دیئے جائیں جیسے سلمہ سے مسلمات، مگر پہلے فارسی والون نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے اس میں ایسی آزادی برتی کہ فارسی اور ہندی لفظون تک کی جمع اس طرح بنانے لگے، جیسے کاغذات، دستاویزات، دیہات، اس سے زیادہ لطف

کی بات یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں ۵ دیکھا اس میں بات لگا دیا، جیسے صوبہ جات،
میوہ جات، علاقہ جات،

علاقہ ہندوستانی میں زمینداری کے گاؤں کو کہتے ہیں، عربی میں اس کے معنی
لگاؤ کے ہیں، اسی لگاؤ سے ہر چیز جس سے آپ کو لگاؤ ہے، آپ کا علاقہ ہے، غلہ
کے معنی عربی میں بے وفائی کرنے کے ہیں، اس سے اُس بے وفائی کو کہنے لگے جو فوج
اپنے عہد کو توڑ کر اپنے افسروں سے کرے اس فوجی بے وفائی کا نتیجہ بد امنی
ہے، یہ دونوں معنی ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور بڑے شہروں میں بد امنی کے
واقعات زیادہ پیش آتے ہیں، تو بڑے شہر کو ہم نے عدا شہر کہ دیا،

ایک جائیداد کی فروخت کا ذکر ہو رہا تھا، اس پر ہمارے گاؤں کے ان پڑھ
ہندو پیٹواری نے کہا ”دیکھ لیا جائے کہ میں جدا دہبوس تو نہیں ہے“ جدا تو میں سمجھا کہ
جائیداد ہے، مگر دہبوس نہیں سمجھا، مگر سوچتا رہا، کچھ دنوں کے بعد خیال آیا کہ یہ عربی محبوب
ہے جس کے معنی ”قیدی“ کے ہیں، اسی سے حبس اور محبوب عربی میں وقف کے معنی
میں ہیں، اب معلوم ہوا کہ وہ پرانے شاہی کاغذات کی اصطلاح بول رہا، مقصود یہ تھا
کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ جائیداد کہیں قید تو نہیں، یعنی کسی کے رہن، یا بیع میں تو نہیں،
تقریب کے معنی نزدیک کرنا، پھر جو کسی مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہو
اس کو تقریب کہا، اب ہندوستانی ملاقات کے ذریعہ کو تقریب کہنے لگے،

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے،

ملنے ملائے کا سب سے عمدہ موقع کسی شادی اور خوشی کے مراسم کا موقع ہی، اس لئے ہم شادی و خوشی کے موقعوں کو تقریب کہنے لگے،

جناب کے معنی چوکھٹ کے ہیں، بادشاہوں سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا جاتا تھا، اس لئے ان کے استانہ اور چوکھٹ کی طرف نسبت کر کے بات کہی جاتی تھی، اس سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہو گیا،

حضرت بھی بڑے حضرت ہیں، حضرت کے اصلی معنی حاضر ہونے کے ہیں، اس سے حضرت کے معنی عربی میں بادشاہ کے حضور اور پیشگاہ کے ہوئے، ہمارے ہندوستان میں اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہو گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مغلوں کے زمانہ میں بنایا سے پہلے بندگی، اور خدمت کے لفظ تھے، ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں،

حضرت ہی کی دوسری صورت حضور ہے، اس کے بھی وہی معنی اور وہی روداد ہے، حضرت کے ساتھ صاحب کا بھی خیال آیا، صاحب کے عربی معنی ساتھی کے ہیں، اس سے عربی میں والا کے معنی پیدا ہوئے، جیسے صاحب علم (علم والا) اسکے بعد وزیروں کو جو بادشاہوں کے ساتھی اور مصاحب ہوتے تھے، صاحب کہنے لگے، جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ، اب صاحب کے معنی آقا کے ہوئے، اور ہر نام کے آخرین تعظیم کے لئے لگنے لگا، انگریز آئے تو وہ سارے ہندوستانیوں کے آقا ٹھہرے، اس لئے وہ صاحب ہوئے،

ایک بادشاہ کی جگہ پر جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو اس کے لئے عربی

کا لفظ جلوس غیر عربوں نے استعمال کیا، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اور سال جلوس
 تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی، اور چونکہ جب نیا بادشاہ پہلی دفعہ تخت پر بیٹھا
 تھا، تو تزک و احتشام اور لاؤشکر کے ساتھ نکلتا تھا تو ہم ہندوستانی تزک و
 احتشام کے ساتھ کسی مجمع کے نکلنے کو جلوس کہنے لگے، اس کو عربی سے کوئی تعلق نہیں
 اور جب بادشاہ اور حاکم دربار میں بیٹھے تو ہم نے جلوس سے اجلاس بنا لیا، جس کے
 معنی بٹھانے کے ہیں، اور اب نئے زمانہ میں انجمنوں اور جلسوں کے بھی اجلاس ہو
 جس جگہ بیٹھیں عربی میں اس کو مجلس کہتے ہیں، بعض علماء اور صوفیہ نے یہ طریقہ
 اختیار کیا تھا کہ خاص دنوں میں بیٹھ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے یا درس دیتے،
 اس سے اس قسم کی نشست کو اور پھر اس نشست کی تقریروں کو مجلس کہنے لگے،
 ہندوستان میں ایسی نشستوں کو کہتے ہیں جن میں لوگ مذہبی اور علمی تقریریں کرتے
 یا مرثیے پڑھتے، اور اس سے ہم نے علم مجلس بنایا، جس میں تہذیب و شائستگی کے ساتھ
 مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سلیقہ اور چسپی کی باتیں کرنے کے ڈھنگ سکھائے گئے،
 جلوس سے قعود یا د آیا، قعود کے معنی بھی عربی میں بیٹھنے کے ہیں، اس سے
 عربی میں لفظ قاعدہ بنا اور اس کے معنی بنیاد کے ہوئے، یعنی دیوار کا وہ حصہ جو
 کے اندر بیٹھے، چونکہ بنیاد ہی کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے اس لئے اہل
 علم نے اپنی اصطلاح میں ان اصول کو جن پر بہت سے مسئلوں کی بنیاد ہو قاعدہ
 کہا، اور اب ہماری زبان میں قاعدہ قانون کے معنی دینے لگا، اس کی جمع قواعد بنائی

اور اس کو جمع مذکر کے طور پر استعمال کیا، تو اس کے معنی جزئی قانون کے ہوئے، لیکن ہم نے فوج کے نظم و ضبط اور ترتیب کے ساتھ چلنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے کے قاعدے بنائے تو ان کا نام بھی قواعد رکھا، اور وہ ان معنوں میں واحد مؤنث ہے اور خالص ہندوستانی ہے،

قاعدہ کے ساتھ اصول پر نظر رہے، یہ عربی میں اصل کی جمع ہے، اصل کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں، اس لئے جس ایک بات کی جڑ پر مسئلوں کے بہت سے تنے کھڑے ہوں اس بات کو اصل کہنے لگے، اور اس کی جمع اصول بنائی، مگر جب ہم ہندوستانیوں نے اس کا استعمال کیا تو واحد کی صورت میں تو اصل کے معنی حقیقی اور واقعی کے کر دیئے اور جمع کی صورت میں اصول کے معنی قاعدوں کے کر دیئے اور اس جمع کو واحد بنالیا، اور کہنے لگے ایک اصول یہ ہے، دوسرا اصول یہ ہے اور جب اس کی جمع کی ضرورت ہوئی تو اردو کے قاعدہ سے اصولوں کو دیا، اور کہا کہ ان اصولوں سے ہکوا نکار نہیں،

مادہ، تد سے اسم فاعل مؤنث ہے، اس کے معنی پھیلنے پھیلانے کے ہیں اور مادہ کے معنی پھیلنے والے کے لئے، یونانی زبان سے فلسفہ کا ترجمہ جب عربی میں ہوا تو حجم کی صورت میں جو چیز پھیلی ہوئی ہے، اس کا نام مادہ گھر کر رکھا، اور اس کی جمع مواد بنائی ہماری زبان میں یہ لفظ مواد واحد کی صورت میں زخم کے اندر جو چیز بھری ہوتی ہے، اس کے لئے بولا جانے لگا، انگریزی میں مادہ کو میٹر کہتے ہیں، اور کسی مضمون کے معلومات

کو بھی میسٹر کہتے ہیں، اس لئے ہماری زبان میں میٹر کا ترجمہ بھی مواد ہوا، اور بولا جانے لگا،

حکیم بہم مرحوم (مشرق گو رکھ پور کے اڈیٹر) نے مجھ سے کہا تھا، کہ اصول اور مواد ان دونوں لفظوں کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں ان نئے معنوں میں استعمال کیا،

دولت عربی لفظ ہے، معنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا، عربی میں جب مختلف سلطنتیں یکے با دیگرے بین اور مٹیں تو سلطنت کو دولت کا نام دیا گیا اور جمع دُول بنائی گئی، ان معنوں میں آج بھی دولتِ برطانیہ اور دُولِ یورپ ہم بولتے ہیں، سلطنت اور بادشاہی خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہے، اس لئے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنوں میں بولنے لگے، جس کی یادگار فارسی کے بدولت ہماری ہندوستانی میں بھی لفظ بدولت بولا جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں آپ کے بدولت یہ ملا اور پھر بدولت ذریعہ کے معنی میں ہو گیا، خوش قسمتی کی بڑی نشانی زرو مال ہے اس لئے یا اس لئے کہ یہ زرو مال بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا ہے، اس کو بھی دولت کہنے لگے، اور اس سے دولت، دولت مند اور دولت مندگی کے لفظ ہندوستانی کو ہاتھ آئے،

عربی میں غصہ کے معنی حلق میں کسی چیز کے اچھو ہو جانے یا ٹک جانے کے ہیں، ہندوستانی میں اس کے معنی غیظ و غضب کے ہو گئے، خفا فارسی میں خفہ ہی اور معنی

وہی گلے میں اٹکنے اور پھنسنے کے ہیں، ہندوستانی میں خفا ہونا، ناراض ہونے کے معنی میں ہے،

بعض لفظ خیالات کے بدولت ہاتھ آئے ہیں، عربی میں فلک آسمان کو کہتے ہیں، چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتیں ^{ان} کی گردش کا نتیجہ ہیں، اس لئے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا، اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا) کیا، اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اسکا مفعول مفلوک بنایا، اور عربی اضافت دے کر مفلوک الحال کہہ دیا، حالانکہ اسکے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں،

ہر لفظ پر اس تفصیل سے لکھنا پوری تصنیف کے برابر ہے، اس لئے ہم ذیل میں کچھ اور ایسے عربی لفظ لکھ دیتے ہیں جن کے معنی ٹھیسٹ ہندی ہیں، یا فارسی کے اثر یا اہل فلسفہ کی اصطلاحوں سے ایسے معنوں میں بولے جاتے ہیں جو عربی قطعاً ^{نہیں}

عربی	عربی معنی	اردو معنی
قطعاً	کا ٹکر (یعنی ہر شک کو کاٹ کر)	یقینی طور سے
نفاذ	پسیٹ	خول، نفاذ
نارت	نوٹ	بربادی
اعترض	آگے آ جانا، سامنے پھیل جانا	اعترض کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
عرض	پھیلانا	پیش کرنا
مقدمہ	آگے کیا ہوا	جو جھگڑا عدالت میں پیش ہو،
ممانت	بھاری ہونا،	مہذب ہونا
متین	بھاری	مہذب
میزان	تول، ترازو	جمع
مذاق	چکھنا	ظرافت
اہتمام	غم کھانا	اہتمام کرنا
مہتمم (صحیح مہتمم)	غم کھانے والا	مہتمم
انتظام	دھاگے میں پرایا جانا	انتظام کرنا
منتظم	دھاگے میں پرایا جانے والا	انتظام کرنے والا
غلام	لڑکا	غلام، بندہ
فرض	واجب کرنا	ذمہ داری
وئی	دوست، دوست متولی	سرپرست، خداریدہ (خدا کا دوست)
مُحاذ	مقابل	لڑائی کا میدان
فوج	گروہ، جھنڈ	لڑائی کا لشکر
محنت	رنج و تکلیف	محنت یعنی پوری کوشش

عربی	عربی معنی	اردو معنی
شکل	مثل، مشابہ	صورت
شکلیں	ہم مثل	خوبصورت
نقل	کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا	ایک جگہ کی خبر کو دوسری جگہ بیان کرنا
منطوقہ	دیکھا گیا	قبول
دماغ	دماغ	دماغ، غرور
مدتغ	x	مغرور
غرور	دھوکا	غرور
مغرور	دھوکا کھایا ہوا	مغرور
انکسار	ٹوٹنا	خاکساری
استقلال	کم سمجھنا	مضبوطی، ثابت قدمی
عمارت	آبادی	بڑا مکان
تعمیر	آباد کرنا	بڑی عمارت بنانا
کسر	ٹوڑنا	(اردو کسر) عیب، کمی
اجلاس	بٹھانا	عدالت یا انجمن کی نشست
ضبط	نگاہ رکھنا	ضبط کر لینا، حاکم کا چھین لینا
ضابطہ	نگاہ رکھنے والا	قاعدہ

عربی	عربی معنی	اردو معنی
تقریر	ثابت کرنا	تقریر کرنا
مقرر	ثابت کرنے والا	تقریر کرنے والا
اقبال	سامنے آنا	خوش قسمتی
ادبار	پیچھے ہونا	تنزل
اقبال	x (بے معنی)	اقبال کرنا، قبول کرنا
رقم	لکھنا	تعداد، چیزوں کی قسم
خراب	ویران	ہڑا، مست
وقت	بابیکی	مشکل
غلیظ	موٹا	نخس
امیر	حاکم	دولت مند
غریب	مسافر	مفلس
ترتیب	مٹی	قبر
نفسانیت	جان ہونا	خود غرضی
غرض	نشانیہ	مقصد
غایت	گھوڑ دوڑ کی اخیر حد	غرض، آخری حد
عومہ	میدان	مدت
مدت	دراز می	زمانہ

عربی	عربی معنی	اردو معنی
محصول	جس کا حصول ہو	ٹیکس
موضع	رکھنے کی جگہ	گاہ
مکان	ہونے کی جگہ	گھر
بخار	بھاپ	بخار (تپ)
احاطہ	گھیرنا	گھیرا
خاطر	دل میں کھٹکنے والا	نہان کی عزت کرنا
منت	احسان	عاجزانہ خوشامد
حلوا	میٹھا	حلوا
دہشت	تعجب و حیرانی	خوف
شہوة	کسی قسم کی خواہش	جنسی خواہش
اشتها	”	کھانے کی خواہش
مُبلغ	کسی حد تک پہنچا ہوا	روپیوں کی تعداد
ماتم	میت پر غم کرنے کیلئے جمع ہونے کی جگہ	میت کا غم
حقہ	ڈبیا	حقہ

اس قسم کے ہزاروں عربی لفظ ہیں جو اپنے خاص معنوں میں ہماری ہندوستانی کے خاص لفظ ہو گئے ہیں، یہی حال فارسی کا بھی ہے، فارسی کے بہت سے لفظ اور

ترکیبین ہیں، جنکو ہم نے اپنے ہندوستانی معنوں کے لئے ہندوستانی لفظ بنایا ہے فارسی
 میں خانہ لگا کر ظرف اور مقام کے معنی کے لفظ بنائے گئے ہیں، جن کی صورت تو فارسی
 کی ہے، مگر معنی اور استعمال سراسر ہندی ہیں، جیسے پاختانہ، عسلیانہ، بادوچی خانہ، بندٹی خانہ
 اسی طرح فارسی میں دان لگا کر بھی ظرف بتاتا ہے، جیسے خاکدان، یعنی زمین، ہندوستانی
 نے اس کو اپنے میسون لفظ بنائے جیسے پائندان، اگائدان، خااعدان، عطر دان، گلدان
 جزدان، چائندان، دودھ دان، شکر دان، روشندان، نابدان، سنگار دان، شمع دان
 تصغیر کے لئے دان کو ہم نے کبھی دانی بھی کر دیا، جیسے سرمہ دانی، گوند دانی، چھڑ
 دانی، تلے دانی (سوئی تاکا رکھنے کے لئے)۔

گیر (لینے والا) لگا کر فارسی میں اہم مرکب بنائے جاتے ہیں، جیسے دگیر، جاگیر
 ہم نے اس سے لفظ بنا کر بہت سی چیزوں کے نام رکھ دیے، جیسے خوگیر (خو کے معنی
 فارسی میں پسینہ کے ہیں) عوق گیر، کفگیر، نگیر، پھر اس سے نگیر (نم یعنی شبنم چونکہ اس قسم
 شبنم سے شبنم سے بچاؤ مقصود ہے اس لئے نگیر کہہ دیا) دیوار گیر (پہلے اس کپڑے
 کو کہتے تھے جو دیوار پر آرائش کے لئے لگاتے تھے، تاکہ دیوار سے پیٹھ ٹیکنے میں کپڑا
 خراب نہ ہو، اب اس لیمپ کو کہتے ہیں جو دیوار میں لٹکایا جائے،

اس سلسلہ میں جاگیر تاریخی لفظ ہے، جاگیر کے لغوی معنی تو جگہ لینے والا ہیں، بادشاہ
 اپنے امیروں کو منصب کے ساتھ جو گاؤں دیتے تھے، جہاں جاگیردار اکثر قیام کرتے
 تھے، اس کو جاگیر کہنے لگے، رفتہ رفتہ جاگیر کے خاص معنی ہو گئے، یہاں تک کہ غریب و سلبو

کے کھانے کے ٹھکانے کو بھی جاگیر کہنے لگے،

اسی سے ملا ہوا جادو کا لفظ ہے، فارسی لفظ کی اصل صورت جادو ہے، معنی "دی ہوئی جگہ" بادشاہ کی طرف سے امیرون کو جو گاؤں ملتے تھے وہ جاے داد تھی، رفتہ رفتہ جادو نے زمینداری اور ملکیت کے معنی پیدا کر لئے، زمیندار اور زمینداری بھی لفظ میں فارسی ہیں اور معنی میں سرسر ہندی،

تتخواہ کے لفظی معنی بدن کا چاہنے والا، معنی یوں پیدا ہوئے کہ مغلوں کے زمانہ میں سرکاری امیرون کو خوراک وغیرہ کے لئے جو معاوضہ ملتا تھا، اس کا نام تتخواہ رکھا گیا، اب تتخواہ کے معنی مشاہرہ کے ہیں، ایرانی اس تتخواہ کے حرف سے بھی اقف بن گئے، ہندوستانی نے یہی عمل ہندی اور سنسکرت لفظوں کے ساتھ کیا ہے، ہندی اور سنسکرت لفظوں کو اپنانے کے لئے ان کی تشکیلیں بدلی ہیں، ان کو ہلکا کیا ہے، ان کی ترکیبوں سے نئے نئے لفظ بنائے ہیں،

ق منال، منہ ہندی ہے، نال نالی اور نلی لمبی سوراخ دایہیز کو کہتے ہیں، جیسے بندر کی نال، ویسی ہی نیچ کی نالی کے منہ پر جو لگایا جائے وہ منال ہے، گنگا اور جمنادو دریاؤں کے نام ہیں، سونے چاندی کے ملان سے جو تھاشی کی جائے وہ گنگا جمنی ہے، لفظ برہمنتر تھا جو ذرا بھاری تھا، اس کو ہماری زبان نے برہمن کر دیا، اسی طرح گنتر کو گن کر کے اس کو ہلکا کر دیا، برکھارت نے برسات کی شکل اختیار کی، وچار بچار ہو گیا، اور سو پنچ بچار کے ساتھ بولا جانے لگا، آٹا نے آس ہو کر یہ مثل کھوائی کہ

جب تک سانس ہے، تب تک اس ہے، اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کو ہندوستانی نے ذرا ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ میں رنگ کر ان پر زمانہ کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہے،

غرض عربی اور فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچوں کی تعداد بیشمار ہے، یہاں ان سب لفظوں کو پہچننا اور بتانا مقصود نہیں، مقصود یہ ہے کہ آج ہمارے سنسکرت دوست ہندو دوستوں کی جو یہ کہہ رہے کہ ہندوستانی زبان کے ہر ہندی یا سنسکرت لفظ کو اصل صحیح ہندی اور صحیح سنسکرت رنگ روپ میں دیکھیں اور اسی صحیح ہندی اور سنسکرت نام سے ان کو پکاریں، ان کو تسلی رہے کہ ہندوستانی نے عربی اور فارسی لفظوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے، اور ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنی رعایا بتانے کے لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کرے، یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے، اور کسی کی قدرت میں نہیں کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے،

(معارف ماہ جون ۱۹۳۹ء)



ہماری زبان

پیش

ہندوستان میں ہزاروں برس سے قوموں کا دیلا ہے، آریائی آئے، یونانی
 تاتاری آئے، سہتھین آئے، عرب آئے، ترک آئے، مغل آئے، پٹھان آئے، لیکن
 زبان سے بچا تو تو یہاں کس قوم کی اصلیت کیا ہے؟ ہندوستان کا خاصہ یہ رہا ہے کہ
 دوسروں کو اپناتا ہے، اور پچھلون کے لئے پہلون سے اپنی جگہ خالی کر لیتا ہے
 ہندوستان کے اصلی رہنے والے ڈراویدی، اور ہندوستان کی اصلی زبانیں ٹامل،
 تملگو اور کٹھری وغیرہ ڈراویدی زبانیں ہیں، سنسکرت اور پرانی ہندی خود باہر کی
 زبانیں ہیں، جبکہ اس ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ کا تعلق نہیں لیکن دیکھئے
 کہ ہندوستان نے ان کو ایسا اپنایا کہ وہ اب اس ملک کی اصلی زبان ہونے کا
 دعویٰ کرنے لگیں،

آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے معلوم نہیں وہ اس کو کب تک
 بولتے رہے، بہر حال اس میں میل ہوا اور اس سے اثر کر ایک دوسری زبان کا خاکہ
 تیار ہوا، جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ میں الگ الگ ہو گئی،

اسی طرح عرب عربی، ترک ترکی، بھل فارسی اور پٹھان پشتو بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، مگر آخرین سب بھول کر ایک ایسی زبان بولنے لگے جو اسی ملک کی پیداوار تھی، جس میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اپنی زبانوں کے بھی کچھ لفظ ملائے اور اس سے چارہ نہ تھا،

ہر فاتح قوم تلوار ہاتھ میں لے کر آتی ہے اور مفتوح قوموں کو ہٹا کر یا مٹا کر اپنے لئے راستہ صاف کرتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، فاتح اور مفتوح قوموں میں سخت نفرت اور دشمنی ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کو وہ وقت یاد نہیں جب وہ ترک پلج کھلاتے تھے، اور ہندوان کے سایہ سے بھاگتے تھے، اور مسلمان ان کو بت پرست کا فوجی حاکم حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے، صدیوں کی لڑائی جھگڑے، خونریزی اور فساد کے بعد دونوں قوموں نے ایک دوسرے کو سمجھا، اور ایک دوسرے سے قریب لگیں اور پورے ایک ہزار برس میں وہ اس قابل ہوئیں کہ وہ ایک ملک کی ایک ایسی متحدہ قوم بن سکیں جن کی زبان ایک ہو، اس لئے آج جو زبان ہماری زبان ہے وہ درحقیقت ایک دو دن، اور ایک دو نسل کی پیداوار نہیں، بلکہ پورے ایک ہزار برس کی کشاکش کشمکش، پھر سمجھوتہ، پھر میل جول اور میل ملاپ کا نتیجہ ہے،

دونوں قوموں نے اس میل ملاپ کے ذریعہ کو پیدا کرنے، ترقی دینے اور پھیلانے میں صدیاں گزاری ہیں، اور نسلیں مٹی ہیں، تب کہیں جا کر یہ مقصد

حاصل ہوا ہے، آریون نے اپنی سنسکرت، عربون نے اپنی عربی، ترکون نے اپنی ترکی، ایرانی اور مغلون نے اپنی فارسی اور پٹھانوں نے اپنی پشتو بھلا کر یا ملا کر اس زبان کا قوام تیار کیا، اور ایسی بولی سیکھی جسکو ہر کوئی اپنی بولی کہہ سکے، اور قوموں کے نسلی امتیازات، اور لسانی اختلافات کا خاتمہ ہو سکے،

اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہماری یہ زبان جسکو ہم اردو کہیں، ہندی کہیں، ہندوستانی کہیں، اسی سمجھوتے اور مفاہمت پر بنی ہے، کہ اس کی بناوٹ میں ہر قوم کی زبان اور ادب کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل رہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندو جیسے ملک کے لئے اس سے زیادہ بہتر ادبی سمجھوتہ ممکن نہیں،

اب ایک ہزار برس کے بعد اگر کوئی قوم یہ چاہتی ہے کہ اس دیس کی بولی اور ادب خالص کسی ایک نسل کی میراث کو قرار دے اور اس کو عربی یا فارسی یا ترکی یا سنسکرت بنانے کی کوشش کرے تو وہ درحقیقت ہمارے بزرگوں کی ایک ہزار برس کی زندگی کو خاک میں ملانا اور صدیوں کی محنتوں کو برباد کرنا اور ہندوستان کے بنانے والوں کی ان ہزاروں لاکھوں قربانیوں کو جو اس راہ میں انھوں نے کی ہیں، مستیامان کرنا چاہتی ہے، اور آج کے اس ہندوستان کو جس میں محبت کی نہرین بہ رہی ہیں، اور جو ہندو مسلمانوں کی گنگا جمنی سے جگمگا رہا ہے، اس زمانہ کا ہندوستان بنانا چاہتی ہے، جب محمد قاسم راجہ داہر سے یا محمود غزنوی راے جیپال سے یا شہاب الدین غوری پرتھی راج سے

لور ہاتھا، اور ہندوستان میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں،
 ہندوستان اب کسی ایک نسل کی ملکیت نہیں، اب چاہے وہ پرانے دربار
 اور آدمی ہندو ہوں، چاہے سیتھین راجپوت اور گوجر ہوں، اور چاہے آریں برہمن
 ہوں، یا عرب و ترک و تاتار و مغل اور پٹھان ہوں، اب وہ سب ہندی اور ہندو
 ہیں، اور ان کی ایک ہی زبان ہے جو خیر کے درون سے لے کر دریائے شور کے
 کناروں تک بولی یا سمجھی جاتی ہے،

اس میں شک نہیں کہ ابھی اس بولی نے دکن اور بنگال کے بہت سے علاقوں
 کو فتح نہیں کیا ہے، پھر بھی اتنے عرصہ میں وہ بہت سے صوبوں کو ایک کر چکی ہے،
 اور یہ کام ہمارے بزرگوں نے کیا ہے، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کو اور آگے
 بڑھائیں اور بنگال اور دکن کے علاقوں کو فتح کر کے ایک ایسا ملک بنائیں جسکی
 ایک بولی ہو، اس معاملہ میں سب آگے اہل بنگال کو ہونا چاہئے، اور ان ہی کی
 جیت سے اس کی جیت ہے،

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی کی صوبہ دار بولیاں بالکل بھلا دی جائیں،
 بلکہ یہ مطلب ہے کہ صوبہ دار بولیاں چاہے اپنی جگہ پر رہیں، مگر پورے ملک کیلئے
 ایک ایسی بولی ہو جائے جو سارے ملک میں سمجھی اور بولی جائے، جس سے پورے
 کا سراپچم سے اور اتر کا کوئٹہ دکن سے مل جائے، اور ایک دوسرے کے دل کی
 بات سمجھ سکے،

جو لوگ اس زبان کو اکیلے مسلمانوں کی زبان بتاتے ہیں وہ دیکھیں کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد جہاں جہاں آباد ہے وہاں کی یہ مادری زبان ہے، یا ان صوبوں کی ہے جہاں ہندو بھائیوں کی کثرت ہے، مسلمانوں کا بڑا حصہ بنگال، کشمیر، سندھ، سرحد اور پنجاب میں آباد ہے، ان میں سے ہر ایک صوبہ کی علمی و تعلیمی زبان گو ہندوستانی اردو ہے، لیکن ان کی مادری زبان بنگال میں بنگالی، کشمیر میں کشمیری، سندھ میں سندھی، سرحد میں پشتو، اور پنجاب میں پنجابی ہے، پنجاب کی سرحد سے لیکر بنگال کے حدود تک جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، یہ مادری زبان ہے، مگر سرحد، کشمیر، پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں نے ایسا کر کے اس ہندوستانی زبان کو اپنی علمی و تعلیمی اور ادبی زبان قرار دے کر ہندوستان کی وحدت اور اتحاد کا ثبوت ہم پہنچایا ہے، اب ضرورت ہے کہ بنگال، بمبئی اور مدراس کے رہنے والے بھی اسکو قبول کر کے اس کو ہندوستان کی عام زبان قرار دے کر ہندوستان کے شمالی اور جنوبی دونوں بازوؤں کو ایک ساتھ مضبوط کر کے پورے ملک کو متحد کریں، یوپی کے موجودہ وزیر تعلیم نے ہندوستانی زبان میں سنسکرت لفظوں کو جس حد تک ممکن ہو ملانے اور بڑھانے کی ایک ایسی عجیب دلیل دی ہے جو ایک وزیر کی ذہانت سے بہت کم درجہ کی چیز ہے، کہتے ہیں کہ مدراس اور بمبئی میں ہندو کے پھیلنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ سنسکرت لفظوں کو جس حد تک ہو اور زیادہ بڑھایا جائے، ہمارا شر کو نہیں کتنا، مگر جہاں تک دکن اور مدراس کا تعلق ہو وہاں

کی زبانیں ڈراویدین ہیں، جنکو سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ مدراس میں ہندی کے خلاف جو زبردست تحریک جاری ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی غیر برہمن ذاتیں اس برہمن زبان (ہندی) کو نہیں سیکھنا چاہتیں، وہ سمجھتی ہیں کہ اس کے ذریعہ مدراس کے برہمن ان کی ذات، قومیت، ادب اور تمدن کو فنا کرنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی لائق وزیر کی خدمت میں یہ کہنا ہے کہ اگر ہمارا شٹر گجرات اور مدراس میں سمجھے جانے کے لئے اس ہندوستانی میں پیش از پیش سنسکرت لفظوں کے بڑھنے کی ضرورت ہے تو سرحد کشمیر، پنجاب اور سندھ میں اس کے زیادہ سے زیادہ سمجھے جانے کے لئے عربی، فارسی، پشتو، کشمیری اور سندھی کے لفظوں کو اسی نسبت سے کیوں نہ بڑھا دیجئے، پھر دیکھئے کہ ایسی ملی جلی زبان صاف سادہ اور سہل اردو زبان کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، جس کو ملک کی نسبت سے ہم ہندوستانی کہہ سکتے ہیں، الہ آباد یونیورسٹی کے فاضل وائس چانسلر نے ہندی کے حق کو مضبوط کرنے کے لئے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ اردو ہندوستان کے شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی چونکہ ملک کا بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے، اس لئے شہروں میں بھی ہندی ہی کو رواج دینا چاہئے،

ایک بڑی یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر کا ادب ملحوظ رکھ کر یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ ہندوستان کوئی انوکھا ملک نہیں، دنیا کے ہر ملک میں شہری اور دیہاتی زبانوں کا فرق ہوتا ہے، مگر ہر ملک کی ادبی، علمی، تعلیمی اور مجلسی زبان

شہری ہی ہوتی ہے، دیہاتی نہیں، شہر اور دیہات کی زبانوں کا یہ فرق شہر اور دیہات کی زندگیوں کے فرق سے ہے، شہریوں کی ضرورتیں اور میل جول کے ذریعے دیہاتیوں سے بالکل الگ ہیں، اس لئے دونوں کی زبانوں اور نقطوں میں ہمیشہ فرق رہا ہے اور رہے گا،

اگر آج کوئی تلوار کی طاقت یا اکثریت کے قانون کی قوت سے کسی دیہاتی زبان کو علم و تعلیم اور ادب و مجلس کی زبان بنا بھی دے تو شاید چند سال بھی گزرنے نہ پائیں گے کہ پھر شہر اور دیہات کی زبانیں دو ہو جائیں گی،

پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہندوستان کے سارے دیہاتوں کی کوئی ایک ہندی زبان ہے، بلکہ پورے ملک میں تھوڑے تھوڑے فرق سے الگ الگ دیہاتی لہجے اور مقامی بولیاں ہیں، پھر ان میں سے کہاں کی دیہاتی بولی ہماری زبان کا معیار قرار پائے گی،

کسی کا یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ زبان کوئی جامد چیز ہے جس کو کوئی پکڑ کر ایک جگہ جمائے یا ٹھہرائے رہ سکتا ہے، بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی چیز ہے جو آج کہیں ہے تو کل کہیں ہے، چار سو برس کی پہلے کی انگریزی کو آج کی انگریزی سے ملاؤ تو معلوم ہو گا کہ یہ دو قسم کی زبانیں ہیں، آج ایران میں سندی اور حافظ کی زبان کہاں ہیں سارے عربی ملکوں کی زبان ایک ہی عربی ہے، مگر حالت یہ ہے کہ مصر کی عربی عراق کی عربی سے، اور مغرب کی عربی مشرق کی عربی سے بالکل مختلف ہے،

ہندوستانی اردو تو دنیا بھر کی زبانوں میں سب سے کم زبان ہے، ذرا سچا پورا اور گو گو لکندہ کے زمانہ کی زبان کو ولی اور ہاشم علی کی زبان سے ملائے اور ولی اور ہاشم علی کی زبان کو میر اور سودا کی زبان سے ملائے، اور میر و سودا کی زبان کا موازنہ آتش و ناسخ کی زبان سے کیجئے، اور آتش و ناسخ کی زبان کو امیر اور داغ کی زبان سے تولئے، اور پھر اس کو آجکل کے شعرا عزیز و محضی، اور فانی و حسرت کی زبان سے ملا کر دیکھئے، آپکو معلوم ہو جائے گا کہ زبان کا ہر دور بدل رہا ہے،

تشرین معراج العاشقین کا خواہ وہ نوین صدی ہی کی ہو، ذرا فسانہ عجائب اور طلسم ہو شراب سے مقابلہ کیجئے، اور پھر شرار اور سرشار کی زبان سے ملائیے، اور سرسید کی زبان کو دیکھئے کہ وہ حالی اور شبلی کے عہد میں بدل گئی، اور اب حالی و شبلی کی زبان بھی بدل رہی ہے، ہندی کا بھی یہی حال ہے، اصل راماین کی ہندی کو ملک جانی کی ہندی سے ملائیے، پھر کبیر کی ہندی پڑھئے، اور آجکل کی ہندی دیکھئے غرض یہ ہے کہ ہر زبان ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہے گی، اسکا چولا قصدا اور ارادہ سے نہیں بدلا جاتا، بلکہ زمانہ کا ہاتھ خود اس کو بدلتا رہتا ہے، ایسی حالت میں آج جو کشمکش جاری ہے وہ کتنی فضول ہے، اس کشمشی کو سمندر کے بہاؤ پر چھوڑ دیجئے وہ آپ بہر کمر سائل مقصود تک پہنچ جائے گی،

ہمارا یہی کہنا ہے اور ہم نے بار بار یہی کہا ہے کہ زبان وہ ہے جو چلن میں ہے جو ہندوستان میں عام بولی کی حیثیت سے بولی اور لکھی جا رہی ہے اور جس کو ہندو

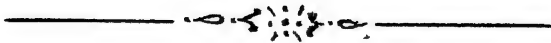
مسلمان بول اور سمجھ رہے ہیں، اور لفظوں کی جانچ کا طریقہ شہر سا گرا اور قاموس نہیں
ہیں، بلکہ ہمارے گھر اور بازار اور راستے اور گلی ہیں، اگر اس جانچ کے طریقہ کو مان
لیا جائے تو سمجھوتہ سامنے ہے،

ابھی انجمن ترقی اردو لکھنؤ میں صوبہ کے ایک ذمہ دار وزیر نے فرمایا ہے کہ لو
سنسکرتی ہندی اور عربی و فارسی آمیز اردو سے کیوں گھبراتے ہیں، کیوں دونوں کو
بڑھتے نہیں دیا جاتا، پوچھنا یہ ہے کہ جب اس صوبہ کے رہنے والے دو ایسی زبان
میں بٹ جائیں گے جن میں سے ایک کا بولنے والا دوسرے کی نہ سمجھ سکے، تو
اس صوبہ کے رہنے والوں کی آپس کی بول چال خط کتابت، لین دین، لکھنا پڑھنا
کس زبان میں ہوگا، اور ایک دوسرے کے میل ملاقات کا ذریعہ کیا ہوگا، اور
اس ہندو مسلم اتحاد کا کیا حشر ہوگا جس کے لئے ہم سب بیچیں ہیں، یہ کہنا کہ اس کے
لئے وہی زبان کام آئے گی جو ہمارے درمیان صدیوں سے کام آ رہی ہے تو
کہنا تو یہی ہے کہ پھر یہی ہماری سرکاری اور ادبی اور تعلیمی زبان کیون نہ ہو،

بہر حال اب جہاں تک حالات سے اندازہ ہوتا ہے، ہمارے سنسکرت
دوست دوستوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ دلیل و حجت اور معقولیت کی پروا کئے
بغیر عملی طور سے وہ وہی کریں گے جو وہ طے کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ وہ پوری کوشش کریں گے
کہ سنسکرتی ہندی اس ملک کی تعلیمی، ادبی اور مشترکہ زبان بن جائے، اسکے
مقابلہ میں ان کو جو اس زبان کے حامی ہیں جو اس ملک میں صد ہا سال سے بولی

جاتی ہے یہ طے کر لینا ہے کہ اب تک جو زبان ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے
 بولی جا رہی ہے وہ اُس کو اس محبت کی یادگار میں قائم رکھیں گے اور اپنی بزرگوں
 کی صدیوں کی محنت کو برباد نہیں ہونے دینگے،

ابھی اردو کا جو دن منایا گیا تھا اس میں بہت سے ممتاز اور سربراہان اور وہ
 ہندو بھائیوں نے اس مروجہ زبان کی حمایت میں جو حصہ لیا، اس سے پورا انداز
 ہو گیا کہ سمجھدار ہندو دوست بھی اسی کو ملک کے لئے موزوں اور مناسب مان
 سمجھتے ہیں، اور اس کو دونوں قوموں کے بزرگوں کا ورثہ جانتے اور دونوں
 کے میل ملاپ کی تاریخی یادگار مانتے ہیں، اور یہ اتحاد اس زبان کی آئندہ زندگی
 کی بہت بڑی ضمانت ہے،



جواہر الاسرار میں کبیر کی باتِ حیت

جالندھری میں ایک دوست (حکیم عبدالعزیز صاحب مشرقی) کے پاس اُن کے بزرگوں کی امانت اور وراثت تصوف کی قلمی فارسی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، ایک فارسی کتب جواہر الاسرار نام نظر سے گزری، مصنف کا نام اور تصنیف کی تاریخ مذکور نہیں، رسالہ کے ساتھ خلاصہ العارفین وغیرہ حضرت زکریا ملتانی، حضرت فرید گنج شکر، حضرت جلال بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ملفوظات ہیں، اسی مجموعہ میں فارسی میں گیتا کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کے آخر میں کتابت کی تاریخ، ۱۲۸۷ھ سمیت لکھی ہوئی ہے، (۱۳۳۳ھ) کا غدیکسان پرانا اور کشمیری قسم کا ہے، آجکل سمیت ۱۹۹۵ء ہے، اس بنا پر اس رسالہ کی کتابت آج سے ایک سو برس پہلے کی ہے، تصنیف کا زمانہ اس سے خدا جانے کتنا پہلے ہو،

بہر حال اس رسالہ جواہر الاسرار میں مصنف نے چند ہندی، فارسی اور عربی کے صوفیانہ لفظوں اور فرقوں کی تشریح کی ہے، اس میں پنجابی ہندی یا اردو کے چند شعوبہ کبیر کبیر آگئے ہیں، اور وہی میری دلچسپی کا باعث ہوئے، ایک موقع پر لفظ و معج

نسبت بر آب دارد، برائے این قلب گویند: یہ دوہرہ نقل کیا ہے،

جل ترنگ جلیں تیں اوجی جلیں برائے سمائی مائی میں مادھوئیں موئیں دھوئیں توں پنج

جملہ لاصولۃ الاحضوار القلب (حدیث مشہور صوفیہ) کی تشریح میں ہے،

”وہین است ہرکہ در عالم یافت اورا ہمہ جا است و ہرکہ در عالم نیافت اورا

نخل حق آسان کند انشاء اللہ تعالیٰ،

اس کے بعد اس مضمون کا یہ دوہرہ ہے،

جن کو درشن ات ہو نکو درشن ات جنکو درشن ات تانہ نکول ات نہ

الصوفی لاصولۃ الاحضوار القلب کی تشریح میں دو شعر ہیں،

آپس آپ سو بسرا با اس دو جی بسری پہلے تس

یاد اکیلی رہے سو یاد اس میں باقی سبہ برباد

وحدۃ الوجود کی ایک تمثیل کی تشریح میں ہے،

خدا سو بند ا ہو دکھلائے بندے خدا نکھیا جائے

کسی فقیر ”عبد الفتاح“ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے،

”اے میاں تک پیچھے دیکھو“ یعنی اے فلاں اندک پس ہیں“

ایک اور فقرہ کی تشریح کی ہے،

”کھوجی جیسے پی بادی مرے“ کھوجی یعنی داس بادی یعنی مقابل یعنی ہر کہ جویند

باشد و تلاش دانستن داشته باشد اوز ندگی یا بدو ہر کہ یک چیز یافتہ برہموں یک

چیز و یک مرتبہ و ہر یک عمل ماند، و در لذت ہوں یک عمل گرفتار شود و لذت
زند، او مردہ برائے آنکہ او پیشتر راہ نیافت۔

اس رسالہ میں سب سے دھچپ چیز مشہور فقیر کبیر اور بیراگیوں کی ایک بات چیت
کی جینہ نقل ہے، جو اگر درست ہے، تو ہم کو کبیر کے زمانہ کی زبان کی ہو ہو تصویر نظر
آجاتی ہے، نقل لکھی ہے،

”جیسے تینتاں و بیراگیاں پیش کبیر آمدند، و گفتند کہ اے کبیر توں اتیت اور بیرا
گی ہے، توں واسطے تیر تھ کے اور استھان کے کیوں نہیں چلتا، اٹھ تیر تھ کوں
اور استھان کو چل، کبیر گفت کہ با تم اتیت اور بڑی بیراگی ہو، اور میں انار
ہوں، تیں جاؤ، میں پڑیا ہوں، بیراگیاں گفتند کہ نہ توں چل ہمارے ساتھ، یا
بیراگ چھوڑ کبیر اجا کر دو، و گفت بیراگیو مجھے چھو دو، بیراگیاں بگڑا شتند، باز کبیر
گفت کہ پہلا اب کی مجھے چھو دو، اینھ توں بیراگیو لجاؤ، اسے تیر تھ اور اشنان کرؤ
دوسری بار میں چلوں گا، بہزار منت ماند و توں ہر ہمراہ داد، بیراگیاں توں نہ گرفتہ
رفتند، ہمہ جا تیر تھ و اشنان کر دند، توں نہ راہم کما نیند، بعد از مدت آمدند پیش کبیر
کبیر پرسید کہ توں ہر کہاں ہے، بیراگیاں گفتند کہ ہے، توں نہ راہیں کبیر گذشتند
کبیر گفت کہ توں ہر کوں توں، بیراگیاں توں نہ راہ شکستند، باز کبیر گفت کہ کھاؤ، بیراگیاں
خوردند، باز کبیر پرسید کہ کیا ہے، بیراگیاں گفتند کہ کراہے، کبیر گفت کہ
اے بیراگیو تیر تھ اور اشنان کیں کیا ہوتا ہے، جب تریں میتھا نہوئے“

یہ جو کروا تھا، تو تیرت اور اثنان سوں میتھانہ ہوا جائیگہ اہل میتھانہ ہووئی
 اس کے تئیں سنگت کروئی بل کی تھی تو ای میتھا کیونکر ہووے۔ جو میتھی سنگت
 ہوئی تو میتھا ہوتا پس رفتن و پرسیدن و شنیدن و غوغا کردن چہ کاری آید۔
 کبیر کی وفات کا سال ۱۵۷۵ء سمت مطابق ۹۸۵ھ مشہور ہے، تو کیا یہ تو ہی
 صدی عیسوی کی ہندوستانی بولی ہے، کبیر کی شاعری کی زبان بھی بہت
 ہے، اور اس میں عربی اور فارسی کے بگڑے ہوئے لفظ بہت ملتے ہیں،
 آگے ایک اور شعر نقل کیا ہے، دوہرہ،

نہ دیکھ پرائی چو پڑی نا تر سا اپنا جیو روکھا سوکھا کھا کر تھن پانی پو
 تجھ کن علم سو ہے فی الحال دی بصارت تجھے کمال
 ذوق ہوئے نہ جن کر دیکھ نہیں بھوت کر تھیں ایشیکہ
 پھسکے کیں بید یا نہیں کوئی کھانڈ کیں میٹھا نہیں ہوئی
 بیدے انتر جب جوئی جوں جھنک کر نہیں بھر ہوئی
 دو بہنیں تھیں، بڑی بہن کا جب بیاہ ہوا، تو چھوٹی بہن نے پوچھا:-
 ”بولو بیاہ کیسا ہوتا ہے“ ایں گفت ”کہوں گی“ جب چھوٹی بہن کا
 ہو گیا تو اس نے کہا ”بولو بیاہ ایسا ہوتا ہے“

جونہ دیکھے اپنیں تین توں تو نہ پہنچی کوہ کے بن توں
 انھوں کہ رسالہ ناما م ہے،

مقدمہ

مکاتیبِ شبلی

انسان کی سب سے بڑی یادگار اس کے دن رات کے خیالات کا ذخیرہ ہو، انسان خود فنا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے وہ خیالات جن کو وہ کاغذ کے صندوق میں امانت رکھ جاتا ہے، زندہ جاوید ہیں، پچھلی نسلیں اگر ان کی حفاظت کو سیکھیں تو یہ مہر سی مومیائی لگا کر لکھنے والے کی لاش کو صحیح و سالم رکھنے سے زیادہ مفید ہے، کیونکہ اس مومیائی سے ہم اس کے بدن کے ڈھانچ ہی کو بچا سکتے ہیں، اور اس کا غذی مومیائی کے ذریعہ اس کے دل کے اندر کے بھید اور اسرارِ صحیح و سالم اور محفوظ رہتے ہیں، تاریخی انسانوں کے صحیح حالات جاننے کا ایک ذریعہ ان کی سوانحِ حیات ہیں لیکن درحقیقت سوانح نگار کا قلم اپنے ہیر و کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہے وہ صرف اسکے ظاہری خط و خال کی نقاشی ہوتی ہے، عمیق قلب کے اندر جو رموز اور اسرار ہیں اور جن سے اصل میں "انسانیت" عبارت ہے، ان کی تصویر کشی کے لئے جو رنگ درکار ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں آسکتا، انسانوں کی خود نوشت سوانحِ حیات ایک حد تک

اس کی تدافعی کرتی ہیں، لیکن چونکہ انسان یہ سمجھ کر اپنے حالات حوالہ قلم کرتا ہے کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا، اس لئے اصل تصویر میں جہان عیناً ان پر سیاہی پھیرا جاتا ہے، اس بنا پر یہ مرقع بھی اس کی صورت کی سچی شبیہ نہیں ہوتی صرف ایک ہی چیز انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ہو سکتی ہے، اور وہ اس کے ذاتی اور نج کے خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے، چونکہ لکھنے والے کو یہ کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظر عام پر آئیں گے، اور بہت سے ایسے مکتوب ایسے ہوتے ہیں جو اس کے حرم اسرار اور عزت و دوست ہوتے ہیں جن سے کوئی پردہ نہیں رہتا، اس لئے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا حال اور خیال بے پس و پیش قلم کے حوالہ کرتا جاتا ہے، اس لئے اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے، جیسا کہ وہ ہے۔

کسی انسان کی بڑی سے بڑی لائف اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا کا خاص اہتمام کیا جائے پھر بھی اس کی زندگی کے بہت سے ویرقی سائے چھوڑ دینے پڑیں گے کہ بیچ بیچ میں ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال کے حالات تواتر کی تاریکی میں مخفی رہ جاتے ہیں، لیکن اکابر رجال اور خصوصاً اہل قلم اور مصنفین کے بہت کم دن ایسے گذرتے ہیں کہ ان کو خود خط لکھنا اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینا نہ پڑتا ہو، اس لئے اس سالہ سے اگر ان کی سوانح نگاری کا کام لیا جائے تو ان کی زندگی کے روزنامہ کا کوئی صفحہ خالی نہ رہ سکیگا۔

استاذ مرحوم کے خطون کے جمع کرنے کا شوق مجھ کو شروع ہی سے تھا ہر سب سے پہلے ۱۹۰۶ء میں مجھے اُن سے مراسلت کا شرف حاصل ہوا، ۱۹۰۶ء سے یکسر ۱۹۱۴ء تک ان کا لکھا ہوا اپنے نام کا ایک ایک پرزہ میں نے ایک گراہنا خزانہ کی طرح محفوظ رکھا، ان میں نغافے، کارڈ، عام رقعے، ہر قسم کے مکتوبات ہیں جنکی تعداد ۲۵۰ ہے، ۱۹۰۹ء میں خیال آیا کہ یہ جواہر پرینے ممکن ہے کہ کچھ قدر شناس جو ہر یون نے محفوظ رکھے ہوں اس لئے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے التذوہ میں اپنا خیال احباب کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے نہایت سرگرمی سے اس کی تائید کی، اور اطراف ملک سے کئی ہزار خطوط کا مجموعہ جمع ہو گیا، جلد اول کے اکثر خطوط مولانا کی زندگی ہی میں صاف ہو کر ان کی نظر سے گزر چکے تھے، پھر کچھ ایسے عواقب پیش آئے کہ یہ مجموعہ ساہا سال تک گوشہ لہال میں پڑا رہا، ۱۹۱۴ء میں مولانا کی وفات کے بعد برسوں کی سرد تحریک میں نئی گرمی پیدا ہوئی، دوبارہ مسودہ نکال کر صاف کرایا، خیال تھا کہ لبنا کے احباب اور تلامذہ کے کل خطوط ملا کر ایک جلد پوری ہو جائے گی، لیکن اس تحریک کے دوبارہ اعلان پر اس کثرت سے ہر طرف سے خطوط کی بارش ہوئی کہ یہ تمام ذخیرہ ایک جلد میں نہ سما سکا، چونچ رہا اس کو ایک اور تہذیب کیلئے سینت کر رکھنا پڑا، اس پر بھی بڑی مشکل سے اس سلسلہ کو دوسری جلد پر تمام کیا جاسکا، ورنہ خطوط کا یہ حال ہے کہ ان سطروں کے لکھتے وقت تک ان کی آمد کا تاریخین ٹوٹا، دوسری جلد کو بھی صرف تلامذہ کے خطوط پر، ۲۰ صفحہ میں تمام کرنے کا ارادہ تھا، لیکن ۲۰۰ صفحوں کے چھپ جانے

کے بعد مولانا کے بعض ایسے خاص انخاص دوستوں کے خطوط ملے کہ اگر وہ متنبہ
شہلی میں جگہ نہ پاتے تو ہمارا یہ کارنامہ یقیناً ناقص رہ جاتا۔

ابتدا ہی سے مولانا کے خطوط اس قدر وچپ ہوتے تھے کہ ان کے قدیم وطنی
اجاب اور تلامذہ نے ان کو حیران بنا کر رکھا تھا، اور اگرچہ مختلف حالات اور حوادث
کے پیش آنے سے ان کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا، تاہم مولوی محمد عمر صاحب، اور مولوی
محمد سمیع مرحوم، مولانا کے دو مخلص شاگردوں نے جو کچھ ان کو ملا اس کو سینہ سے لگا کر
رکھا، اور مکاتیب کی ترتیب کے وقت یہ امانت انھوں نے میرے سپرد کی، اکثر پرانے
فارسی اور اردو خط جن سے مولانا کے ابتدائی حالات اور خیالات پر روشنی پڑتی
ہے، ان ہی دونوں بزرگوں کے سلسلہ سے ہم تک پہنچے ہیں،

مولانا کے خطوں کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اس کی قدیم سے قدیم تاریخ
۱۸۷۲ء تک پہنچتی ہے، اس زمانہ میں شرفا کی مراسلت کی زبان فارسی تھی، چنانچہ
تک جب تک مولانا علیگڑھ نہیں گئے تھے ان کے تمام خط فارسی زبان میں
ملے ہیں، علیگڑھ جانے کے بعد بھی ان لوگوں سے جن کی نسبت ان کو معلوم تھا کہ
انھیں فارسی سے ذوق ہے، اسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے، یہ فارسی خطوط
مولانا عموماً قلم برداشتہ لکھتے تھے، لیکن ان میں بعض خط ایسے بھی ہیں جن کو انھوں
نے کوشش اور محنت سے لکھا ہے، ایک فارسی خط کے سرے پر لکھا ہے، کہ بہ ترک

الفاظ عربی۔ ان فارسی خطوط کی زبان روان، یا محاورہ، عبارت مقفی، لیکن بے تکلف ہے۔
 مولانا نے ان فارسی خطوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے، اور ان کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔
 چنانچہ ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں: "این نامہ را نزد خود نگاه باید داشت" (فارسی)،
 ایک اور صاحب کو لکھتے ہیں: "این نامہ را خواہند سپرد و ضائع خواهند"
 بلکہ شاید یہ بھی ارادہ تھا کہ ان فارسی خطوط کو مرتب کر کے چھپوا دیا جائے، مولوی محمد
 یسبح صاحب کو لکھتے ہیں کہ جناب مولانا محمد فاروق صاحب کو ہمارے فارسی نامے
 اور غزلیں جو تمہارے پاس موجود ہوں نہایت جلد بھیج دو۔ اور ان کے چھپنے کا ذکر کرو۔
 لیکن ان کی نگاہ میں اپنے اردو خطوں کی اتنی وقعت نہ تھی کہ وہ ان کو محفوظ
 کرنے کے قابل سمجھیں، چنانچہ مولانا کے چھوٹے مامون زاد بھائی شیخ رشید الدین صاحب
 انصاری نے جب ان کو لکھا کہ وہ ان کے خطوط جمع کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے جواب
 میں لکھا،

"میرے خطوط بالکل بدمرہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو؟ مجھ کو خود مرہ

نہیں آتا تو اردو ن کو کیا آئے گا؟

میں نے مولانا کی خدمت میں ان کے خطوں کو جب جمع کرنے کا ارادہ ظاہر
 کیا تو ناپسند فرمایا، اکتوبر ۱۹۰۹ء میں ان کی اطلاع کے بغیر جب الندوہ میں اُس عبارت
 کے ساتھ جو مکاتیب جلد اول کے دیباچہ میں درج ہے میں نے اس کا اعلان شائع

کیا تو انھوں نے اس پر یک گونہ برہمی ظاہر کی تاہم تیرکان سے نکل چکا تھا، لوگوں نے خطوط بھیجنے شروع کئے، آخر مولانا کو بھی رضی ہونا پڑا، چنانچہ وہی سلسلہ کو مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کو لکھتے ہیں،

”سید سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہیں، کیا آپ کے پاس میرے کچھ مہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے“

دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ مہفوات مولانا شروانی کے پاس غلطی سے محفوظ رہ گئے ہیں، اس ذخیرہ کو ذی ثروت بنانے میں جن بزرگوں نے میری اعانت کی ہے، ان کے خطوط کی تعداد خود ان کی لطف فرمائی کی غماز ہے، تاہم حسب ذیل مسنون کا شکریہ ادا کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا،

مولوی محمد سمیع صاحب، مولوی محمد عمر صاحب، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا حمید الدین صاحب بی اے، پروفیسر عبدالقادر ایم اے، مسٹر ایم مہدی حسن صاحب تحصیلدار، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، ان میں سے دو اول الذکر اصحاب نے نہ صرف اپنے نام کے خط اور رقعے محفوظ رکھے تھے، بلکہ دوسروں کے نام کے خطوں کو بھی ہونے سے بچایا تھا،

مولانا کی انشاء کے خصوصیات پر بھی کچھ عرض خیال کا ارادہ تھا، لیکن اسی زمانہ میں ہماری زبان کے جادو نگار انشاء پرداز جناب ایم مہدی حسن صاحب نے اس موضوع

پر ایک دلچسپ تحریر لکھ کر بھیجی جس نے میرے اس فرض کو بہت ہلکا کر دیا، چنانچہ مین ہما
 مسرت کیساتھ اس موقع پر اپنی جگہ سے ہٹ کر ان کو آپ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہوں،
 ”تعلقات کی تدبیری رفتار کے ساتھ، تحریر کا لب لہجہ (رٹون) بھی بدلتا گیا جس طرح مولانا کی
 تقریر پر جبہ اور خوشو زواید سے پاک ہوتی تھی اسی طرح ان کی تحریر بھی ہوتی تھی، پچھلے تہ کرے اس طرح
 کرتے تھے کہ یا ران کن کی بزم سے اٹھ کر ابھی آئے ہیں، اور باتوں باتوں میں سرکھ
 یوں کہہ جاتے تھے گویا واقعات سننے سنائے نہیں آنکھوں دیکھے ہیں، یہ مادہ اجتہاد کی
 (اور بھٹائی) جسے جان ادب کئے، ان کی وسیع معلومات کے ساتھ ان کی تقریر کا خاصہ
 امتیازی تھا، ان کی شستہ رفتہ اور نہایت پاکیزہ تحریروں میں یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا
 شربِ محبت تھی جو کھنکھنچا کر دو آتشہ ہو جاتی تھی، سنج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام و عمل
 نہیں ہوتا، یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے،
 اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پر داری
 کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والوں بعض چوٹی کے شاعر و ن کو دیکھا کہ دو
 سطریں سیدھی سادھی نہیں لکھ سکتے، مولانا میں یہ خاص جامعیت تھی کہ جس طرح بولتے
 تھے، اسی طرح لکھتے تھے، اور نہایت خوشحظ لکھتے تھے،

مولانا خاص حالتوں کے سوا، لکھنے میں پہل کم کرتے تھے، لیکن ملک کے سب سے بڑے
 ”مجمعِ صفاتِ کمالیہ انسانی“ یعنی سر سالار جنگ اعظم کی طرح بواپسی ڈاک جواب دینے
 کے عادی تھے؛

”جس روز ڈاک مین مولانا کا خط ملتا تھا، اس کا پڑھنا پڑھانا میرے لئے ایک ایسا عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہیں بھولوں گا، سواو خط اتنا پیارا ہوتا تھا کہ مین نے عہدہ سے عہدہ ولایتی کا غذا اور لفافے بہم پہنچائے، کہ تحریر کے ظاہری حسن کی چمک دمک کچھ اور بڑھ جائے لیکن طبیعت اس کی پابند نہیں رہتی تھی، کبھی کا رو پڑتا تھے، کبھی اس طرح لکھتے تھے کہ کا غذا اور لفافہ، تاہم میرے پاس بعض ایسے خطوط محفوظ ہیں جو اس لائق ہیں کہ ان کی عکسی ہاف ٹون کا پیمانہ لی جائیں“

”جن کہین ہو، کسی حیثیت سے ہو، فطرت کا وہ پاکیزہ منظر ہے جس سے حافظ کی سراسر معرفت کی طرح قطع نظر نہیں کیا جاسکتی، مولانا ادبی حیثیت سے اس کا نہایت صحیح مذاق رکھتے تھے، عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیان سرمایہ ادب ہوئی تھیں۔“

مولانا نہایت خوش ترتیب تھے، اونچے طبقے کی سوسائٹی مین بہت مانگ رہی تھی، جہاں وہ کہین سے بیگانہ نہیں ہوتے تھے، ملک کے بعض نہایت اونچے خاندانوں سے مخلصانہ روابط تھے، ان مین بعض لیڈریان نہایت شایستہ، قابل اور مولانا کے مذاق ادب کی دلدادہ تھیں، ان کو کبھی خط لکھتے تھے تو اس طرح جیسے سرکاری گزٹ بہت ہوا ”و عائن“ لکھ دین، ایک کو لکھا کہ ”کچھ نہیں“! مین نے عرض کیا، مولانا! مقصود بالذات تو وہی تھی، یہاں بھی امتیاز رہا! سنکر چٹک گئے، اور میرے انتقالِ ذہن سے خوش ہوئے۔

اسی طرح ایک رئیس نے جن کی بیوی نہایت حسین تھیں، مولانا سے پوچھا جنس لطیف مین کن کن اوصاف کی ضرورت ہے؟ مولانا نے کہا ”میں صرف حسین ہونا“

چاہئے، اس فقرے کا میان بیوی پر جو اثر ہوا تھا، آج تک اس کا سماں آنکھوں میں ہے،
 بہر حال خطون میں نسبت کم کھلتے تھے، لیکن مجھ پر خاص عنایت تھی، اس لئے راز
 نہیں رکھتے تھے، تاہم تصریحات کی جگہ آپ دیکھیں گے، چشمِ سخن صرف اشاروں سے
 کام لیتی ہے، میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا، اور یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر صریح
 طلبِ نکتون کی بے نقابی میں نے جائز نہیں رکھی، میرا خیال ہے، آفتابِ علم کی یہ
 ضیا، یک طرفہ (خطوط) ان کی مستقل تصنیفات کے مقابلہ میں نسبت کم

دکھپ نہیں ہے، م

اب میں پھر اپنی جگہ پر آتا ہوں،

مولانا کے خطوط نویسی کی خصوصیتیں مختصر لفظوں میں یہ ہیں،

(۱) وہ خط نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف "ہاں" "نان" پر اکتفا کرتے تھے،
 مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقرہ میں دیتے تھے، اس قسم کے
 سیکڑوں خطوط میرے پاس ہیں لیکن میں نے ان کو قصداً اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا
 میری مرحوم بیوی (خدا اس کو غریقِ رحمت کرے) مولانا کے خط کو "تار کھتی تھی" تمونہ
 کے طور پر اس قسم کے تار محمدی جن صاحب کے خطوط میں نظر آئیں گے،

(۲) لیکن وحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے، اصل خوبی یہ ہے
 کہ لفظوں کے اختصار کے ساتھ معنی میں پوری وسعت ہو، یہی خصوصیت مولانا کی
 انشا پر داری کی جان ہے، وہ اتنی ایک دو فقرہ میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں، ہم صفحہ

ان کو نہیں کھا سکتے، وہ چند نفطون مین جو جا دو پھونک دیتے ہیں، اس زمانہ کے سامری سینکڑوں منتر وین وہ روح نہیں پیدا کر سکتے، ضرورت تھی کہ اس نکتہ کو مثالوں سے واضح کر دیا جاتا، لیکن اس خوف سے کہ یہ مختصر دیباچہ مطول نہ بن جائے اس کو دوستوں کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں،

(۳) آداب و القاب کی پروا نہیں کرتے تھے، اکثر بلا تہیہ مطلب شروع کر دیتے تھے، (قدما کا یہی طرز تھا) جس کا بڑا خیال کیا اس کو صرف ایک دو لفظ القاب کہتے تھے، (۴) خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ خط لکھا، اور آنے جانے کا حساب لگا کر چودن مقرر کیا اسی دن جواب آگیا، بیماری تک مین بھی وہ اس وضع داری کو نباتے تھے، بہت مجبور ہوتے تو دوسروں سے لکھا دیتے چنانچہ مکاتیب کی دونوں جلدوں مین اس قسم کے خطوط ملین گئے،

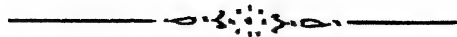
(۵) شروع مین مولانا کا خط، شکستہ تھا، پھر خوشخط نستعلیق لکھنے لگے تھے، آخر مین شکستہ اور نستعلیق مل کر ایک عجیب خوش سواد خط پیدا ہو گیا تھا، یہ خط اس قدر خوبصورت اور حسین تھا کہ بیسوں سلیقہ شعار انخاص نے اس کی تقلید کیں، اور بہت سے اس مین کامیاب ہوئے، چنانچہ مذوہ کے طلبہ، مولانا کے شاگردوں اور بعض دوستوں نے یہ مشق بہم پہنچائی ہے کہ بہت مشکل سے ان مین تمیز ہو سکتی ہے،

(۶) مکاتیب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو گا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات

کے مطابق گفتگو کرتے تھے، شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آتے تھے۔ مولوی حبیب الرحمن خان کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری، نوا اور کتب، اور مذہب کے متعلق باتیں ہیں، پروفیسر عبدالقادر سے ”ادب و تاریخ فارسی“ کے مباحث پر گفتگو ہے، مولانا حمید الدین صاحب کے تفسیر اور سیرت پر مکالمے ہیں، مسٹر عبدالماجد سے ”مغربیات“ کی باتیں ہیں، مسٹر ہمدی حسن صاحب مصنف ”دائرۃ ادبیہ“ کے خطوط میں ”محاسن ادبی“ اور ”نطائف شعری“ پر گفتگوشایان ہیں،

خطوں کے انتخاب میں جو اصول سامنے رہا، آخر میں اس کو بھی ظاہر کر دینا چاہئے۔ میں نے صرف ان خطوں کو لیا ہے جن میں یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ہے یا کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلہ کا ذکر ہے، یا انشا پر داری کا نمونہ ہو، ان ہی تین اصولوں کی رہبری میں ہزاروں خطوط کے انبار سے یہ چند دانے چھانٹ کر لا گئے ہیں، ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک تو قرآن کی سب سورتیں برابر ہی ہیں،

(۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء)



مکاتیبِ ہندی

خط کیا ہے؟ آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت، اس بات چیت کو کاغذ و
میں محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے، بادشاہوں اور وزیروں کے حکم احکام کے
چھوٹے چھوٹے فقرے جو بلاغت کی جان ہوتے تھے، اور توقیعات کہلاتے
تھے یاد رکھے جاتے تھے، عیسائیوں میں مقدس حواریوں کے خطوط کی خاص اہمیت
ہے، اور وہ مجموعہ انجیل کے ضروری جزو خیال کئے جاتے ہیں، اور قبول کے ہاتھوں
سے لئے اور ادب کی آنکھوں سے پڑھے جاتے ہیں،

لیکن جہاں تک میرا علم ہے خطوط کی نگہداشت اور یادداشت کو جو کثرت
اور وسعت مسلمانوں کے دور میں ہوئی، وہ اس سے پہلے نہ تھی، مسلمانوں نے
پہلے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کو محفوظ رکھا، روایتوں میں
ان کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ بہت سے عالموں نے ان کو الگ کر کے ان کی کتابیں
بنائی ہیں، دوسری صدی میں امام مالکؒ کا خط ہارون رشید کے نام اور امام
کا خط امام مالکؒ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں،

تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے ویلیون، سامانیون، غزنویون اور سلجوقیون کی حکومتوں میں اہل قلم ادیبوں کو اپنے خطوط اور مراسلات کے جمع کرنے کا خیال ہوا، اس خیال کی تحریک دو وجہوں سے ہوئی، ایک تو یہ کہ چونکہ ان عجیب پادشاہوں کی زبان فارسی اور ان کی حکومت کی زبان عربی تھی، اس لئے ان بادشاہوں کو ایسے محکمہ شاعت کی ضرورت ہوئی، جہاں ایسے اہل قلم موجود ہوں جو فارسی و عربی دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں، اس ضرورت نے مانگ پیدا کی، اور مانگ نے شے مطلوبہ کو پیدا کرنا شروع کیا، اس سے انشاء کا ایک فن پیدا ہوا، اور نشی پیدا ہوئے، جو بڑی محنت اور جانکاہی سے شاہی فرمان اور مراسلے تیار کرتے تھے، اور چونکہ ان کو وہ بڑی محنت سے تیار کرتے تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ان کے اس خونِ جگر کا کوئی قطرہ ضائع نہ ہونے پائے، اس سے دوسری وجہ بھی پیدا ہوئی، یعنی یہ کہ چونکہ انشاء کا ایک خاص فن پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اس کے سیکھنے اور سکھانے کیلئے لائق منشیوں کی تحریروں کی ایک ایک سطر اس کی قدر جاننے اور پہچاننے والے جمع کرنے لگے، ادیبوں میں صابی، صاحب، اور عماد و کاتب کے زمانہ سے لے کر ”نیش اسائر“ کے مصنف ابن عبد الکرم تک بیسیوں اہل انشاء ہیں جن کے خطوط اور مراسلے ادب کے خزانوں کے بیش قیمت موتی ہیں، ہندوستان کے شاہی منشیوں میں علامہ ابوالفضل کے خطوط و منشآت سے پہلے کی کوئی

چیز ہمارے ہاتھ میں نہیں، اس کے بعد تو شاید ہی کوئی فارسی کا انشا پرداز غالب تک
ایسا گذرا ہو جس نے اپنی عمر کی محنت کی یہ کمائی ترکہ میں نہ چھوڑی ہو، چنانچہ انشآت،
نشات اور رقعات کے طرح طرح کے گلدستوں سے فارسی کی یزیم ادب رشک
گلستان ہے، اور عالمگیر کے رقعات اس چین کے سدا بہار پھول،
علماء اور صوفیوں میں امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کے مکتوبات سے پہلے کی
کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں، صوفیانہ مکتوبات کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا نمبر
سب ملکوں سے آگے ہے، دنیا میں جب تک تصوف کی دھارین بہتی ہیں گی مکتوبات
شیخ شرف الدین میری اور مکتوبات مجدد الف ثانی کے کوثر و سلسیل روحانی پیاسوں
کی پیاس کو بجھاتے رہیں گے،

اردو میں غالب نے جب ادب کے گرم مجرین عمو و ہمدی جلایا ہے، اردو کو
معلیٰ کی محفل اس کی خوشبو سے پس گئی ہے، علماء اور صوفیہ کے خطوط اور مکتوبات
تو اپنی روحانی برکتوں، علمی بحثوں اور مذہبی حقیقتوں کے سبب ہمارے عقیدہ مندوں
کا صحیفہ ہیں، مگر غالب کے خطوط میں جو مزاج ہے وہ صرف ادبی نکتہ پردازوں کے چٹخاری
مزدان غالب کیا کیا خونِ جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے، مگر تقدیر کی
عجائب کاری دیکھئے، کہ اُن کے اس خونِ جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خوان
کا کوئی قیمتی صل نہ بن سکا، اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے، چمکتے اور
چھپاتے ان کی زبانِ قلم سے نکل گئے، ان کا ہر لفظ قدر دانوں میں موتیوں سے زیادہ

قیمتی ٹھہرا اور آج وہ ہمارے ادبی خزانہ کا بیش قیمت سرمایہ ہے،

اس کے بعد جو ادبی دور آیا، اس میں ادب و شاعری کے نکتہ پردازوں اور ملک ملت کے خدمتگزاروں کے بہت سے خطوط جن کو قدردانوں نے تویذ بنا کر رکھا تھا چھاپ کر اس تبرک کو وقف عام کیا، سرسید کے خط، مولانا حالی کے نامے، نواب محسن الملک کے مکتوبات، مولانا ذیر احمد کے فصاحت، منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کی تحریریں، اکبر مرحوم کے عنایت نامے، اور مولانا شبلی کے مکتوبات چھپ کر ہماری زبان کے خزانہ کا سرمایہ بنے،

اب ہماری زبان کے ایک ایسے ادیب کے خطوط کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو نہ کوئی قومی رہبر تھا، نہ شاعر تھا، نہ مصنف تھا، نہ عالم تھا، نہ پیشوا تھا، نہ ناصح مشفق تھا، نہ مصلح وقت تھا، نہ سیاسیات کا علمبردار تھا، اس کے باوجود اس کے خطوط میں وہ لطافت تھا جس کی گھلاوٹ سا اہمال سال گزرنے کے بعد بھی زبان کو اب تک یاد ہے، اور یقین ہے کہ جب تک زبان چلتی رہے گی اس کا مزہ پھیکا نہ ہوگا،

ہمدی مرحوم کے خطوط پر نقد اور تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیاں کو ایک ایک کر کے دکھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی خوش رنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک ٹکڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صنّاعی کی داد دے، وہ پھول بہن پھول، پھولوں کی قدر یہی ہے کہ آپ اُن سے لطف اٹھائیں، اور بس! جہاں آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھا لگے، اور نازک پتیاں آپ کی انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں، بہتر سے بہتر صورت

نزاکت و لطافت کی ان تصویروں کے لئے یہی ہے کہ دور ہی سے ان کی خوشنمائی، خوش رنگی، خوش قامتی اور خوشبوئی کی تعریفیں کی جائیں، اور ان سے خود لطف اٹھائے اور دوسروں کو لطف اٹھانے دے،

ہمدی مرحوم کے ادب پر بہتر سے بہتر جو رائے دی جاسکتی ہے وہ وہی ہے جو انھوں نے آپ شمس العلماء آزاد کی نسبت ظاہر کی ہے، کہتے ہیں،

”سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، تذییر احمد بغیر مذہب کے فقہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کوڑے رہ جائیں گے، حالی بھی جانتا کہ نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں“ (افادات ۲۵۲)

بعینہ یہی بات ہمدی مرحوم پر چپان ہوتی ہے، اور وہ صرف انشا پرداز تھے جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہ تھی، اور معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مرحوم کے تجربہ کا اثر ان کی زبان کی طاقت و نفاست پر پورا پورا پڑا تھا یہ بات آج نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ ہماری زبان کے ایک بہت بڑے ادیب نے جس کا معیار پڑا اونچا تھا، اس وقت کہی جب ہمدی مرحوم ادبی نشوونما کی عمر میں تھے، مولانا شبلی ان ہی کو لکھتے ہیں

”مضمون دیکھا، نیچے ہمدی حن کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پورہ کی دوست ہیں یا تذییر احمد آزاد کی دور و چون نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن

تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔ (مکتبہ شبلی ص ۲۵۹)

جن ”ادبی عال“ کی آنکھوں نے تذییر احمد اور آزاد کی دور و دور کو ایک قالب میں دیکھ لیا، اس نے بڑی سے بڑی داستان تنقید کو دو نقطوں میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ ان کو پھیلائیے تو صفحے کے صفحے رنگ جائیں، لیکن ان دو نقطوں کو دو جھلون میں پھیلانا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آزاد کی ادبی نفاست و لطافت اور تذییر احمد کی چہل اور خوش طبعی اگر ایک جادو دیکھنا ہو تو ہمدی مرحوم کی قلبی مخلوق کو دیکھئے،

آج کل کی رنگ و بو کی دنیا ”ادب لطیف“ پر مٹ رہی ہے، پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گرمی سے مسحور کر رکھا ہے، مشرقی زبانوں میں فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلے اٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا سینہ کم سے کم تین برس سے یورپ کے مشق ناز کا نشانہ ہے، یعنی ترک، ترکوں نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس ہی کی مجوہ کو پہلو میں پایا، اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان میں پھیلی اور اس لئے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا بڑا گہرا اثر پڑا، ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر ایک علیگ طالب العلم کو ترکی پڑھوایا، اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت کے لئے کارآمد ٹھہرایا، اس نے ”زبانی قرب“ کے ساتھ اس کو ترکوں کا ”مکانی قرب“ بھی بخشا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بنگر آج سے پینتیس برس پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مقبوضات کی صورت میں بدنام شروع کیا، اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے اس ”ادب لطیف“ کے نمونے دیکھے جن کی شیعہ

تصویریں آج ہر اردو رسالہ کے صفحوں میں نظر آتی ہیں،
 ہمدی مرحوم فرانسیسی نہیں جانتے تھے اور ترکی کی نسبت تو وہ بے تامل کہہ سکتے تھے
 ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دلم

وہ انگریزی ادب کا علم بھی کچھ زیادہ نہیں رکھتے تھے، یعنی انگریزی کی کوئی اعلیٰ
 ڈگری نہیں پائی تھی، لیکن جودل و دماغ اور ان سے بڑھ کر جو ذوقِ سلیم انہیں ملاتا تھا
 وہ بڑا اعلیٰ تھا، اس لئے انگریزی اور عربی و فارسی کی جو تعلیم ان کو ملی تھی اس نے نکت
 کا معاوضہ کیفیت میں کر دیا، پچاس برس کے تجربہ نے بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین
 شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی برقی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے
 ان دونوں بجلیوں کو علاحدہ کر دیجئے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی، ہمدی مرحوم
 میں یہ دونوں بجلیاں تھیں اور ان ہی کی رگڑ سے ان کے قلم کی تپتی روشن تھی آپ
 آگے اُن کے خط پڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ نئے معنوں کے لئے پرانے لفظ اور
 انگریزی ترکیبوں کے لئے مشرقی طرزِ ادا کی ٹوہ میں کتنے رہا کرتے تھے،

ہمدی مرحوم کی جان پہچان اور خط و کتابت کا حلقہ بڑا نہ تھا، پھر بھی چونکہ وہ
 لطیف ادا اور انشا پر دازی کے پروانہ تھے، اس لئے ان کو یہ شمع جہان بھی جلتی
 نظر آئی ان کا پہنچنا ضرور تھا، اپنے عصر کے بڑے بڑوں سے لیکر چھوٹوں تک اُنکی
 پیک یکساں تھی، حالی، شبلی، ناصر علی دہلوی (صلائے عام والے) عبد الرزاق کانبوری
 (ابرارِ مکہ والے) اور ریاض خیر آبادی وغیرہ جیسے پرانوں سے لے کر دلگیر اکبر آبادی

(نقاد کے ایڈیٹر) ہوش بلگرامی (ایڈیٹر ذخیرہ حیدر آباد) عبدالماجد دریابادی، عبدالباقی
 ندوی اور سلیمان جیسے نوجوانوں تک سے ان کی مراسلت تھی تاہم نوجوانوں کی نوجوانی
 کی یاد اب کاغذ میں رہ گئی، ان میں سے کتنے چل بسے اور جو ہیں وہ تیار بیٹھے ہیں،
 غنیمت ہے کہ ہم صحبت ابھی دو چار بیٹھیں

ہمدی مرحوم کی خط و کتابت جن جن سے تھی وہ ان کے خطوں کے عاشق تھے
 جس دن ان کا خط ان میں سے کسی کے پاس پہنچتا وہ دن اس کے لئے بڑی مسرت
 کا ہوتا، وہ آپ پڑھتا دوسروں سے پڑھواتا، ایک ایک فقرہ سے لطف اٹھاتا،
 ان کے چھپے وطن و طنز کے تیرون سے جو زخم لگتا وہ بھی مزادیتا، وہ میری مولویت
 سے غار کھاتے تھے، اگر ان کا بس چلتا تو اس "جامنہ عاریت" کو وہ تار تار کر ڈالتے،
 مگر آخر چل کر ان کو تسکین سی ہو گئی کہ اس مولویت کی گرانی ان کے دوشِ لطافت
 پر بار نہ ہوگی،

ہم نوجوانوں (اب کمان کے نوجوان) میں ان کا سب سے زیادہ میل اور میل
 خاطر ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ساتھ تھا، ان کے
 خط و کتابت بھی زیادہ بہتی تھی، مولوی صاحب موصوف نے مرحوم کی تعزیت
 میں جو مضمون "ہمد" میں نومبر ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا، اس میں مرحوم کے خطوط کی نسبت
 ان کی قیمتی رائے ہے،

"اب باب ذوق کے لئے ان کے مضامین سے بھی بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط

ہوتے تھے، ایک ایک سطر ادب و انشا کی جان ہوتی تھی، اپنی بصیرت و علم کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ دور موجودہ کے ادیبوں میں شاید بلا استثنا کسی کے بھی خطوط اس قدر دھچپ و پر لطف نہیں ہوتے تھے، جن خوش نصیبوں سے سلسلہ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے اور پچھلے گرامی نامہ سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے۔

یہ ہماری زبان کے ایک قابل ادب نقاد کی رائے ہے، خود ہمدی مرحوم اس صنف ادب کے بہت ہی قدردان تھے، وہ اکثر ادیبوں کے خطا بری حفاظت سے رکھتے تھے، اور ان کو ”حرز جان“ نہیں تو ”حرز ادب“ سمجھتے تھے، مکاتیب شبلی کے سلسلہ سے اپنے ایک دوست (ڈپٹی مولوی عبد المجید صاحب برادر مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی) کو لکھتے ہیں:-

خطا بری کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا، یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کہی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی، اس لئے سرسری خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشا پرداز سی اس کی بلا میں لیتی ہو، تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا، (مکاتیب ہمدی ص ۵۸)

مکاتیب شبلی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے مجھے لکھا تھا جو مکاتیب شبلی کے مقدمہ میں شامل ہے،

”نسخ کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا، یعنی اظہار خیال میں صنعت گری طبع

کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پر دازی کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والوں، چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دوسطریں سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے۔

ان فقروں میں حمدی مرحوم نے جس خیال کو بار بار دہرایا ہے، اگر اس کو ان ہی کی زبان میں کہوں تو کہہ سکتا ہوں، کہ حسنِ تحریر کی وہ صنف جو تالیف و تصنیف میں نظر آتی ہے، وہ سراپا بے جمال ہے، جو اپنے جلوہ مہربام کا احساس رکھتی ہے، اور دیکھنے والوں کے لئے اہتمامِ آرائش کرتی ہے، اور حسنِ تحریر کی وہ صنف جو کارڈ کی چلنوں اور لفافوں کی نقابوں میں چھپی ہوتی ہے، وہ اپنے جلوہ سے بے پروا اور تاک جھانک کرنے والوں سے بے خبر رہتی ہے، اس لئے وہ تصنع اور تکلف کے غارہ اور پوڈراؤ سعی و اہتمام کی زینت و آرائش سے پاک ہوتی ہے، وہ فطرت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی وہ ہے، سال و سن کے عاشق کہتے ہیں۔

سادگی گننا ہے اس فن کے لئے

ادب و سخن کے شائق بھی ایک جزئی ترمیم کے ساتھ اس تجویز سے متفق ہیں
سادگی گننا ہے اس فن کے لئے

اس فن سے مقصود خط و کتابت اور نج کی تحریروں کا اسلوب نگارش ہے کہ اگر اس میں بھی اہتمام و تصنع اور کاوش و تکلف کی نمائش ہو تو پھر وہ حسنِ فطری نہ ہوگا، بلکہ اس چراغِ خانہ پر ”شمعِ بزم“ کی پھٹی درست ہوگی، یعنی ”حسنِ طبع“ ”حسنِ کسب“ ”نجائی“

۱۔ ہمدی مرحوم کے خطوں کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں مصوری کا کل نہیں تصویرِ فطرت کا جمال ہے، ان کا حسین خیال اپنے پیکرِ نلور کے لئے اپنی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروز ہے، وہ آسمانِ ایٹج کے سارون کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروش نہیں،

۲۔ مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا، نوکِ قلم پر جوبات آجاتی، وہ گفتنی بھی ہوتی، تو گفتنی ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقہ ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی، چنانچہ مرحوم کے اس قلم کے فقرے اپنی عریانی کے باوجود جس قدر مستور بین وہ زیر لب داد کے مستحق ہیں،

”دیکھئے پھولوں کی سیج پر“ جوانی کی ورزش کی شائقہ اپنے چاہنے والے سے کیا

کہتی ہے؟ ”دوسرا تیرا یہ حملہ ہے، یہ بھی کیا کوئی شہرِ شملہ ہے، (ص ۲۹)

ایک ”صاحبِ قلم“ کے نکاحِ ثانی کی ضرورت اور تحسینِ مین یہ فقرے کچھ زیادہ کھولنے کے محتاج نہیں،

”دو آتش“ اچھی کھنچی ہوئی ہو تو نشاطِ ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، مین اس نشہ کا اثر آپ کے

لڑ بھر پر دیکھنا چاہتا ہوں“ (ص ۳۳)

اس قلم کے میسجون فقرے خطوطِ مین ملین گے، بالقصد ان کو ناظرین کے سامنے لانا چونکہ ناظرین کی ”اتفاقی نظر“ کے لطف کو بہرِ یاد کرنا ہے، اس لئے نگلی کا اشارہ ادھر کر کے چپ ہو جاتا ہوں، اور اس ”چپ“ کی داؤ چاہتا ہوں،

۳۔ مرحوم کی تحریک ایک کمال یہ تھا کہ وہ تلمیذوں سے اکثر کام لیتے تھے، تلمیح کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک خاص شخص یا واقعہ کے متعلق صدیوں سے خیالات کی موروثی رفتار جو تفصیلات اور جزئیات کا ذخیرہ پیدا کرتی رہتی ہے، وہ پورا کا پورا اس ایک لفظ یا واقعہ کے اندر اس طرح سمٹا رہتا ہے، جیسے میلون تک پھیلنے والی خوشبو بند کلیون میں کھولنے تو سطرون کی سطرین اور صفحے کے صفحے درکار ہوں، لکھتے ہیں:-

”شبلی کی طرح کہ ایک گود میں ایک پیٹ میں، کسی وقت فرزندانِ حرنی کی تخلیق سے خالی نہیں۔“ (ص ۵)

”ایک گود میں ایک پیٹ میں کی تلمیح کی تشریح کیجئے تو واقعہ کی تفصیل کے ساتھ کثرتِ تولید پر تنقید کا فرض بھی ادا ہو جاتا ہے،

صفحہ ۳۴ پر یہ فقرہ ہے جس میں اپنے انگریز افسر کی غلط رپوٹ سے جو تکلیف ان کو ایک دفعہ پہنچی تھی اس کی پوری تفصیل اسی ایک فقرہ میں ہے،

”گورے کے دل کی سیاہی جب تم سے ٹیکتی ہے تو زیادہ بھلتی ہے“

مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کے متعلق سرسید کے بعد مولانا شبلی کو لکھا تھا:-

”جواگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جل چکی“ (ص ۱۱)

مولوی عبدالمجید صاحب دارالترجمہ حیدرآباد کی خدمت کی کشاکش سے نجات پاتے ہیں، جو لوگ نوکری اور حیدرآباد دونوں کو جانتے ہیں وہ ان مختصر فقروں کی بلاغت

کی داد دین،

”خوش ہوا، قفس کی تیلیاں ٹوٹیں اور پرنکستہ طائر کو ہواسے وطن نصیب ہوئی (۶۵)“
معلوم ہوتا ہے کہ عارفِ نفسِ مہدی کو بھی اپنی انشا پر داندی کا یہ راز معلوم تھا، اپنے
قلم اور ایک ”صاحبہ“ کی زبان سے وہ ادا کرتے ہیں:-

”ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں، اس خط کو دیکھ کر فرماتی ہیں تم سرسری خط میں جو کچھ
لکھ دیتے ہو بڑے مضمون میں بھی اس کی سائی نہیں ہو سکتی، کیا یہ سچ ہے؟ (ص ۱۱۱)
۴۔ متین رنگینی اور سنجیدہ شوخی مہدی مرحوم کا حصہ ہے، ایک صاحب کو جو نخل
کی شبِ اول میں بیمار تھے لکھتے ہیں:-

”جسے ”بستر شکن“ ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں صرف شکن بستر نکلا۔ (ص ۹)
ایک صاحب قلم دوست کو جو نوکری کے جھمیلوں سے چھوٹے ہیں لکھتے ہیں:-
”آپ لکھتے ہیں، وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے، ایک صاحبہ فرماتی ہیں
صاف کیون نہیں کہتے ”بیگم اپنی ہیں“۔ یہ نکتہ رہ گیا تھا، کمی پوری کئے دیتا ہوں“ (۶۵)

”ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ دونوں صاحبوں کی یہ ”مدرسیت“ میری سمجھ میں
نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کیجائے اور اس سے انشا پر داندی کی سنجیدگی پرست
”میں نے عورت کے ”سینہ“ کے لئے جس پر ”سبزہ خود رو“ نہیں ہوتا آپ لوگوں
سے ایک لفظ مانگا تھا، اسی طرح مجھ کو اصرار ہے کہ وہ کرتا نہیں کرتی پہنتی ہے، کیا
یہی حیا سوزی ہے، جسے باوصف لذت کشی آپ بے نقاب دیکھنا نہیں چاہتے“ (۶۵)

مندی مرحوم کا یہ اسلوبِ تحریر جس قدر لطیف و نازک ہے اسی قدر پرخطر ہے، وہ اس راستہ میں غار کے منہ تک آجاتے ہیں، مگر قلم کا محتاط قدم اس طرح تل تل کر پڑتا ہے کہ لغزش نہیں ہونے پاتی،

۵۔ وہ نئی لطیف ترکیبوں کے پیدا کرنے کا شوق بیدار رکھتے تھے، اور جب کبھی وہ ایسی ترکیب پا جاتے تو رقص کرتے، اور اگر دوسروں کی تحریروں میں وہ ہلکے تھوہرے میں آجاتے، گرہِ شب، ہمدرد کے کف کی پری، تینہ کا سبزہ خود رو، تجا زہ شباب مہیا، انشباب، قومِ مخون، توجہ بوائی، سر کا آسید، زہرہ شب، محبت کا ثرا دین وغیرہ بیسیوں لفظ اور ترکیبیں ہیں، یہ نگینے جہاں جرّ جاتے ہیں عبارت چمک جاتی ہے،

۶۔ نئے انگریزی خیالات اور اصطلاحوں کے لئے ان کو عربی و فارسی الفاظ کے بنانے کا خاص چمک تھا، وہ اس کے ادھیڑ میں رہتے تھے، ان سے نہ بن پڑتا تو دوسرے اہل لوگوں سے پوچھتے، بلکہ فرمائش کرتے، ایسے خط مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب کے خطوں میں ملین گے، ٹیل ٹاک کے لئے متفکرات، انٹی ٹوشن کے لئے نظاماتِ ادب، ماسٹر پیس کے لئے اختراعِ فائف، ایٹی کیٹ کیلئے عواذِ رسمہ، ان ڈیفرنس کے لئے بے رخی، لپ سروس کے لئے وظیفہ لپ، چوا ٹائم کے لئے وقفہ سبکدوشی، مہنی مہون کے لئے تہذیبِ زفاف، موٹو کے لئے طرازِ انکی ایجاد ہے، وہ اردو میں انگریزی لفظوں کا بعینہ استعمال پسند نہیں کرتے تھے، مولوی عبدالباری صاحب ندوی (مبادی برکلی کے مترجم) کو لکھتے ہیں،

”مبادی کے دیباچہ میں اسٹائل اور اسٹوڈنٹ کی پیوندکاری کس ضرورت

سے ہے، آپ کی انگریزی دانی مسلم اچھا نظر بدکا ”اسپنڈ ہوگا، (ص ۱۷۱)

۷۔ ان کا ادبی ذوق اتنا لطیف تھا کہ جہاں عربی اور فارسی کا بھی کوئی موٹا یا بھدا لفظ آجاتا طبعِ سلیم کی پیشانی پر بل پڑ جاتے، ایک شذرہ میں جبکہ میں الممال کے لگن سے نیا نیا چھوٹا تھا ”لغت کبریٰ“ کا لفظ لکھ گیا تھا، انھوں نے جوابی ڈاک سے ٹوکا (ص ۲۷۲) ہمارے دوست مولوی عبدالسلام ندوی نے ایک مضمون میں ”پادریوں“ لکھا تو مذاق اڑایا، (ص ۲۷۲)

”یارانِ باصفا“ کی نہیں اپنی کتا ہوں کہ مرحوم کی زندگی تک تو میرا یہ حال تھا کہ مضمون نکلنے کے بعد ان کے خط کا منتظر رہتا اور ڈرتا تھا کہ دیکھوں کہاں کور کسر نکلتی ہے، داولتی تو خوش ہوتا اور ٹوک دیتے تو جھپ جاتا،

آخر میں مرحوم کے طرزِ انشا کی نسبت ہم اپنی زبان کے ایک ایسے ناقدِ سخن کی رائے نقل کرتے ہیں جس کے قلم کی ہر تحریر ادب کی آنکھوں کا سرمہ ہے، امدی محرم کا ایک مضمون پڑھ کر ان ہی کو لکھتے ہیں:-

”میں نے سنگلاخِ زندگی کے مرطون میں آپ میں یونان کے سنگتراشوں کی سی

نزاکت اور مصوری دیکھی تھی، اب جو محارت میں آپ کا مضمون دیکھا تو اس کے

الفاظ میں وہی مصوری پائی، گویا بولتی چلتی تصویریں آنکھوں کے سامنے تھیں

جو زبانِ حال داستانِ عبرت سا رہی تھیں“

اس مصور کا نقشِ ہستی تو سترہ سال ہوئے کہ مٹ چکا، مگر پیشینگوئی کے مطابق
اس کی بنائی ہوئی تصویریں اب بھی جیتی جاگتی ہیں،
مرحوم کوئی پیشہ ور مصنف نہ تھے جو پھلوں کی زحمت کے لئے اپنی تصنیفات
کا ذخیرہ چھوڑ جاتے،

ہمسفر بنظر، ذرا ٹھہریں، پائے نظر کی چاپ نہ ہو، عالم غیب سے مین ایک سریلی
آواز سن رہا ہوں، قادی مرحوم کی آواز ہے،
چند تصویرِ بہتان چند حسنین کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا

ہاں تہ پایا، یہی دو پتھرین مرحوم نے یادگار چھوڑ دیں، ”چند تصویرِ بہتان“ یعنی چند
مضامین جو افاداتِ قادی کے آئینہ میں جڑی آپ نے دیکھی ہیں اور ”چند
حسینوں کے خطوط“ یعنی یہ چند حسین خط جو ان میں اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں،
مرحوم کا قلم بارغ و بہار تھا، باغبان تو رخصت ہوا مگر اس کی کھلائی ہوئی بہار
اب بھی کھلی ہے، یارب جب تک ادب کی بہار ہے اس بہار پر خزان نہ آئے،

۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء

گلستانِ اجمد

کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے دوسری گذرے ہیں ایک سعدی شیرازی اور ایک
سعدی دکنی، سعدی دکنی کا حال اور مقال گو بعض تذکروں میں مذکور ہے، مگر انکی
شخصیت کے تاریخی شواہد کی پوری تحقیق ابھی نہیں ہوئی ہے،
بہر حال یہ تو زمانہ ماضی کا بیان ہے،

زمانہ حال نے ہمارے سامنے ایک تاریخی سعدی دکنی کو پیش کر دیا ہے،
جس کی شخصیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں،
یہ دکنی سعدی حکیم اشعار اجمد حیدر آبادی ہیں،

دونوں سعدیوں میں عجیب مماثلت ہے، وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی، وہ بھی
شاعر یہ بھی شاعر، وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی شرکی پیالیوں میں قند و نبات
گھونٹنے والے۔

اور یہ بھی

وہ بھی نظم و نثر کو ترتیب دے کر شراب دو آتشہ تیار کرنے والے اور یہ بھی

اخلاق و نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے
ہیں، مجاز کو حقیقت کا پردہ وہ بھی بناتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں،
اس مثال نے وحدتِ امتحان کی صورت اختیار کی اور وہ گلستان
جو سعدی شیراز کی تھی سعدی دکن کی بنکر نمودار ہوئی، اور گلستانِ امجد اپنا نام
کننے کو تو یہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہے مگر حقیقت میں امجد کی تصنیف ہے،
اس میں امجد نے سعدی کے خزانہ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قاضی
کی ملک ہو گیا ہے،

سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ مترجم نے نثر میں کر دیا ہے، اور سعدی
کی نظم کی جگہ خود اپنی ہم معنی نظم فرد، قطعہ یا رباعی کی صورت میں درج کی ہے اور اس
طرح گلستانِ سعدی گلستانِ امجد بن گئی ہے،

ترجمہ کی زبان، آسان اور روان ہے، چھوٹے چھوٹے فقرے مختصر جملے، ٹھیک
محاورے، دلکش ترکیبیں، موٹے موٹے اور بڑے بڑے لفظوں سے پرہیز، اس کتاب
کی خاص خصوصیت ہے،

بوڑھے سعدی نے یہ کتاب خدا جانے کن کے لئے لکھی تھی، مگر یہ سب سے
زیادہ بچوں کو پسند آئی، اور ان ہی کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوئی اور ان ہی نے
بچپن میں اس کا سبق لے کر جوانی میں نصیحت اور پیری میں عبرت حاصل کی،
امجد کی گلستان بھی عجب نہیں کہ ان ہی نو ناولوں کے کام آئے،

زبان کی آسانی اور نصیحت کی شیرینی کی بنا پر امید ہے کہ مکتوبن میں رواج پائے گی
 بچے اس کو مزے لے کر پڑھیں گے، اور جوانی میں اس سے نصیحت اور بڑھاپے
 میں عبرت پکڑیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مصنف کو اس نقلی گلستان کے صدقے میں اصلی
 گلستان نصیب کرے، جس کی کلیان کبھی افسردہ اور جس کے پھول کبھی پژمردہ
 نہ ہوں گے،

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ



کلام شاد

پہر مقدمہ

پنہ عظیم آباد ہندوستان کے اُن قدیم شہروں میں سے ہے جو کئی ہزار برس سے علم و ہنر کے مرکز ہیں، تاریخ کے ابتدائی عہد کو چھوڑ کر صرف آخری صدیوں کو لیجئے کہ ہر دور میں اس کی خاک سے سیکڑوں ہزاروں ادبِ کمال اٹھے جن کی شہرت کا افسانہ اب تک تاریخِ کُن نہیں بنا ہے، علم و ہنر کے لاتعداد انواع و صنوف میں سے اگر صرف ایک شعر و سخن ہی کے شعبہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر ہندوستان کے ان شہروں میں سے ہے جن کی مردم خیزی پر ہمارے ادبیات کو ناز ہے، صغیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوہ خضر میں غلط نہیں لکھا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد یہ شہر اردو کا تیسرا مرکز ہے، خاص کر جب آخری زمانہ میں دلی ویران ہوئی اور صوبوں میں خود مختاریاں پھیلین تو لکھنؤ کے بعد یہ دوسرا مرکز آباد ہوا، اور اس کے بعد تیسرا مرکز مرشد آباد تھا، جو اب کمال قدر دانیوں کی تلاش میں دلی سے نکلے تھے،

ان کی پہلی منزل لکھنؤ دوسری عظیم آباد اور تیسری مرشد آباد ہوتی تھی، اس لئے اودھ کے پایہ تخت سے لے کر بنگال کی مسدگاہ تک کمناے عہد اور فضلاے روزگار کا قافلہ ایک مدت تک آتا جاتا رہا،

دہلی کی تباہی کے بعد جس طرح لکھنؤ میں نوابی قائم ہو گئی، بہار و بنگال میں الگ مسدین لگے، اور ان کا نام ناظم ہوا، آخر میں بنگال کی نظامت سے الگ ہو کر یہ صوبہ ایک مستقل نظامت کی صورت میں منتقل ہو گیا، گوانگریوں کے پرزور اقتدار کے باعث اس کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا، اس خود مختارانہ عہد حکومت کا بانی راجہ شتاب رائے کا خاندان تھا، راجہ اور اس کا تمام خاندان اس عہد کی موز تعلیم و تربیت میں بے نظیر تھا، اور مذہب کو چھوڑ کر اس کا تمام طور و طریق اور طرز عمل سب اسلامی تھا، درباروں میں اسی طرح مسدین سمجھتی تھیں، ارباب کمال آتے تھے اور اپنے اپنے کمال کی داد پاتے تھے، اس عہد کا سب سے بڑا علمی شغلہ شاعری تھا، راجہ خود بھی شاعر تھا اور شتاب تخلص کرتا تھا، اور شعرا کا مربی اور سرپرست تھا، راجہ شتاب رائے کے علاوہ جو صوبہ دار آتے وہ بھی مرکزی کمزوری کے باعث اپنی ایک مستقل شان رکھتے تھے، اور اس عہد کے لوازم دربار کے مطابق شعرو سخن کی سرپرستی اور قدردانی میں بھی حوصلہ دکھاتے تھے، بہارم جنگ، مظفر جنگ، سید ہدایت علی خان وغیرہ صوبہ داران پہننے نے بھی اپنی بعد اپنی علمی قدردانی کے کارنامے یادگار چھوڑے ہیں،

اس علمی مرکز کے قدیم سمخوڑون میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو ولی کنی
میر و سودا، اور مرزا منظر و قاجا میر درد کے ہم پہلو تھے، ملا محمد علیم تحقیق، عبد القادر بیہ
اشرف خان فغان، سید محمد شاہ کرناچی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی بھل، محمد
روشن جوش، حبیب علی خان حسرت، شیخ محمد عابد دل، میر غلام حسین شورش
مرزا منظر علی جذب، شیخ غلام محیٰ حضور، میر محمد تسلیم، اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ
ایسے مخفوریان گذرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے
ترقی پائی ہے، تحقیق اور ناجی دلی کے قریب العصر اور راسخ میر کے ہم عہد اور ان
کے پیرو تھے، جوش خواجہ میر درد کے پیرو تھے، اور حسرت کو مرزا منظر سے تلذ
تھا، ان مسلمان شعرا کے پہلو پہ پہلو راجہ شتاب رائے شتاب، راجہ بہادر راجہ
اور راجہ پیارے لعل الفتی کے نام لینے چاہئیں، جن کی سرپرستی، سخن سنجی اور ہنسی
نے عظیم آباد کو لکھنؤ بنا دیا تھا،

اس کے بعد جو دور آیا، گو ہوا کا رخ بدل چکا تھا اور انقلاب حکومت کے
طمانچہ نے زمانہ کا رخ پھیر دیا تھا، دلون کے اگلے جوش اور ولولے سرد پڑ گئے تھے
مخفیلین برہم ہو گئی تھیں اور باطلین الٹ چکی تھیں، تاہم سیلاب کے تھمنے کے
بعد بھی کچھ دیر تک دریا کی موجیں اچھلتی رہتی ہیں، بزرگوں کے فیض دیدار سے
منور آنکھیں اس شہر میں موجود تھیں، مرزا احمد منشا، میر ذبیح، ملا احمد، راجہ پیارے
لال الفتی، سید شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ نے نئی بزم آراستہ اور نئی شمع روشن کی

شاہ الفت حسین فریادِ عظیم آبادی اپنے عہد کے ایک باکمال صاحبِ ہنر تھے گو وطنِ عظیم آباد تھا، مگر سرکاری تو سِل سے عمر کا بڑا حصہ مرشد آباد اور کلکتہ میں گزرا، نظامتِ بنگالہ کی طرف سے سفارت و نیابت کے عہدہ پر متنازع تھے، غرض علم و ادب اور دونوں درباروں میں ان کی کرسی بچتی تھی، عہد کے مذاق کے مطابق فارسی اور اردو دونوں میں داوِ سخن دیتے تھے،

شاہ صاحب کی آغوشِ تربیت میں بہار و بنگال کے سیکڑوں سخنور پلکے جوان ہوئے، مثلاً خواجہ شہرت، اصغر حن کمال، عبدالرؤف وحید، معین الدین اذلی، میر رحیم وغیرہ، مگر خاص شہرِ عظیم آباد میں جو دونوں نہال اس بہارِ سخن کے فیض سے بارگشتہ بار ہوئے، اور جو سمجھائے کہ اب تک یادگار سلف باقی ہیں، وہ نواب سید امداد امام صاحب اثر، اور سید علی محمد صاحب شاد ہیں، یہ دونوں باکمال آج ملک میں بزرگوں کے نام روشن رکھنے والے یعنی عہدِ ماضی کے چراغ ہیں، مولانا شاد کی عمر اب سستی کے قریب ہے، عمر کے بیسویں مرحلہ سے ان کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے، گویا ساٹھ برس ان کی شاعری کی عمر ہے، آج ہندوستان کے کسی گوشہ میں کسی ایسے باکمال سخنور کا نشان دوس نے ساٹھ برس کا ریاض کیا ہو، اور کتنے مشتاق یہ نمونہ پیش کر سکتے ہوں۔

شصت سالہ عہدِ سخنوری میں اس باکمال نے کیا کیا فنِ جگر نہ پایا ہوگا، کہ شعرو سخن کے یہ فعل و عین اس نے اُگلے، اور کیا کیا آنسو نہ بہائے ہونگے، جب اس فضل و کمال کے دروگو ہر ہاتھ آسکے اس وقت تک جو سرمایہ سخن منتشر اوراق کی صورت

مین ہے، اس کا اندازہ ایک لاکھ سے کم نہیں، پھر اس میں بھی قصائد، مثنویات، غزلیات، قطعات، رباعیات اور افراد سب کچھ ہیں، ایسے وسیع سرمایہ کو پیش نظر لکھ کر یہ پونے دو سو صفحوں کا غیر منتخب دیوان غزلیات کو دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ جو اہر سخن کے بیشمار انبار میں سے صرف یہ چند دانے قدر دانانِ شاد کے دامنِ شوق میں آ سکے، بہر حال ان چند دانوں سے شاد کی اصلی دولت کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے، موجودہ استادوں میں شاید حضرت شاد کا ہمصر کوئی دوسرا نہ مل سکے، جس نے ہماری محفلِ ادب کا پچھلا سماں دیکھا ہو، استادانِ کن کی صحبت اٹھائی ہو، اور ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع کی بندش اور ایک ایک لفظ اور محاورہ کی تلاش میں خواب و خود اپنے اوپر حرام کر لیا ہو،

شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا، لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ کے اربابِ کمال سے رہا، تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری پر لکھنؤ سے بہت زیادہ دلی کا رنگ نمایاں ہے، ان کے کلام میں کمین کمین لکھنؤ والوں کے صنائعِ بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے، مگر شاعری کا مذاق، مضامین، معانی، خیالات، سنجیدگی، متانت ہر چیز دلی کا پتہ دیتی ہے، اس کے ساتھ جو چیز شعراے لکھنؤ کی ان میں نظر آتی ہے، وہ الفاظ کی صحت، محاوروں کا تتبع اور فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہے اس طرح ہم عظیم آباد کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت سے لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہیں گے،

شاد کی شاعری حن و عشق کے عامیانہ اور سوتیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک
 ہے، پاکبازانہ حن و عشق، اور رزم و بزم کی دلکش روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں
 اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے، غزل گوئی کے لحاظ سے
 شامین تیر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں، حن و عشق کی داستان سرائی
 میں وہی سادگی اور متانت ہے، چھوٹے چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں،
 بیان میں وہی رقت ہے، تیر ہی کے اوزان و بحر ہیں، وہی انداز کلام ہے وہی
 فقیرانہ صدا ہے، اس لئے شاد کو اس دور کا تیر کہا جائے تو بالکل بجا ہے، افسوس
 کہ فرصت مفقود ہو نہ شاد کے پورے دیوان پر ایک نظر ڈال کر یہ تفصیل مثالوں
 سے اپنے دعووں کو روشن کرتا،

جانشاہ کا یہ دیوان درحقیقت ان کے بلا انتخاب، اور نامرتب کلام کا ایک
 مختصر مجموعہ ہے، یہ ان کی شاعری کا کامل نمونہ نہیں ہے، مصنف نے اپنے ایک
 مفصل گرامی نامہ میں جو راقم حروف کے نام تھا، ان تمام نقائص اور مصیبتوں کی
 داستان لکھی تھی جو اس مجموعہ کی ترتیب میں پیش آئیں جن میں سے سب سے بڑی
 مصیبت یہ تھی کہ مصنف سے نظر ثانی کرانے اور نیز حرکت و اصلاح کے ان
 اشارات سے جو مصنف نے نظر در نظر کے بعد کاغذوں کے حواشی اور اطراف میں
 وقتاً فوقتاً بنائے تھے، جامع اور مرتب اصحاب نے پہلو تہی کی اور یہ اصحاب اسکی
 یہ معذرت پیش کرتے ہیں کہ اگر نظر ثانی اور اشارات و اصلاحات کے سمجھنے کے

یہ مجموعہ مصنف کے سپرد کیا جاتا تو ہماری محنت بھی اسی طرح دریا برد ہو جاتی جس طرح
اس سے پہلے خود مصنف کی کئی محنتیں اس باب میں غایت احتیاط کی بنا پر غارت
ہو چکی ہیں،

بہر حال اس مجموعہ سے پہلے سید حسرت موہانی نے دیوان شاد کا جو مختصر انتخاب
شائع کیا ہے، اس سے تو بہت زیادہ سرمایہ اس کاغذی خزانہ کے اندر ہے خدا
وہ دن لائے کہ جب حضرت شاد اپنا ضخیم کلیات خود مرتب کر کے قدر دانوں
کے ہاتھوں میں دیں، اس وقت اس پور بی شاعر کے فضل و کمال کا چراغ پورب
سے کچھ تک کی دنیا سے ہند کو منور اور روشن کر دے گا،

دارالمصنفین عظیم گدہ
۱۰ اشوال المکرم ۱۳۲۱ھ

کلیا عیش

ہمار کی سر زمین میں ہمیشہ دو متضاد صفیتیں جمع رہی ہیں، وہ جیسی مردم خیر ہے
 جیسی ہی مردم غوار بھی ہے، یہاں کی مٹی میں جتنی صلاحیت اور استعداد ہے، افسوس
 ہے کہ اس کی آب و ہوا میں نشوونما کی اتنی قدرت نہیں، یہاں ہر دور میں بے سید
 اہل کمال پیدا ہوئے مگر وہ اہل وطن کی ناقدری کے ہمیشہ شاکی رہے، بختیار
 بخلی کے فتوحات کے بعد سے پورب کا یہ قطعہ ملک کے دوسرے حصوں
 سے کسی امتیاز اور خصوصیت میں کم نہیں رہا، تاہم ان کے
 ہموطن معاصرون کی ناقدری کے سبب سے تاریخ کے صفحے ان کے ناموں اور کارناموں
 سے خالی نظر آتے ہیں،

ہندوستان نے ارباب کمال کے تمام اصناف میں سے صرف دو کے
 نام زندہ رکھے ہیں، مشائخ اولیاء اور شعرا کہ وقتاً فوقتاً ان کے یا اخلاص مریدوں
 اور معتقدوں نے ان کے ملفوظات و مکتوبات اور تذکرے لکھ کر ان کے فیوض
 و برکات اور زبانی و ذہنی الہامات کو قائم و باقی رکھا، مگر اس صوبہ نے ایک

حضرت مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کو چھوڑ کر ہندوستان کی اس رسم کن کو بھی تازہ نہ رکھا، ”نیک کن و بد ریا انداز“ کے اصول پر ”بڑی و گنہام باش“ یہاں کے ارباب کمال کی دستاویز فیضیت کا طرہ امتیاز رہا،

سلطان سلیم شاہ لودی کے زمانہ میں شیخ بڑھ یا شیخ بڑھ بہار میں ایک نامور طبیب اور ممتاز شیخ تھے، شیر شاہ سوری کو ان سے ایسی عقیدت تھی کہ خود اپنے ہاتھ سے وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، شیخ علانی کے مشہور ہنگامہ میں دارا سلطنت اگرہ کے علما کی باہمی کشاکش سے گھبرا کر ان ہی شیخ بڑھ کو اس نے حکم مقرر کیا تھا اور اسی ضمنی حیثیت سے تاریخون میں ان کا تذکرہ ہے اور اسی ضمنی تذکرہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے ملک العلماء، دولت آبادی کی تصنیف ارشاد کی ایک شرح لکھی تھی جیسا کہ بدایونی میں ہے،

اکبری دور میں بہار میں محدثین کے ایک خانوادہ کا پتہ لگا ہے جس نے مولانا یسین گجراتی اور شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے فیض پایا تھا اس کے بعض ارکان کے نام یہ ہیں، ”حافظ الوقت مولانا شیخ عبدالرزاق بہاری

۱۔ تاریخ فرشتہ کے جامعہ عثمانیہ کے مترجم (ترجمہ تاریخ فرشتہ ۱۲ دو جلد دوم) اس پر حاشیہ صفحہ ۱۹۰ میں لکھتے ہیں کہ بہار کی جگہ بیان نہ چاہئے، اور بڑھ کی جگہ بہودہ، لیکن اس تصحیح کی سند معلوم نہیں، شاید مترجم کو ان بہودہ خاں طبیب کا خیال ہے جنھوں نے سکندر شاہ لودی کے لئے ہندی طب پر ایک کتاب لکھی ہے، حالانکہ تاریخ فرشتہ (احوال سلطنت سلیم شاہ سوری) اور منتخب التواریخ بدایونی (مطبوعہ کلکتہ) جلد ۱۱ میں تبصرہ بہار لکھا ہے،

شیخ الوقت مولانا عبد الباقی، مولانا عبد المتقدر محدث، مولانا محمد عتیق بن عبد السمیع بہاری،
مگر یہ نام اس طرح محفوظ ہیں کہ ان کی دی ہوئی حدیث کی ایک سند پھلواری میں
قلمی ملی ہے،

عالمگیری کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری نام جو مستند و معتبر کتاب علماء کی ایک جماعت
نے مل کر بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی، اس میں بہار کے علماء بھی شریک تھے، مگر اس کا
ثبوت اب صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ ان کے خاندان میں یہ روایت چلی آتی ہے
کہ ان کے اسلاف کو یہ عزت حاصل ہوئی تھی،

آخر زمانہ کے علماء میں ملا محبت بہاری جو سلم اور سلم کے مصنف ہیں، اور جو
کے عہد میں کابل کے قاضی اور بہادر شاہ اول کی حکومت میں کل ہندوستان کے
قاضی القضاۃ تھے، ان کے حالات کی چند سطور صرف آزاد بلگرامی کے صدقہ
میں آج ہمارے سفینہ علم میں ہیں، حالانکہ یہی وہ ہستی ہے جس کی یہ دونوں کتابیں
پوری ایک صدی تک اودھ کے مشہور علمی خاندان فرنگی محل کی ذہنی تگ و دو
کا میدان ہی ہیں، یہ چند سطور آزاد کے صحیفہ (سبحہ المرحان اور مائثر الکرام) میں صرف
اس تعلق سے باقی رہ گئیں کہ ملا محبت اللہ، ملا قطب الدین سہالوی کے ہمدرد اور
یہ دونوں ملا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد تھے، اور ملا محبت اللہ لکھنؤ کے قاضی
مقرر ہو گئے تھے،

ملا غلام یحییٰ بہاری جن کے حاشیہ کا پڑھنا اور پڑھانا آج سو برس سے ہندوستان

کے نصابِ فلسفہ کا منتہا ہے کمال سمجھا جاتا ہے، ان کی پوری سوانح عمری کا اتنا ہی حصہ معلوم ہے کہ وہ حضرت میرزا جانجنان کے مرید تھے، اور شمس العلماء اژدہ نے آپ حیات میں میرزا جانجنان کی لطافتِ طبع، اور ملامتِ محیی کی لمبی گھنٹی داڑھی کا لطیفہ سنایا ہے، گذشتہ صدی کے واقعات کو جانے دیجئے، اس صدی کے بزرگوں کے نام لیجئے جن کے فضل و کمال کے آوازہ سے ان کی زندگی میں پورا ہندوستان گونج رہا تھا، مگر اب تاریخ کے نقارخانہ میں ان کے نام کی بھنک بھی سنائی نہیں دیتی، مولانا ابراہیم صاحب آروی شمس العلماء مولانا محمد سعید عظیم آبادی مولانا محمد کمال صاحب، مولانا حکیم عبدالباری صاحب، مولانا حکیم محمد ظہیر حسن صاحب شوق نیوی، حکیم محمد نصیر صاحب، مولانا حکیم عبدالحمید صاحب، مولانا شاہ عین الحق صاحب پھلواروی، مولانا شمس الحق صاحب محدث اور صوبہ کے مشرقی دیہاتوں میں مولانا وحید الحق صاحب (استخوان) مولانا یعقوب صاحب اور مولانا مصطفیٰ شیر صاحب (دلیہ) مولانا احسن صاحب (گیلائی) مولانا سادات حسین صاحب (کٹہ) مولانا بشارت کریم صاحب (پڈھوک) مولانا محمد رفیع صاحب (شکرتوان) مولانا قاری عبداللہ صاحب (شاہ پور بائید پور) وغیرہ وہ نادرد روزگار ہستیاں تھیں جن کے دامن تربیت میں سیکڑوں باکمال پلکرجوان ہوئے، مگر افسوس کہ ان کے سوانح حیات کا ایک صفحہ بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں، آج کتنوں کو معلوم ہے کہ دہلی اور ٹونک کے وہ نغمہ طراز بیل جن کی نغمہ سنجیوں سے باغِ ہند کا گوشہ گوشہ معمور ہوا ان کا

آشیانہ اسی سرزمین کا ویرانہ تھا، محدث عالم مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کا آفتاب سورج گدھ سے طلوع ہوا تھا، مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹوکی کا مرزا میزنگر کا قریہ ہے، اور مولانا مفتی عبدالقد صاحب ٹوکی بختیار پور کے قریب کسی دیہات سے تعلق رکھتے تھے،

الغرض یہ اس شیراز ہند پور کے آخری خطہ کی یہ طبعی و فطری خصوصیت ہے جسکی فرسودہ شکایت آج بے سود ہے،

اس سرزمین میں علما اور فضلاء کا جو حال ہوا، وہی شعراء کا بھی ہوا، حالانکہ میر کی نہات اشعار (۱۱۶ھ) اور تذکرہ حیرت (۱۱۶ھ) کے بعد سخن گو یاں اردو کے ابتدائی تذکرے پہلے سین مدون ہوئے، شورش نے ۱۱۹۴ھ اور عشق نے ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ میں شعراء اردو کے تذکرے لکھے، یہ دونوں تذکرے عظیم آباد ہی میں لکھے گئے، ان کے علاوہ گلزارِ خلیل اور اس کا ترجمہ گلشنِ ہند بھی اسی چمن زار پروردہ ہیں، لیکن ان پرانے تذکروں کا حاصل بھی نام و تخلص اور چند منتخب اشعار کے سوا اور کیا ہے؟

خاص عظیم آباد میں پیدا ہونے والے، اور وہلی سے اگر میان بنے والے شعراء کی بڑی تعداد ہے، خواجہ امین الدین امین، سید جبار علی بسمل، عبدالقادر بیدل، لہ شعراء کے مقدمہ میں جو اہل معارف ہوا اس کا ۱۱۱۵ھ میں تالیف پانا لکھا ہے، وہ غلط ہے اسلئے

اس کتاب کے مصنف کو بھی دھوکا ہوا ہے (صفحہ ۲۷)

ملا محمد علیم تحقیق، شیخ محمد روشن جوش، میر باقر حزمین، ہیبت علی خان حسرت، میر
 غلام حسین شورش، رحمت اللہ عشقی، شاہ رکن الدین عشق، غلام حسین محرم، آقا حسین
 قلی خان عشق، ظریف الملک کوکہ خان، اشرف علی خان قنآن، میرزا محمد علی فدوی،
 محمد شاہ کراچی، شیخ غلام علی راسخ، مرزا منظر علی جذب، شیخ غلام محلی حضور، میر محمد تسلیم،
 راجہ پیارے لال آفقی، شیخ محمد عابدول، شاہ افست حسین فریاد وغیرہ ناموران سخن کے
 حالات و واقعات اور ان کے شعرو سخن اور فضل و کمال کی تصویریں اگر کاغذ پر کھینچی
 جائیں تو آبِ حیات کا ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے،

شکر کا مقام ہے کہ ملک کی نئی نسل کو اپنے پرانے بزرگوں کی یادگاروں کو
 زندہ کرنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، اسی شوق کا ایک نتیجہ یہ کتاب یادگارِ عشق
 ہے، مولوی حسن رضا صاحب عظیم آبادی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے
 ان پرانے بزرگوں میں حضرت شاہ رکن الدین ابو العلاء المعروف پشٹا
 گھیٹا المتخلص بہ عشق شاہ جہان آبادی عظیم آبادی کے کارنامہ حیات کو اس نئے
 زمانہ میں نئے آب و رنگ سے پیش کیا ہے،

سب کو معلوم ہے کہ شیراز سے لے کر دلی تک تصوف اور شاعری نے دو
 بدوش نشوونما پائی ہے، سلطان ابوسعید انخیر اور خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ
 نے جبے شاعری کو تصوف کی زبان قرار دیا، اس وقت سے لے کر آج تک
 معرفتِ ربانی اور معاملاتِ دل کے رموز و حقائق اسی زبان میں ادا ہو رہے ہیں

اور جب تک لکھنؤ نے اس خانقاہ کی بوٹی کو کوچہ و بازار کی زبان نہیں بنا دیا تھا یہ معرفت کا گنجینہ اور حقیقت گوئی کا مرقع رہی، لیکن لکھنؤ کے بازار میں اگر اس پوسٹ کا وقار قائم نہ رہا، اور جمالِ لن ترانی کے بجائے "حن بہار رقیب" اس کا موضوع قرار پا گیا، شاہ گلشن، میرزا منظر، خواجہ تیر و رد، میر محمد اثر اور شاہ رکن الدین عشق کے سترار، ہر بول و لہجہ حن پرست کا ترانہ شوق بن گیا۔ خانقاہوں میں اترنے والی حور بازاروں کی ہر جائی بن گئی، صدائے غیب الہام کی زبان جنوں و سودا کی بڑبڑی طور کا مقدس افسانہ، اصرار و انکسار، ہر لب بام اور ہر رہ گزر کے ہجر و وصال کی حکایت ہو گئی،

ن
شاہ رکن الدین عشق بھی اسی اگلی دو آتشہ کے متوالے تھے جو ہمیشہ پرانے بزرگوں کی شراب الصالحین رہی ہے، عشق کے پیالہ میں گلاب معرفت اور بادۂ سخن و بیانی کی آمیزش تھی، اسی لئے ان کا کلام دو تون حلقوں میں مقبول ہوا اور دو تون باد سے ان کو حن قبول کی سند ملی، ان کے سوانح نگاروں نے بھی ان کے تذکرہ میں ان کی ان دو گوشت کیفیتوں کا ذکر کیا ہے،

میرزا علی لطف اپنی گلشن ہند میں علی ابراہیم خان خلیل عظیم آبادی کے گلوں ابراہیم کے حوالہ سے جو سالہ میں تالیف پائی، لکھتے ہیں، یہ وہ وقت تھا جب حضرت عشق مندرجیات پر جلوہ آرا تھے،

”عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام، شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے، شاہچن آبادی

نواسہ شاہ فرہاد کے، عمدہ مشائخون مین سے دلی کے۔ جہان بیان ہوتی شاہ
 فرہاد کی حالت سکروستی ہے تو کہتے ہیں کہ اس عالم مین تعظیم بادشاہ کی نہیں
 کی ہے، غرض عشق ایام شباب میں شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے
 اور خواجہ محمدی خان مرحوم کے ساتھ ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر لائے
 اگرچہ کچھ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے، لیکن آنکھوں مین امرایان مرشد آباد
 کے نہایت احترام رکھتے تھے، بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگون کے طور
 پر مزاج فقرو درویشی کی طرف آیا اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت
 کا عظیم آباد مین ٹھہرایا، پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی
 اور معتقدون کے ہجوم سے عالم درویشی مین شاہی کی، طالبان راہ حق کو ہدایت
 مطلب سے خالی نہ چھوڑا، بقول علی ابراہیم خان مرحوم ۱۱۹۵ھ سو پانچا نوے
 ہجری تک داد حال و قال کی دی آخر بلبدہ عظیم آباد مین مرشد حقیقی قضا کے
 ارشاد دعوت پر لبیک اجابت باوازا بلند کی، دیوان اس مشیخت و سنگاہ
 کا زبان ریختہ مین مرتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے،

میر حسن دہلوی مرحوم (المتوفی ۱۲۰۱ھ) جو حضرت عشق کے ایک دوسرے
 ہمعصر تذکرہ نویس لکھتے ہیں،

۱۔ اس کتاب یادگار عشق کے صفحہ ۵ میں علی ابراہیم کے فارسی تذکرہ نگار ابراہیم سے یہ سنہ
 یکہزار و یک صد و پانچ نقل کیا گیا ہے، یا سہواً چھپ گیا ہے ۱۲۰۵ھ اس کو یکہزار و یک صد و نو
 و پانچ ۱۱۹۵ھ ہونا چاہئے، ”سیلمان“

”خورشید سپہر حال و سپہر خورشید کمال، مالکِ کموز و قائق و کاشفِ رموز حقائق،
 کلامش بڑا قیاس و نور صفا ہے باطنش چون آئینہ صبح دل کشا و عین
 صفا، عارف صاحب کمال، دودیش بے مثال شاہ رکن الدین عرف مرزا
 گھیسٹا المتخلص بہ عشق، مرد صوفی است کہ خیلِ مریدان و معتقدان حلقہ غلامی
 دارند، در سلسلہ نقشبندیہ نقش زدہ، اصلش از شاہان آباد است، پیشتر نوکری پیشہ
 بود، الحال از مدتے ترکِ روزگار نمودہ بہ عظیم آباد مقیم است، مرزا قدوسی از
 شاگردان و معتقدان اوست، شعر عارفانہ در کلامش بسیار است، لگا ہے در
 ذوق و شوق یا بعالم وجد و وسعہ شعری فرماید، دامِ افضالہ

عشق کے چمن میں فیوضِ برکات کی یہ بہار جس گلستانِ بے خزان سے آئی
 ہے اس کا نام ”سلسلہ ابوالعلائیہ منعمیہ“ ہے، ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کی تھوڑی تشریح
 کر دی جائے، یہ سلسلہ سیدنا ابوالعلاء اکبر آبادی اور حضرت مخدوم شمس پاک قدس سرہ
 کی طرف منسوب ہے، حضرت عشق کا تعلق اس سلسلہ سے خاندانی اور موروثی تھا،
 اس سلسلہ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر بزرگ اوائل میں شاہی

لے اس فقرہ سے یہ سمجھنا کہ یہ تاریخ وفات ہے (یا گاہ عشق صفحہ ۱۴) جوچہ بنین بلکہ علی ابراہیم خان کے تذکرہ کی
 ان سطروں کی تحریر کا سنہ ہوا چنانچہ خود مصنف یا دو گاہ عشق نے صل گزرا ابراہیم سے گلشن ہند کی اس
 اردو عبارت کا اصل فارسی فقرہ جو نقل کیا ہے، اس میں یہ مطلب صاف ہوا، و تا حال سنہ یکہ تراویکھ و
 نو دو پنچ ۱۱۹۵ھ است کہ اس صاحب حال و مرجع کمال در ارشاد و طالبانِ حق اشتغال دار و مرزا
 علی لطف نے گلشن ہند میں اس فقرہ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ مشتبہ ہو گیا ہے، ”سیلمان“

درباروں سے اٹھ کر شہنشاہ علی الاطلاق کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں،
 سیدنا ابوالعلاء | سیدنا امیر ابوالعلاء خاندانی امرائے شاہی میں تھے، آپ کے دادا امیر
 عبدالسلام اور آپ کے والد ماجد امیر ابوالوفاء ترکستان کے شہر سمرقند سے جلال الدین
 اکبر کے عہد میں فتحپور سیکری آکر مقیم ہوئے، سیدنا ابوالعلاء مضافاتِ دہلی میں سے
 نریلہ نام مقام میں پیدا ہوئے، آپ کے والد نے آپ کو کمن چھوڑ کر انتقال کیا، اس لئے
 یہ وراثت اپنے نانا کے دامنِ تربیت میں آیا، آپ کے نانا خواجہ فیضی بنگالہ میں بردوان
 کے ناظم تھے، اس تعلق سے آپ بردوان گئے، نانا کے مرنے پر آپ امرائے شاہی
 میں داخل ہوئے، مگر توفیقِ ازل کی دعوت پر بہت جلد امیر نواز شہنشاہ ہند کی بارگاہ
 معنی سے الگ ہو کر سلطان الهند غریب نواز کی درگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے
 اور مدتوں وہیں جمیر میں معتکف رہے، اور اس روحانی درگاہ سے بے واسطہ
 کسبِ کمال کے بعد اکبر آباد گئے، جہاں اپنے چچا حضرت عبدالکبر آبادی سے
 طریقہ نقشبندیہ میں مرید ہوئے، مگر جمیر شریف کے کیف و اثر نے فیضِ چشت سے بھی
 مالا مال کر دیا تھا،

ابوالعلاء فی سلسلہ کے بانی آپ ہی ہیں، سلسلہ دراصل نقشبندی اصولِ تعلیم کا مختصر
 نصاب ہے، جس کو حضرت سیدنا ابوالعلاء نے اپنا زمانہ کی سب سے بہتر ہستی کو منظور کیا
 مرتب فرمایا، عشق و توحید اس اصول کی اصل ہیں، ۹ صفر ۱۱۱۱ھ میں وفات
 پائی، مزار پر نواز اکبر آبادی ہیں، آپ کے خلفائے شمس العلماء میر سید دوست محمد قدس

مشہور و ممتاز ہوئے، امیر ابو العلاء کی یادگار ایک مختصر سا دیوان ہے جس کا ایک نسخہ خانقاہ اسلام پور (پٹنہ) میں موجود ہے،

شمس العلماء میر سید دوست محمد | شمس العلماء میر سید دوست محمد برہان پور دکن کے رہنے

والے تھے، سیدنا ابو العلاء کی صحبت میں کامل ہوئے، اور اجازت کے بعد اپنے وطن جا کر تشنگان حق کو سیراب کیا، اورنگ آباد دکن جا کر اقامت کی، ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی، یہ ہندی کے شاعر تھے، اپنے پیر سے جدائی کے بعد مٹیم کہانی ایک مثنوی لکھی جو صوفیہ میں مشہور ہے،

شاہ محمد فرہاد دہلوی | حضرت رکن الدین عشق ان ہی حضرت شاہ محمد فرہاد دہلوی کے

نواسہ تھے، شاہ محمد فرہاد کے والد ماجد دکن کے صوبہ دار ہو کر اورنگ آباد گئے تھے

اس تعلق سے شاہ فرہاد کا بھی اورنگ آباد جانا ہوا، اور اس زمانہ سے جبکہ ان کی عمر

بارہ تیرہ برس کی تھی، آپ میر سید دوست محمد شمس العلماء کے حلقہ میں آنے جانے

لگے، پھر کچھ دنوں کے بعد ان سے مرید ہو گئے، اور اپنے پیر کے حکم سے دہلی آکر

اپنے فیض کا چشمہ جاری کیا، محو و استغراق کا یہ عالم تھا کہ حق سے آشنا ہو کر خلق سے

بیگانہ ہو گئے تھے، اور ماسوا کی خبر نہ رہی تھی، ۱۱۲۵ھ میں دہلی میں وفات پائی،

خلفاء میں حضرت برہان الدین خدا نا اور میر اسد اللہ بزرگ ہوئے،

امیر اسد اللہ | سید اسد اللہ ارکان شاہی میں تھے، خواجگاہ خاص کا اہتمام آپ کے سپرد

تھا، اسی خواجگاہ میں آپ کے باطن کی سنگین کھلیں، جب یہ راز فاش ہوا تو منصب شاہی

شاہی سے کنارہ کش ہو کر حضرت شاہ فرہاد کے حلقہ میں آکر بیٹھ گئے، اور آخر وہاں سے مرد کامل بن کر اٹھے، ۷۷۱ھ میں وفات پائی،

آپ کے خلفاء میں حضرت مخدوم شاہ محمد منعم قدس سرہ العزیز نہایت ممتاز ہوئے اور جن کی نسبت سے ابوالعلائی سلسلہ کی ایک نئی شاخ منعمی پھوٹی،

مخدوم شاہ محمد منعمؒ آپ شیخ پورہ ضلع مونگیر (بہار) کے ایک قریہ بچنا کے باشندہ

تھے، ظاہری اور باطنی دونوں تعلیمی سلسلے دارالعلوم دہلی میں مکمل ہوئے، ظاہری تعلیم کے بعد حضرت شاہ فرہاد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ میں بیٹھے اور ان کی وفات

کے بعد میر سید اسد اللہ کی صحبت میں مدایح سلوک کی تکمیل کی کہتے ہیں کہ جامع مسجد دہلی کے ملحقہ مدرسہ میں پچاس برس قیام پذیر رہے، اور پھر بڑے عظیم آباد آکر تکیہ کی

مسجد میں اپنا سجادہ بچھایا، یہی حضرت شاہ محمد منعمؒ ہیں جن کے حلقہ ارادت میں حضرت شاہ رکن الدین عشق عظیم آباد آکر داخل ہوئے، سلسلہ یہ تھا کہ حضرت

شاہ محمد منعمؒ حضرت عشق کے نانا شاہ فرہاد کے صحبت یافتہ یعنی ان کی خاندانی ورثہ کے امین تھے، اس بنا پر حضرت مخدوم منعم پاک سے بڑھ کر حضرت عشق کی رہنمائی

کا کوئی دوسرا حق دار نہ تھا، اور یہی وہ مسجد تھی جس کو حضرت عشق کے لئے چھوڑ کر مخدوم منعم پاک ملا متین کی مسجد میں چلے گئے تھے،

حضرت مخدوم محمد منعمؒ نے ۷۵۰ھ میں وفات پائی، خلفاء میں مخدوم شاہ عظیم آبادی، حضرت مولانا حسن رضا متوطن راے پورہ ضلع پٹنہ صوفی شاہ محمد منعمؒ

علی حسن

(دھاکہ) حضرت شاہ رکن الدین عشق نامور ہوئے،

شاہ رکن الدین عشق | حضرت عشق نے حضرت مخدوم منعم پاک سے ابو العلاءؒ کی طریقہ
ان کے ہم سلسلہ کی تعلیم اور فیض حاصل کیا اور ایک عالم کو اس سے سیراب کیا

اور بقول تذکرہ نویسون کے، معتقدون کے ہجوم اور مریدوں کی کثرت سے فقیری
میں بادشاہی کی، آپ کے ہم پیر مخدوم شاہ حسن علی سے بھی جنھوں نے ۱۲۲۴ھ میں قبا
پائی اور جن کا مرزا عظیم آباد محلہ خواجہ کمان گھاٹ میں ہے، یہ فیض عام ہوا، ان کے
خلیفہ اور جانشین مخدوم سید منظر ولی عرف شاہ یحییٰ علی بن جن کے بزرگون کا وطن
تاریکہ رہا، اسے چار کوس شمال کی طرف دینہ تھا، ان کے پاس بہ یادگار
سلف آبادی اب ویرانہ ہے، تھا اور ناہمال بہار محلہ چاند پورہ تھا، اور مدفن صفی
خسر و پورا سٹیشن کے پاس دریا کے کنارے ہے، ۱۲۶۶ھ میں وفات پائی،

مخدوم شاہ یحییٰ کے خلفا شاہ اشرف علی واسطی زیدی (نوادہ) شاہ جمال علی بٹ
رشیچپورہ) مولانا شاہ ولایت علی (اسلام پور) اور مولانا امیر الحسن (محلہ دوندی بازار
پٹنہ) ہوئے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس سلسلہ عالیہ کا دائرہ کس طرح اس صوبہ کے
گاؤں گاؤں کو گھیرے ہے،

شاہ رکن الدین عشق کا اردو کلیات | اوپر کی سطروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عشق
اس کا خلاصہ محض شاعر نہ تھے بلکہ حضرت مرزا منظر جانان

اور حضرت خواجہ میر درد کی طرح وہ ظاہر و باطن اور حال و قال کے جامع تھے، دوسرے

ستون بزرگوں کی طرح ان کی نسبت بھی کتنا چاہئے کہ شاعری دون مرتبہ اوست
حضرت عشق کا اردو کلیات ۱۰۰ صفحوں کو محیط ہے، اس انتخاب میں مولف
نے یہ کوشش کی ہے کہ اس بھند کو ساٹھ صفحوں کے کوزہ میں بند کر دیں، یہ کام جتنا
مشکل ہے ظاہر ہے، اس ناقدری کے زمانہ میں سات سو صفحوں کی اشاعت کیلئے
ایک بڑا سرمایہ چاہئے، اور دنیا کا حال کم و بیش اب بھی وہی ہے جو حضرت سعدی
کے زمانہ میں تھا، ۷

کریاں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

ایسی حالت میں سات سو صفحوں کا یہ ساٹھ صفحوں میں انتخاب شائع کرنا بھی
اردو پر احسان ہے، اور قدیم اردو کے ذخیرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے،
شاید اس انتخاب کو پڑھ کر کوئی قدردان پورے کلیات کی اشاعت کی ہمت
اس انتخاب کے مقدمہ میں مولف نے شرح و بسط کے ساتھ حضرت عشق
کے کلام پر ہر حیثیت سے بحث کی ہے، اور جہاں تک مواد اور مضامین نے
اجازت دی ہے بحث کے ہر گوشہ کے احاطہ کی کوشش کی، یہی حضرت عشق کے
کلام کا عام انداز ہی ہے جو حضرت مظہر اور خواجہ درو کا ہے، کہیں کہیں زمین، بحر
اور قافیہ کا بھی اتحاد ہے، حضرت خواجہ درو کی مشہور غزل ۷

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

پر عشق کی غزل ہے، ہے

چین ہی اس دل بیتاب کا منظور نہ تھا
ورنہ آتا ترانچہ پاس تو کچھ دور نہ تھا
کچھ نئی طرز ملاقات نکالی اب تو
ورنہ آگے ترے ملنے کا یہ دستور نہ تھا
دیر و کعبہ میں سا گوش سودل کے ہم نے
عشق کے ذکر سوا اور تو مذکور نہ تھا
صوفیانہ مضامین کی آمد وہی ہے جو دروین ہے، مگر درد کا مختصر سا بیانِ غم یعنی
ان کا دو جز کا مختصر دیوانِ عشق کے ۵۰ جز کی شرحِ اہم یعنی ان کے کلیات کیسے
سمندر اور قطرہ کی نسبت رکھتا ہے،

صوفیانہ کلام | حضرت عشق کے صوفیانہ کلام کا نمونہ اس انتخاب (یادگار عشق) اور
میر حسن اور گلشن ہند سے ناظرین کے پیشکش ہے،

دیدہ دل جو کر کے وا دیکھا
حرم و دیر میں خدا دیکھا
اس کے دہن تلمش پہنچے ہم
خاک میں آپ کو ملا دیکھا
آشنا تجھ سے ہونہ ہو کوئی
پر تجھے سے آشنا دیکھا

— ❖ —

میری آنکھوں سے وہ جدا بھی یا
گو وہ مجھ پر نظر نہیں رکھتا

— ❖ —

خانان کرچکا ہوں میں برباد
اس پہ وہ میرے گھر نہیں آتا

— ❖ —

حرم میں نام سنا، دیر میں نشان دیکھا
 سولے تیرے نہ دیکھا غرض جہاں دیکھا
 اسی کا آئینہ ہنردہ ہزار عالم ہے
 دوانے کیا کون تجھ سے کہا کہاں دیکھا
 نہ عزم وادی میں نہ طور کا ہے قصد
 جو کچھ کہ دیکھنا تھا دل میں سب یہی دیکھا

— ﴿﴾ —

عرش تا فرش سیر کر دیکھا
 تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
 چشم تحقیق سے جہاں دیکھا
 کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا

— ﴿﴾ —

کوئین میں جو کچھ ہر سو اس میں سما ہے
 کب عرش سے چھوٹا ہی کا شانہ محبت کا
 اس کافر بیدین کی کیا بات کہے کوئی
 کعبہ کو بنا ڈالا تجا نہ محبت کا

— ﴿﴾ —

وہ دل جو بوعلی کو بتاتا تھا درس عقل
 شرح کتاب عشق سے ناچار ہو گیا

— ﴿﴾ —

آزادگی کا قیدی محتاج ہو نفس کا
 سوداں اس کی خاطر ہو کشمکش نفس کا

— ﴿﴾ —

کوئین سے کب کام ہو دیو آنکوترے
 آرام نہ ہوا سکو تجھے دیکھے نہ جب تک

— ﴿﴾ —

کہنے کو ادھر ادھر گئے ہم
 تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

میں اپنی جستجو میں ہیں آپسے اس قدر گئے ہم
تب سمجھے کہ کیا ہے کفر و اسلام ان دنوں سو جب گزر گئے ہم
تھا کعبہ و دیر سے کے کام مقصود تھا تو جدھر گئے ہم
جز عشق نہ سمجھے کفر و دین کو طرفین سے بے خبر گئے ہم

نہ بتا نہ کو جاتے ہیں نہ کعبہ میں بھٹکتے جہاں تم پاؤں رکھتے ہو وہاں ہم سر نہکتے

ہستی چھپی عدم میں، ہوئی نیستی نمود دھوکا نہ کھا کہ مخفی ہے دریا سما میں

یار چاروں طرف نمایاں ہے عشق تو اب کدھر بھٹکتا ہے

ہستی ہے ایک عشق کی پیدا ہو یا نہ ہم تم کا ذکر کیا ہے، وجود و عدم غلط

وابستہ تری ذات بستی ہو جان کی جب تو نہ ہو خالق میں ویرانہ کہیں گے

کیونکر ملین گے تجھ سے جب تک عدم نہ ہونگے اس وقت تم ہی تم ہو جو وقت ہم نہ ہونگے

دل سا جگر جو رکھے سو اس سے دو بند ہو منہ دیکھو آئینے کا جب اُسکے رو برو ہو

❦

عالم میں اگر طرہ مجبوب نہ ہوتا یہ سلسلہ نظم جہاں خوب نہ ہوتا
عاشقانہ کلام | حضرت عشق کے عاشقانہ کلام کی اصلی خوبی، سادگی، لطافت، جوش
بیان اور روانی ہے، مصرعون میں اتنی برکتی ہوتی ہے کہ ہر شعر خوبی و فصاحت
کی ایک صاف و مصفا سبیل ہے، نہ پیچیدگی ہے، نہ اشکال ہے، نہ ثقل تر
ہے، ساتھ ہی فصاحت و بلاغت کی یہ جوئے روان، ابتذال، اور مضامین پامال
کے خس و خاشاک سے پاک ہو،
کچھ دل سنگ میں اثر نہ کیا تجھ کو اے آہ ہم نے دیکھ لیا

❦

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ کیوں تو نے ڈر دیا دل نے کیا تھا جمع سو آنکھوں نے کھو دیا
اگے میان نصیب ہے سر سبز ہو نہ ہو دل کی زمین میں تجم مجت تو بو دیا
دل اور جان دینے میں تقصیر کچھ نہ کی عشق اس نے جو طلب کیا ناچا سو دیا

❦

ایک دن بھی خیال دل داری نہ کیا آہ تو نے پر نہ کیا
کوئی رات خون دل سے عشق دامن و استین کو تر نہ کیا

❦

عشق یادش بخیر اے یارو آگے آتا تھا اب نہیں آتا

—*—

جستجوین مری نہ حیران ہو مثل عتقائین گھر نہیں رکھتا
کون ہون میں کہاں ہوں کیسا ہوں اتنی بھی میں خبر نہیں رکھتا

—(۰)—

جو کیا سو خیال خام پڑا آہ دل تجھ کو کس سے کام پڑا

—*—

بیمار تیری چشم کا اچھا ابھی تو تھا کچھ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بد گئی
دیکھا نہ آفتاب کیسی تیرے رو پرو جب ہو گیا وہ سامنے سایہ سا دل گئی

—*—

دل کو ناحق بھی جو دکھائے گا اس کا بدلہ خدا سے پائے گا

—(۰)—

جاتا ہے فلک کے پار نالہ یہ تیر بھی کار گر نہ ہو گا
فریاد سنی نہ عشق کی رات شاید کہ وہ اپنی گھر نہ ہو گا

—*—

دل کے ہاتھوں خراب پھر تا ہوں اس میں کچھ اختیار ہے میرا
جس سے ہوتی ہو آئینے کو جلا اے صبا وہ غبار ہے میرا

اس نے رورو کے اس کو رام کیا واہ آنکھوں نے ایک کام کیا

بلا سے شاد یا ناشاد رکھنا بہر صورت ہمیں تو شاد رکھنا
بسا ہر دل میں آ وہ خانہ ویران خدا وندا اُسے آباد رکھنا

شام سی صبح، صبح سے تا شام راہ پر بیٹھ انتظار کیا
جب نہ آیا وہ رشکِ ہروماہ اور دل نے بھی بیترا کیا

اپنی آنکھوں سے پوچھ اے خوش حتم مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھ

خسر بہا کرین گے دیوانے ان کی زنجیر مت ہلائیگا

دیا جو آخری دیدار تو نے جزاک اللہ فی الدارین خیرا

تم عیبث ابے ہونڈھتے ہو آشیانِ عنذلیب
مست پر گلشن میں باقی ہے نشانِ عنذلیب

مکن نہیں جی بچے سحر تک باقی ہے ابھی تو دو پہر رہتا

دیکھ اس گلہزار کی صورت آئینہ ہے بہار کی صورت

جاتے ہوئے دم کو کوئی روکے رہے تکب آنا ہے تو آجا کہ نفس باقی ہے اب تک

اسی حسرت میں نکلیں گایہ دم تک نہ پہنچا سرمہ را تیرے قدم تک

لکھوں کس طرح جو گزرے ہر دلیق وہ مضمون ابھی سکتا ہے قلم تک

دن کو دیکھی تھی اس پری کی جھلک نہ لگی رات کو پلک سے پلک

مٹے ہیں نیک و بد سو پرالودگی نہیں مانند نور اٹھتے ہیں ہر شے سے پاک ہم

زلف نے جس تین دکھائی شام پھر اسے دوسری نہ آئی شام

جان کو بے قرار پاتے ہیں دل کو بے اختیار پاتے ہیں
چشم وحدت سو دیکھتے ہیں جو ایک ہی کو ہزار پاتے ہیں

تجھے کیا کہیں کیا صنم جانتے ہیں خدا جانتا ہے جو ہم جانتے ہیں

شکوہ نہ کچھ رقیب سے مجھ کو نہ یار سے میں اپنے دل کے ہاتھ سے آفت سیہ ہوں
از بسکہ اشتیاق ہو دیدار کا مجھے ماتمدا آئینہ کے سر پا میں دیدہ ہوں

نام پر تیرے جی کو کھوتے ہیں ایسے عاشق بھی اور ہوتے ہیں
ابتدا ہی سے یوں چلی آئی ایک ہنستے ہیں ایک روتے ہیں

دل کا آئینہ سامنے رکھ کر یا رکھو بے حجاب کرتا ہوں
ایک ہی وہ نظر میں آتا ہے سو طرح سے حساب کرتا ہوں

دل سے نخل گئے تھے درخشاں شگ پھر آگے جس سے پوچھا کہا کچھ خبر نہیں
تم دیکھتے بحث ہو مے حبیب آستین وہ کوئی زمین ہی جو آنسو سے تر نہیں

یہ حسن یہ ادا یہ نگاہیں، یہ گرمیاں
نام خدا کہاں ہیں کسی طرح وار ہیں

— ❖ —

نایاب آنسوؤں کے ہیں تیری جہان میں
وہ دہنیں ہیں یہ جو ملین ہر دکان میں

— ❖ —

نذر کو اور کچھ نہ تھا مجھ پاس
دل بے اختیار لایا ہوں

— (۰) —

ایک دو باتیں جو ہوں کوئی سنے
دل کی خواہش دم بدم کس سے کہیں

— ❖ —

دہم دم جھکویا د کرتے ہیں
دلِ غمگین کو شاد کرتے ہیں

— (۰) —

ناشا دجو گئے ہیں انھیں شاد کیجیو
یعنی کہ بعد مرگ ہمیں یا د کیجیو

— ❖ —

وہ سوا رہے سمند ہوتا ہے
پھر یہ فتنہ بلند ہوتا ہے
عشق کا شعر اس کو خوش آئے
جو کوئی درد مند ہوتا ہے

— ❖ —

کس کی بستی ہے کون بستا ہو
کر بلا جس کے گھر کا رستا ہو

— ❖ —

لختِ دل سوے دیدہ آتا ہے ٹوکوست! نور دیدہ آتا ہے
دل دھڑکتا ہے آج کچھ بڑے کوئی خنجر کشیدہ آتا ہے

(۱)

اور ون کا جگر یا رجوتیرون سیئے ہو یہ عاشقِ جان باختہ کس دن کیلئے ہو

x

بولے تو زبانِ جل جائے چپکے رہئے تو جانِ جل جائے

(۲)

تصورِ سوترے دل شاد رکھے خدا اس گھر کے تئیں آباد رکھے

کلیات کا زیرِ نظر | معلوم ہوتا ہے کہ کلیات کا یہ زیرِ نظر نسخہ بار بار کا اصلاح پایا ہوا
نسخہ ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت عشق کے کلام کا جو انتخاب میر حسن

گلشنِ ہند میں ہے، اُن میں اور کلیات کے نسخہ میں تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے،
مثلاً پہلا ہی شعر میر حسن کے تذکرہ میں اس طرح ہے، ۵

آہِ چانسوز کو سہمِ شہدِ دیوان کیا عشق نے دیکھی ہو پہلے ہی طوفان کیا

کلیات میں یہ شعر یوں ہے، ۵

آہِ چانسوز کو سرِ دفترِ دیوان کیا عشق نے دیکھی ہو پہلے ہی طوفان کیا

کہیں کلیات کا نسخہ یا اس کی یہ نقل غلط معلوم ہوتی ہے، اس انتخاب میں (صفحہ ۱۲)

ایک شعر ہے، ۵

تاجان نہو عدول حُکمی تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

گلشنِ ہند میں یہ شعر اس طرح ہے،

تاجان نہوئی عدول حُکمی تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

یہی صحیح ہے، جان جانے کا صیغہ امر نہیں ہے، بلکہ جان فارسی لفظ بمعنی روح

اور زندگی ہے، یعنی جان تک کے معاملہ میں تیرے حکم سے سر تابی نہ کی، یا یہ کہ جب تک

جان میں جان رہی عدول حکمی نہ ہوئی، تو نے مرنے کا حکم دیا تو ہم مر گئے،

کتب خانۃ الاصلاح، دہلی، پٹنہ،

۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء

شیعہ طور

تعارف

”نوار و شاعر“

اللہ اکبر! بارہ چودہ برس گزرتے بھی کچھ دیر لگتی ہے، بڑی لڑائی کی ہونا کیا ختم ہو چکی تھیں مگر اس کے آثار اس وقت تک نمایاں تھے، ایک صاحب عینکون کے ایجنٹ کی حیثیت سے اکثر سیاسی قیدیوں اور نظربندوں سے ملنے جایا کرتے تھے، اور ان میں سے ایک کی خبریں دوسروں کو پہنچایا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں وہ ایک طرف ایک قیدی کے پاس رانچی اور دوسری طرف ایک آزاد کے پاس اعظم گڑھ آیا کرتے تھے، اور ایک کو دوسرے کی نسبت معلومات دیا کرتے تھے، اور اس حیثیت سے غالباً کسی سیاسی حنِ ظن کی بنا پر وہ اکثر آمد و رفت کی نوازش فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ جب وہ آئے تو اپنے ساتھ ایک نیا تحفہ لائے یعنی ایک شاعر!

اعظم گڑھ ہے تو ایک چھوٹا سا شہر اور دو راقادہ بھی مگر لوگ کبھی کبھی افتان و خیزان یہاں پہنچ جاتے ہیں، اور کچھ قدردان بھی ان کو یہاں مل جاتے ہیں،

خصوصاً مولانا ہسیل اور مرزا احسان احمد جیسے قدر شناس جو ہری بھی پورب کے اس جڑ
 دیا رہیں آباد ہیں، اور ساکنانِ شبلی منزل کا کیا کہنا کہ وہ تو یہاں کے اندھون میں
 راجہ بنے بیٹھے ہیں،

یہ نیا تحفہ ایک نوجوان شاعر تھا، ہمہ صفت شاعر، پریشان مو، پریشان حال،
 پریشان دل، ہمارے قدیمی عنایت فرمانے اپنے دوست کا تعارف کراتے
 ہوئے فرمایا کہ یہ شاعر بھی ہیں، اس وقت حاضرین میں مولانا مسعود علی ندوی، مولانا
 عبدالسلام ندوی، اور دوسرے کمرے میں جہاں آواز جاسکتی تھی، پروفیسر
 عبدالباری صاحب ندوی تھے، اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فنی
 کا مدعی اور موجودہ شعراء کے ہر عیب و ہنر سے واقف، ان عنایت فرمانے کے اس
 تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر سے کچھ سنا جائے اور ان کے اس
 دعوے سخنوری کا امتحان لیا جائے سب کی نظر میں ایک خاص نچا و تبسم کے ساتھ
 شاعر کے چہرے کی طرف اٹھیں، مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہو کر ایک
 عجیب درد انگیز ترنم، مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا،
 ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا، ذہن کی رگوں کو ظرافت سے
 متانت کی طرف پھینا پڑا، تبسم کی نگاہ میں تحیر پیدا ہوا، سامعین کے لبوں میں
 لرزش پیدا ہوئی، لرزش آواز میں، اور آواز احسنیت و مرجا کی صدائے تحسین
 میں بدل گئی، اب تو شاعر کی نسبت جلدی جلدی اپنی رائیں بدلنی پڑیں اور

انہما رفتہ رفتہ مگر تیزی کے ساتھ اعتراف کی صورت میں بدلنے لگا، اور تھوڑی دیر میں شبلی منزل کے چھوٹے سے ہال میں شاعر کے متوج آفرین ترنم کے سوا ہر آواز ساکت اور ہرجنبش ساکن تھی،

اختتام محفل پر یہ صاحب اٹھ کر گئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی حیرت کا اظہار کیا، جو لوگ ہمارے پروفیسر عبدالباری (عثمانیہ یونیورسٹی) کو جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر مشکل پسند اور کس دشواری سے کسی پر ایمان لانے والے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ صاحب اس نے کمال کیا ہے! اب شہر میں اس شاعر کی شہرت ہوئی کسی کو اس صاحب کمال کے کمال پر یقین آگیا تھا، اور کوئی اب تک منکر تھا اس پر تو بہر حال سب کو یقین تھا کہ یہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ یقیناً انول موتی ہیں، مگر ان گوہر ہارے شاہوار کا مالک بھی یہی فقیر و فق مرقع ہے، اس میں بہتوں کو شک تھا آخر اس کے امتحان کا وقت آگیا ایک مشاعرہ کا میدان ترتیب پایا، بڑے بڑے پہلوانان سخن جو بارہا علی گڑھ کے معرکے جیتے ہوئے تھے، پنجہ کشی اور زور آزمائی کیلئے قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھے اور زور سخن کے نئے نئے کرتب دکھائے آخر میں وہ لاغر اندام نووارد پہلوانی کے ہرگز سے ناواقف، نمائش اور داد طلبی کی ہر اداسے بے نیاز، دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نہیں، بلکہ خود سراپا اثر بن کر جب سامنے آیا تو مصر سخن کے سب جادو گر بیک دفعہ چلا اٹھے کہ اَمْسَا بِرَبِّ هَازُونَ وَمُوسَىٰ يَكْلِمُ مَنْ كُنْ تَحَا؟ جگر مراد آبادی، پھر کیا تھا، حرفیون

نے دوست سے بڑھ کر دوست اس کو بنایا، مشاعرے پر مشاعرے ہونے لگے
شاعر ایک تھا مگر اس کے اثر نے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش ہو جانے
پر مجبور کر دیا، آخر عظیم گدہ اور شبلی منزل کی یہی تحسین آفرین تھی جو داغ جگر کی دلپذیر
سٹل مین ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا،

جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، ان کا طرز انہماک زمانہ کے
طرز سے الگ، لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزون الفاظ اور دلکش
ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آواز سے پاک،
طلم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا، موجودہ شعرا میں
اس کے اس وصف میں اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانی ہے، سادگی اور بے تکلفی
حسرت کی بھی خصوصیت ہے، مگر اس کی سادگی یکشش ہو، بناؤ نہیں، جگر کا
کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود، اس میں
بچہ فطری آرائش اور از خود نمائشِ حق ہے،

معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے، تنہا کھڑا ہے، سرستی اور سرشاری، تاثر اور
دل فکاردی اس کے ہر مصرع کی جان ہے، اس کا یہ اثر اس لئے نہیں کہ واعظین
خوش مقال کی طرح وہ مجلس کو رولانے کے لئے شہدائے کربلا کے دامن میں
پناہ لے، یا جھگڑ کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں، جولاش و مدفن و
سورہ یسین و نوحہ بین و میت و نزع وغیرہ کا ایک تیر کندہ صفت پھینک کر بقصد

مرغِ اثر کو تسکا کرنا چاہتے ہیں اور آخر سان انیب حافظ کا طعنہ سنتے ہیں،

برو این دام بر مرغ و گر نہ

کہ عفا را بلند است آشیانہ

جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر وہ جب کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ وہ یکساں ہی ظاہر ہوگا، البتہ وہ لوگ جو اپنے دل کی نہیں، دوسروں کی کہتے ہیں، وہ ہر رنگ محفل اور ہر ذوقِ دل کی نماندگی کرتے ہیں، مگر وہ اس لحاظ سے شاعر نہیں بلکہ ایک پیشہ ور خطیب و اعظما ہیں،

فارسی غزل کا بہترین نمونہ حافظ کا کلام ہے مگر اس کو ہر صاحبِ نظر محسوس کرتا ہوگا کہ حافظ کے خیالات میں نیرنگی نہیں، طرزِ بیان میں نیرنگی ہے، وہی چند بندھے ہوئے خیال ہیں جو حافظ کی ہر غزل میں ظاہر ہوتے ہیں، مگر ہر غزل اپنے طریقِ اظہار، اور طرزِ تبیین الگ ہے، ایک ہی خیال سو سو طرح اس میں ادا ہوتا ہے، مگر ہر جگہ اس کی شانِ نرالی اور طرزی ہے، یہی حال خیام کی رباعیوں کا ہے، چند خیالات ہیں جو ہر دفعہ نیا قالب بدل کر اور نئی شکل میں جلوہ گر ہو کر سامنے آتے ہیں

بات یہ ہے کہ یہ وہ شاعر ہیں جو الفاظ و تراکیب کے حُسن کے باوجود صرف
 ان چیزوں کو کمال نہیں جانتے، بلکہ ان کے اندر چند حقیقتیں مرکوز رہتی ہیں، وہی
 رہ رہ کر ابھرتی، اور نالہ موزون کی صورت اختیار کرتی ہیں، جگر کی شاعری میں
 نہ زلف و شانہ ہے، نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوسِ بالاسے بام، نہ شکایتِ منظر عام، نہ آئینے
 کا شانہ خیال میں چٹھماے سہل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں
 میں قصاب کی چھری اور جلا کی تلوار ہے، نہ اس کے کوہِ چہ میں شہدا کے دل و
 جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی ناویدہ کا سراپا شتابِ نظر
 ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے،
 نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے، مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنائی این
 اسکو بھی بے حجاب دکھائی دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے
 جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشارِ است ہے، وہ محبت کا متوالا ہے اور
 عشقِ حقیقی کا جو یا، وہ مجازی کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور تجا نہ کی گلی سے
 کی شاہراہ کو اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزمِ ساقی کو ٹرنا چاہتا ہے
 جگر بے ظاہر سرشار، مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پُر خمار، مگر اس کا دل
 ہشیار ہے اور یہی عجب کہ خود جگر کو بھی اپنی دل کی خبر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو،
 دوستانِ عیبِ نظربازیِ حافظِ کینہد کہ من اور از مجاہدِ خدایِ بسیم

شبلی منزلِ عظم کہہ، دہریہ سنہ ۱۹۳۲ء

خمستان

کشمیر کے دستِ فیض نے نہ صرف خطہ کشمیر کو رشکِ گلزار بنایا ہے، بلکہ جہانِ جہان بہار و خزان کے انقلابات نے اس کی شاخوں اور ڈالیوں کو اڑا کر پہنچا دیا، ہر جگہ ایک نیا چین لگا دیا، اور نیا گلشن کھلا دیا، پنجاب کی ہمسایہ زمینِ قدرؔ اس کا زیادہ حق رکھتی تھی، اور اسی لئے وہیں کے سرسبز و شاداب قطعون نے سب سے زیادہ ان "خانہ براندازانِ چین" کو اپنے آغوشِ مین لے کر ان کی آبیاری کی اور پورے پنجاب کو اپنی نگہتِ بزیرون سے گلکدہ بنا دیا،

پنجاب میں سیالکوٹ کشمیر سے قریب تر ہے، اور یوں بھی علم و ادب اور فضل و کمال کا ہمیشہ سے گوارہ ہے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کو دود فخر شاہ جہان کی قدردانیوں نے چاندی میں تلوا یا اور ہند سے لے کر روم تک ان کی تصنیفات نے اپنا سکہ بٹھایا، وہ اسی خوش سواد شہر کی خاک سے اٹھے تھے، اور اس عصرِ جدید میں اقبالِ سافلسفی اور شاعرِ پیدا کرنے پر اس کو بجا طور سے فخر و ناز ہے، اور یہ مرغِ خوشخوآن بھی اسی ملکِ جنتِ نظیر کے باغون سے اڑ کر یہاں تک پہنچا ہے،

اس نختان کا ساتی بھی اسی میکدہ کا صہبائی ہے، ان کے والد ماجد مولوی احمد دین صاحب پال جماعت اہل حدیث میں ایک ممتاز اور فاضل بزرگ ہیں ان ہی کی مذہبی آغوش میں عبدالمسیح پال اثر صہبائی نے ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو آنکھیں کھولیں تعلیم کی ابتدائی منزلیں درجہ بدرجہ طے ہو کر ایم اے پر جا کر ختم ہوئیں اور فلسفہ کی سند یونیورسٹی سے حاصل کی،

صہبائی نے گواہدیت گھرانے میں ولادت پائی، تاہم شاعری کی دولت سے ان کو محرومی نہیں ہوئی، خدا جانے ان دو واقعوں نے کیونکر شہرت پائی ہے کہ شیعہ حافظ، اور اہلحدیث شاعر نہیں ہوتے، اتنا تو سچ ہے کہ اہلحدیث میں حکیم مومن کے سوا کوئی دوسرا مشہور اردو شاعر نہیں ہوا، حکیم مومن اعلانی غیر مقلد اور اہلحدیث میں ہیں، صاف کہتے ہیں، ۷

ارباب حدیث کا میں فرمانبردار ہوں	تقلید کے منکروں کا سرِ فقر ہوں
مقبولِ وایت ائمہ نہ تیکس	یعنی کہ فقط مطیعِ ستیمبر ہوں

خالص ہوں تھری، مرادین اسلام گورائے صواب ہو، نہیں مجھ کو کام
تقلید کی ٹھہری تو بنوں گاشیعہ کس واسطے چھوڑ دیجے فضل تراہم
کہتے ہیں ہمارے مخدوم مولانا شاعر اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر اہلحدیث نے
بھی اس شہرت کو ترقی دینے میں عملاً پوری کوشش کی ہے، لیکن میرا جواب یہ ہے کہ

چونکہ وہ متبع سنت ہیں اس لئے صحیح شعر کے نہ پڑھنے میں بھی سنتِ سنہ کی تقلید کرتے ہیں، ما علّمناہ الشعر وما ینبغی لہ،

بہر حال پدر اگر تواضعِ سپر تمام کند، نو جوان صہبائی نے بڑے بوڑھوں کی عزت رکھی ہے، اور اپنی شاعرانہ خدا دادِ طبیعت سے بے بنیاد شہرت کی بیخ کنی کی ہے، صہبائی کے فطری شاعر ہونے میں کلامِ نہیں، ان کا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالہ و شیون سے معمور ہے، چند سال ہوئے کہ ان کی رفیقہ حیات نے انکو دہائی الوداع کہا، اس حادثہ نے ان کو اور نازک دل شاعر بنا دیا ہے، جہاں ذرا ٹھیس لگی اور بلبلا اٹھے، اسی لئے ان کی شاعری میں سرور و شادمانی نہیں، بلکہ جزب و ملال ہے، اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھوں میں آنسو نہیں، بلکہ صبر و سکون اور تسلی و تعزیت کے غلین فلسفیانہ اشارات ہیں، اور ان کی غزلوں میں محبت کے اثرات اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق و محبت کے حکیمانہ رموز و اسرار فاش ہوتے ہیں،

صہبائی کا یہ مجموعہ کلام تجلیات، سمن زار، جامِ صہبائی، راحتِ کدہ اور ستارے پانچ عنوانوں پر تقسیم ہے، تجلیات میں غزلیں، سمن زار میں مختلف عنوانوں پر نظمیں، جامِ صہبائی میں رباعیات، راحتِ کدہ میں مرثیہ، سوز و گداز اور فناے عالم کے تاثرات ہیں، اور ستارے میں ایک ایک شعر کی مختلف فردیں ہیں،

شاعر کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اس کے دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور

بوڑھے سعدی کے بقول "ہر کس را فرزند خویش بچال و عقل خویش بکمال می نماید" ہر شاعر کو اپنے معنوی فرزندوں سے اس قدر الفت و محبت ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک کو بھی اپنے قلم سے مٹانے میں ایک فرزند کے قتل سے کم غم محسوس نہیں کرتا تاہم ایک دانشمند باپ کا فرض یہ ہے کہ اپنی اولاد کے حق و قبح سے کیا حقہ واقف ہو، چنانچہ دانشمند صہبائی نے اپنے کلام کے وافر ذخیرہ سے انتخاب میں اپنے جانتے پوری "بیدردی" سے کام لیا ہے اور ان ہی چیزوں کو اس میں جگہ دی ہے جو ان کے معیار تنقید پر پوری اتری ہیں،

معلوم ہوگا کہ غالب نے اس سے بھی زیادہ "بیدردی" کا ثبوت دیا ہے اور اپنے پورے ضخیم اردو دیوان سے صرف چند جہز پر قناعت کی ہے اور پھر سنا ہے کہ اس قتل عام کے لئے انھوں نے اپنے سنگدل دوستوں کو متعین کیا تھا، اور خود دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے رہے لیکن آخر ان ہی چند اوراق نے وہ مقبولیت پائی جو سات سات اٹھ اٹھ دیوانوں کے مالکوں کو بھی نصیب نہیں،

میری رائے ہے کہ ہمارے نوجوان شاعروں کو اپنے کلام و دواوین کی اشاعت میں اس وقت تک تاخیر کرنی چاہئے جب تک کلام کی صحت کا ہر طرح یقین نہ ہو جائے، شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پر جوش اور باکیف ہوتی ہے، پنجاب کے بہترین فارسی شاعر گرامی کا کلام ان کے مرنے کے بعد مرتب ہوا، پنجاب کے بہترین شاعر بلکہ استاد فن شاعر ظفر علی خان کا مجموعہ کلام ہنوز منتشر و

پراگندہ ہے، پنجاب بلکہ ہندوستان کے حکیم شاعر اقبال کا کلام ان کی کتنی عمر میں جا کر مرتب ہوا، شاعر عظیم آبادی کا پورا دیوان ان کے دوستوں اور شاگردوں کے پورے اصرار کے باوجود ان کے مرتے دم تک مرتب نہ ہو سکا، ہمارے کہنے مشق استاد شاعر ریاض کا حکمہ ابھی تک رندانِ سخن کی محفل میں نہیں پہنچ سکا، مقصود یہ ہے کہ کلام کافن کے معیار پر پورا اترنا اور بار بار کے حک و اصلاح کے بعد اس کا اعلا سے پاک ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارے نوجوان شاعر تھوڑا صبر و انتظار سکام لین کہ اصل کمال استیصالِ شہرت نہیں، بلکہ دوامِ شہرت ہے،

صہبائی کی عمر اس وقت ۳۲ برس کی ہے، بچپن سے شعر کہتے ہیں، اور اپنے وطن شاعر اقبال کے کلام کو ہمیشہ غور سے پڑھتے رہے ہیں، اور خیام و حافظ کا کلام بھی مطالعہ میں رہا ہے۔ اور میر و غالب کی زبان اور طرزِ بیان سے بھی متاثر ہوئے ہیں، میری رائے میں صہبائی میں استاد شاعر ہونے کے بجائے حکیم شاعر ہونے کی صلاحیت زیادہ موجود ہے، ان کے الفاظ میں شیرینی اور ترکیبون میں فارسی کی پوری چاشنی اور ساتھ ہی ان کے خیالات کے بازوؤں میں معانی بلند تک پرواز کی پوری قوت ہے، اور ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں سے ان کی رباعیاں اور قطعات زیادہ باکیف، زیادہ پر معنی اور زیادہ موثر ہیں،

ہندوستان کے نوجوان شاعروں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان کے

نزدیک شاعری صرف غزل گوئی کا نام ہے جس شاعر کو دیکھئے کسی فرضی معشوق کے وہی عشق میں مبتلا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کے دیگر اصناف گویا ہماری نئی شاعری سے فنا ہو رہے ہیں، پنجاب میں پورا استاد اور کامل لغن شاعر جس کی شاعرانہ پختگی، قدرتِ کلام اور بدیہ گوئی کی مثال اس وقت نہ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان میں نہیں مل سکتی، وہ ظفر علی خان ہیں، وہ ہر صنف پر یکساں قادر اور سخنوری کے ہر فن میں کامل ماہر ہیں، ان کے سوا پنجاب کے صرف ایک نوجوان شاعر کا نام ہم کو معلوم ہے جس نے غزل گوئی کے کوچہ سے الگ اپنی شاہراہ نکالی ہے، اور وہ حفیظ جالندھری ہیں، شنوئی کی بھر انھوں نے اپنے شاہ نامہ کے لئے اختیار کی ہے وہ گو قدما کی تقلید سے آزاد ہے مگر واقعات کے نظم کے لئے ان کو ایسی ہی لمبی بحر کی ضرورت تھی، اغلاط سے گو وہ خالی نہیں، تاہم میں ان کے جوشِ بیان اور شاعرانہ بین واقعہ نگاری کی قوت کا قائل ہوں، اور شنوئی گوئی کے لئے اسی ملکہ نامہ کی ضرورت ہے،

صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غزلین، قطعات، رباعیات، شنوئیان سب کچھ کی ہیں، اور صرف غزل گوئی کے تنگ کوچہ میں مقید نہیں، تاہم ہر شخص ہر صنفِ کلام پر یکساں قادر نہیں ہوتا اَللّٰہُ مَا شَاءَ اَللّٰہُ، جیسے فارسی میں سعدی اور اردو میں سودا، حالی، اور ظفر علی خان، میرے خیال میں صہبائی کی فطری شاعرانہ استعداد کا اصل جلوہ گاہ ان کی رباعیات ہیں، اور ان کو اسی حیثیت سے شاعرانہ

کی صف میں ممتاز جگہ دی جاسکتی ہے، رباعی گوئی کے لئے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو، ترکیبیں چست اور روان ہوں، اور پہلے مصرعہ سے تدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ میں پورا زور نمایاں ہو جائے، یہ تو لفظی خوبیاں ہیں، معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقائق اور معانی ادا ہوں، صہبائی کی رباعیات میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، مثلاً

ممتاز ہے شانِ ارجمندی میری	ہے روشِ عرش، ہر بلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یارب	نازاں ہی بہت نیاز مندی میری



اک نقطہ مہم جو مہم ہے ہستی میری	لیکن ہے عجیب چیز ہستی میری
چھوڑا جو خدا تو خود پرستی ہے اثر	جاتی ہو کہیں یہ بت پرستی میری



افسانہ درد ہو کہانی میری	عنوان ہو خونناہ فشانِ میری
ہوں تیشہ بکتِ مثالِ فرہادؔ	اک کوہِ گرانِ ہونِ زندگانی میری



بیگانہ ہوش ہوں کہ ہشیار ہوں	ہوں عالمِ خواب میں کہ بیدار ہوں
فطرت کی قسم ظریفیان تو دیکھو!	مجبور کو وہم ہو کہ مختار ہوں



انجام بہار سے کبھی ڈرتا ہوں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ مین کرتا ہوں

سانرے عیش سے کبھی بھرتا ہوں
تقدیر ہی یوں تو کار فرما ہی آثر
کیا خوب کہا ہے :-

اے ننگِ جہانِ روح کو برباد نہ کر
کھا زخم پہ زخم، اور فریاد نہ کر

رور و کے غمت شکوہ بیدار نہ کر
ہمت سے ہی رزمگاہِ ہستی میں وقار

— ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ —

پیری میں ہی آہِ سرد اور چشم پر آب
آغاز بھی خواب ہی، اور انجام بھی خواب

ہنگامہِ معصیت ہی ہنگامِ شباب
ہے خواب ہی خواب میں ساری گدگد

— ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ —

تیرا ہی دل زار ہے مامن تیرا
تیرا کوئی دوست ہے نہ دشمن تیرا

گل تیرا، نہ باغبان، نہ گلشن تیرا
اغیار سے کیوں ہو تجھ کو امید و ہراس
بہت ہی خوب ہے :-

ظاہر ہے کہ اک روز مرنا ہوگا
کیا ڈوب کے مجھ کو بھرا بھرا ہوگا

شیرازہ ہستی کو کبھر نہا ہوگا
لیکن یہ سوال ہی ابھی لائیکل

— ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ —

اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
آتا ہے قرارِ دل کو آتے آتے

مدت ہوئی زخمِ دل پہ کھاتے کھاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہی آثر

غزل میں بھی صہبائی کا مٹح نظر بلند ہے، تیر کے اوزان اور رنگِ تغزل میں
بھی کبھی کبھی کہتے ہیں، اور کہیں کہیں خوب کہہ جاتے ہیں:-

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرتِ خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا بھی اک درد بھرا افسانہ ہے
برگشتہ قیمت والوں کا نے کعبہ نے تجنا نہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں اُنکے یا موت ہی یا پیمانہ ہے
ہر شاخ جب اکستانہ ہے ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توہ! ایسے میں تو بہ! جب فطرت خود میخانہ ہے
کچھ فرق نہیں ہم متون کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے، میخانہ ہی کاشانہ ہے

اسی غزل کے بعض شعرا ایسے ہیں جو گو فیض ہیں، مگر ذرا سے الٹ پھیر سے فیض
ہو جاسکتے ہیں، مثلاً

گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، رحمت بن بن کر چھائی ہیں
آباد ہوئے ہیں مے خانے، سجدے میں ہر اکستانہ ہے

پہلا مصرعہ اس طرح ہوتا تو اور اچھا ہوتا: ع
گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں اور رحمت بکری چھائی ہیں

لے یہاں بھی "غائباً غلط چپ گیا ہے" بھی "کے بجائے شاید" ہی "ہوگا، "س"

اسی مین ایک اور شعر ہے،

کجے مین یا بتجانے مین، یہ بات کہان مینانہ کی!

جو کام ہے آزادانہ ہے، جو بات ہی بے باکانہ ہی

پہلے مصرعہ کو یون کہا ہوتا تو صاف ہوتا: ع

کجے اور بتجانے مین یہ بات کہان مینانہ کی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:-

یون داد وفا کی ہوتی ہے، یون مرنے والے مرنے

اک داغ سا شمع کشتہ ہی، خاکستر سا پروانہ ہے!

شعر خوب ہے مگر اک ذرا سا تغیر اس کو کتنا صاف بنا سکتا ہی:-

یون داد وفا کی ملتی ہی، یون مرنے والے مرنے

اک داغ سی شمع کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے!

مقطع ہے:-

برسات کی چاندنی راتوں مین دیکھے تو کوئی صہبائی کو

لب پر بھی مناجاتیں لاکھون، ہاتھوں مین بھی پیمانہ ہے

دوسرا مصرعہ ذرا سا تغیر طلب ہے: ع

لب پر مین مناجاتیں لاکھون اور ہاتھوں مین پیمانہ

مولانا حالی کا ایک بے نظیر شعر ہے: ع

اسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صوٹ نہ وہ دیوار کی صوٹ ہو نہ در کی صورت

صہبائی کی ایک غزل کا یہ شعر اسی کے قریب قریب ہے، فرق یہ ہے کہ
مولانا کے یہاں سادگی کا حن ہے اور صہبائی کے یہاں رنگینی کا بانگین ۵
تیرے جانے سے عجب رنگ ہوا ہے جان بہار!

اب گلستان بھی سیاہان نظر آتا ہے مجھے!

مگر اس کے بعد ہی ایک شعر ہے ۵

پھونک ڈالے گامرے دل کو مری ہستی کو

حن اک شعلہ لرزان نظر آتا ہے مجھے!

”لرزان“ کی جگہ اگر ”سوزان“ ہوتا تو کیا ہوتا،

تیسرا شعر ہے اور بہت ہی اچھا ہے، اور غالب کی ”زودیشیانی“ سے کم نہیں!۔

اب پشیمان ہوں میں تاثیرِ فغان سے یارب

حن مغرور پشیمان نظر آتا ہے مجھے!

پہلا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو اور فصیح ہو جاتا، ع

اب پشیمان ہوں تاثیرِ فغان سے یارب

صہبائی نے غالب کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی ہیں، اور اس مقابلہ میں بعض

بعض شعر خوب نکالے ہیں،

حن کیا جانے کہ وہ غلوٹ نشین محل میں ہے

زندگی کا راز عشقِ بادیہ پیا سے پوچھ

موج طوفان خیر میں ہوا اضطرابِ زندگی اور سکونِ مرگ ہم آغوشیِ ساحل میں ہے

ایک جان پر ہزار ہا آفت
نظرِ شوق تجھ کو ڈھونڈتی ہے
پھر بھی شکرِ خدا کرے کوئی
دیر و کتبہ کو کیا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ جن
لیکن نگاہِ شوق تو پیدا کرے کوئی
ہم نے صہبائی کے کلام کے جو چند نمونے پیش کئے ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ
صہبائی کی شاعری میں زلف و شانہ نہیں ان کے خیالات زیادہ تر فلسفیانہ ہیں، اسی
رباعیات ہوں یا غزل، مرثی ہوں یا مشاہد، ہر رنگ میں ان کا فلسفیانہ خیال جھلکتا
اور حرکت کا سانچہ چھلکتا ہے، مجھے امید ہے کہ اہل ملک ان کی قدر کریں گے، اور اپنی
حوصلہ افزائیوں سے ان کو مزید ترقی کا موقع دیں گے،

(۱۹۳۳ء)

مسدس حالی

مسدس کی مقبولیت | پچھلے پچاس ساٹھ برس میں ہماری زبان کی نظم و نثر میں جو کتنی
 لکھی گئیں ان میں قبول عام اور حیات دوام، اگر کسی کو نصیب ہوئی، تو وہ مولانا حالی
 کا مسدس ہے، یہ ۱۲۹۶ھ میں یعنی آج سے اٹھ برس پہلے لکھا گیا تھا، اس عرصہ میں
 اس کے جتنے ایڈیشن نکلے شاید ہی کسی دوسری کتاب کے نکلے ہوں گے، ان میں
 عام اور سستے بازاری نسخے بھی تھے، اور نامی پریس اور تاج کے پر تکلف ایڈیشن بھی
 قبول عام کا حال یہ کہ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور چالوں سے یکسر
 عالموں اور واعظوں تک کی زبانوں پر اس کے بند کے بند چڑھے ہوئے ہیں،
 مکتبوں میں یہ پڑھایا جاتا ہے، اسکولوں میں اس کے انتخاب داخل ہیں، میلاد کی
 مجلسوں میں یہ گایا جاتا ہے اور وعظ کی محفلوں میں اس سے گرمی پیدا کی جاتی ہے،
 خیر آج تو اس پر اتنا زمانہ گزر چکا ہے، اس لئے اس قبول عام پر تعجب نہیں آتا، لیکن
 اس کے چھپنے کے چند ہی برس بعد جب مصنف نے ۱۳۰۳ھ میں اس کا ضمیمہ لکھا،
 اس قبولیت و شہرت پر تعجب کیا ہے، اس چھ برس کے عرصہ میں اس کے سات

اڈوٹن نخل چکے تھے، اور اب تو ان کا شمار دہائیوں سے آگے نخل چکا ہو،

مسدس کی قبولیت | مسدس کی اس قبولیت پر تعجب اس لئے آتا ہے کہ شاعر کی طرز سے جیسا کہ خود اس نے کہا ہے، مذہبی حلقوں میں کافی بدگمانی بھی کے موانع

مسدس میں بے عمل اور جامد علماء کی دھیان بکھیری گئی تھیں، جھوٹے پیروں اور مشائخ کی برائیاں بتائی گئی تھیں، عیش پرست اور نکمے امیروں کا خاکہ اڑایا گیا تھا، جھوٹے خوشامدی شاعروں کی جھوکی گئی تھی، عام مسلمانوں کے مشرکوں جیسے خیالات کو برا کہہ کر ان کے دل دکھائے گئے تھے، غرض قوم کا وہ کونسا طبقہ تھا جس کے لئے حالی کے یہ دلدوز طعنے دلپند ہو سکتے تھے، چنانچہ اس مسدس کا نکلنا تھا کہ مذہبی شاعروں نے اس کا جواب لکھا، ادبی شاعروں نے اس کی زبان اور شاعری پر لے دے کی، کافر گروں نے اس کے بعض مضامین کی بنا پر فتوے مرتب کئے، عام مسلمانوں نے اس کے چھتے ہوئے فسترون پر شور مچایا، مگر بادِ مخالفت کے یہ جھوٹے سچائی کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانہ سکے، سچی بات دل میں اترتی چلی گئی، اس کی تاثیر رگ رگ میں پھیلی گئی، کل جو نفرین کرتے تھے وہ تحمین کرنے لگے، جو اسلام کے لئے اس کو کبھی زہر قاتل کہتے تھے، وہ آبِ حیات کہنے لگے، غور کے قابل یہ بات ہے کہ مسدس کی اس مقبولیت اور پسندیدگی کا راز کیا ہے،

اسبابِ منزل کی پردہ کشائی | سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کو دفعۃً اپنی حالت دگرگون نظر آنے لگی، جو کل بادشاہ تھے وہ آج

فیر ہو گئے، جو کل الوانِ نعمت کے مالک تھے، وہ نانِ نبینہ کے محتاج ہو گئے، جو کل
 اور الوانِ مین رہتے تھے، وہ جھوٹوں سے بھی محروم ہو گئے، کل جن کا سب کچھ
 تھا آج ان کا کچھ نہ رہا، یہ واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کے اسباب عام طور سے معلوم نہ
 قاعدہ ہے کہ جب کسی کے گھر میں کوئی موت ہو جاتی ہے تو تعزیت کے لئے
 جو آتے ہیں ان کا سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے، کہ یہ حادثہ کیسے ہوا، کیا بیماری
 ہوئی، کیا صورت پیش آئی، میت کے عزیزوں اور تیار داروں کو بھی تسکین
 مین ہوتی ہے، کہ مرنے والے کی بیماری، نزع اور موت کے ایک ایک واقعہ
 کو پوری تفصیل کے ساتھ سنائیں، یہ مسدس اس قوم کے جو ابھی ابھی مری تھی، اسی قسم
 کے واقعات کی تفصیل و تشریح تھی، اور تعزیت کرنے والوں کے اس سوال کا کہ
 یہ حادثہ کیسے پیش آیا، ایک مبسوط جواب تھا،

مرنے والا تو مر چکا ہوتا ہے، مگر لوگوں کو اس کی موت کے پورے اسباب
 کا علم جب تک نہیں ہو لیتا ان کا تعجب زائل نہیں ہوتا، اور جب یہ معلوم ہو جاتا
 ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ ایسے اسباب جمع تھے جن کے ساتھ موت
 کا طبعی طور سے واقع ہو جانا یقینی تھا، تو ان کا تعجب زائل ہو جاتا ہے، اور طبعی اسباب
 کے سامنے مجبوری کا احساس ان میں تسکین پیدا کر دیتا ہے،

مسدس مین شاعروں نے اس عظیم الشان قوم کے حادثہ موت کے اسباب اس
 تفصیل سے بیان کئے تھے جن کو سن کر ان بے خبروں کو جن کو دفعۃً ۵۵ء کے

حادثہ خونین کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حشرِ تنہا
انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر ان کی حیرت کو
دور کیا، اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں زندگی تجزیہ تھی
ماقم بغداد کی تباہی پر سعدی نے ماتم کیا، اور ابن ابی العسر نے خون کے آنسو کے
اور اندلس مرحوم کی بربادی پر ابن بدرون نے اپنا ولد و زوہ سنایا، لیکن افسوس کہ
ہندوستان کے انقلاب پر چوبیس برس گزرنے کے بعد بھی کسی کو آنسو کے قطرے
گرانے کی توفیق نہیں ملی، دل بھرے تھے، آنکھیں رونے کو اور ہاتھ سینہ کو بی کو
تیار تھے، سدس نے مرثیہ کا کام کیا، اور لوگ اس کو پڑھ پڑھ کر دل کھول کر رئے
ایک دروہری داستان تھی، جس کو جس نے سنا بیتاب ہو گیا،

قومی تاریخ | سدس میں قوم کی غیرت کی رگ کو حرکت میں لانے کے لئے اسلام اور
مسلمانوں کی قومی تاریخ کے پر خضر کا رناموں کو شاید سب سے پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب
سے اس ملک میں بیان کیا گیا تھا، رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں
کے خضر و غرور کا سامان بھی تھا، اس نشہ نے بھی لوگوں کو اس سدس کے پڑھنے
کا چسکا لگایا، عرب کی حالت، رحمتِ عالم کی بعثت، قرآن کی تاثیر، اسلام کا شکوہ
فتوحات کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، علماء اور حکما کا کمال، تعمیرِ بلاد، سیرت
اور بغداد و اندلس کے قابلِ فخر آثار، اس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اس میں نظم
کئے گئے تھے کہ مسلمانوں کو فیری میں بادشاہی کا مزہ آگیا، ان کے جھکے ہوئے سر

غور سے اونچے ہونے لگے، اور گزشتہ دورِ عظمت کی کمائی اس پتی اور تنزل میں انکو تسکین دیتی تھی کہ سرمایہ معلوم ہونے لگی،

”عرب، ہند، مصر، اندلس، شام و دیلم“ ہر جگہ کی کمائی مسدس کی زبانی مسلمانوں نے سنی، اور اس سینہ میں ان کو بغداد کا حریم خلافت، اندلس کا بیتِ حرام، غرناطہ کی شوکت، بلنسیہ کی عظمت، اشبیلیہ کے محراب و دروازے قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے ٹکھنڈے، سنجار اور کوفہ کے میدان اور سمرقند، مراغہ اور قاسیون کے رصد خانے سب نظر آنے لگے، پڑھنے والے پر عجب کیفیت طاری ہوتی، روتا اور کبھی ہنستا، اور ان دونوں کیفیتوں سے ہر گھڑی دل میں نئی لذت پاتا،

ترقی کی تدبیرِ غم اور فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب و غریب کتاب میں موجودہ حالت کا احساس پیدا کر کے آئندہ کی فکر کا سامان بھی تھا، مسلمانوں کے ہر طبقہ کے عیوب اور کمزوریوں کا راز فاش کر کے اس کے سامنے اپنی حالت کے سدھارنے کا خاکہ بھی کھینچا گیا تھا، احساس کے نشتر سے زخم کے فاسد مادوں کے نکالنے کے بعد ان کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی، اس لئے مسلمانوں میں اس کے ذریعہ جس کو تنزل کا احساس ہوا ترقی کی فکر بھی پیدا ہوئی،

قوم کا آئینہ | غرض مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی حالت و کیفیت کا آئینہ تھا جس میں اس کے چہرہ کا ایک ایک خط و حال نمایاں تھا، اس کی پیدائش، اس کا ننوا، اس کی جوانی، اس کا بڑھاپا، اس کی بیماری، اس کے عوارض، اس کی کمزوری ہر چیز اس میں

نظر آرہی تھی، اس لئے ہر مسلمان کو جس میں ذرا بھی حس تھی، اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا،

مسدس کی نظم | اس شاعری میں جو صرف تفریح طبع کا سامان رہ گئی تھی، اور جس میں گل و بلبل کی حکایت، جن و عشق کی روایت اور رقیب سید رو اور فلک پیر کی تمسکا کے سوا کچھ اور نہ تھا، شاعر نے اپنی میسا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی روح پھونک دی، لفظ سیدھے سادھے، ترکیبیں بے تکلف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و استعارہ سے پاک، مگر ہر شعر جوش بیان سے بھرپور، و فوراحساس سے معمور اور درد و غم سے بھرا ہوا۔

اس نظم کے لئے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس اس زمانہ میں واسوخت کے لئے، پھر اہلیت کرام کے دلدوز مصائب اور شہید کریم کے دلفکار سوانح کے بیان کے لئے یک گونہ مخصوص ہو کر غم و الم کی داستانِ سرائی کے لئے خاص ہو چکا تھا، اس لئے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گد ز ماتم کا خیال آیا تو اس مسدس سے زیادہ موزون اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی جبکہ وزن ہی گویا درد و غم اور نالہ و ماتم کے لئے بن چکا تھا،

دوسری بات یہ تھی کہ اس نظم کے پُر اثر ہونے کے لئے ضرورت تھی کہ اس کے ہر ٹکڑے میں قابل بیان واقعہ ادا ہو جائے، شہنوی اس کے لئے موزون نہ تھی کہ اول تو وہ رزم و بزم کی حکایت کے لئے خاص ہو چکی تھی، اور پھر اس میں اتنی

سمائی نہیں ہو سکتی تھی، کہ اس کے ایک ایک شعر میں تائید و سیر کا ایک ایک واقعہ ادا ہو جاتا، مستس کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک ایک بند گویا کتاب کا ایک ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک ایک پیرا گراف ہوتا ہے، جس میں ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا جاتا ہے، نظم کی رفتار پہلے مصرع میں تہید، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعون میں واقعہ کی تفصیل اور پانچویں اور چھٹے میں نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے چیز شروع ہوئی، کہاں تک اوپر چڑھی، اور پھر کہاں سے نیچے اتری، ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیل ذائقہ اور تجدید احساس کے لئے مستعد اور تیار رہتا ہے،

اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مستس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف و شفاف نہر کسی ہموار ترائی میں آبِ شنگی سے بہتی چلی جا رہی ہے، نہ کہین رکاوٹ ہے، نہ لفظ میں گرانی ہے نہ قافیہ کی تنگی ہے، زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے، ہماری زبان میں یہ ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے،

شاعر کی طبیعت | شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی، وہ ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا، اس کا مزاج سدا کا ادا تھا، وہ عالم کی نیرنگی، زمانہ کی ناسازگاری اور پھر اپنی قوم کی سستی کو منظر دیکھ دیکھ کر خود بھی اکثر روتا تھا اور دوسروں کو بھی رلاتا تھا، وہ جب روتا تھا، اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا کہ دیکھنے والے دیکھنے کی اور سننے والے

سننے کی تاب نہیں لاسکتے تھے، مصنف کے سارے مرثیے خواہ وہ شخصی حیثیت سے لکھے گئے ہوں، یا قومی، اسی قدر پُر اثر اور کیفیتِ غم سے بھرپور ہیں، اس انداز کا شاعر جب ملتِ مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ و جلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ اور اس کے لب کی ہر صدا فریاد کی ایک لہر کیونکر نہ بن جائے گی،

شاعر کو اپنی اس طبیعت کا کافی احساس تھا، دیا بچہ اور ضمیمہ دونوں میں بار بار اس کا یہ اقرار چھلکا پڑتا ہے، اس لئے مسدس کا پہلی حصہ جو ۱۲۹۶ء میں لکھا گیا تھا، ایسے اشعار پر ختم ہوا تھا، جو سرتاپا یاس اور ناامیدی سے بھرے تھے،

ضمیمہ | شاعر کو خود بھی خیال ہوا، اور دوسرے اصحابِ نظر کے کہنے سے بھی معلوم ہوا کہ کسی ایسی کتاب کا جو قوم کو غیرت دلانے اور اس کے احساسِ عمل کو جگانے کے لئے لکھی گئی ہو، ایسے دل شکن اور حوصلہ فرسا اشعار پر ختم کرنا ہمیشہ کے لیے اسکی امیدوں کو منقطع اور اس کے حوصلوں کو پست کر دینا ہے، چنانچہ چھ برس کے بعد ۱۳۰۳ء میں شاعر نے اس کا ضمیمہ لکھا اور چاہا کہ اپنی اوداس طبیعت کو ابھار کر نوحہ کے بجائے کچھ رجزِ خوانی کا فرض انجام دے، مگر اندازِ طبیعت اور دلی یقین کے غلبہ کوئی بات بنانا مشکل ہے، اس لئے اس ضمیمہ کی صورت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی غمِ غنوں کا مارا ماتم گسار اپنے دوسرے غمزدہ عزیزوں کو تسکین دینے بیٹھے، وہ بار بار اپنے آنسوؤں کو پیتا ہے، اپنے چہرہ کو مطمئن بناتا ہے، اور دوسروں کے بہتے ہوئے

آنسوؤں کو اپنے بھیگے رومال سے پوچھتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے، اور پھر منہ پھیر کر ان عزیزوں کی آنکھوں کو بچا کر اسی رومال سے آنسوؤں کے قطروں کو بھی پونچھ لیتا ہے اس ضمیمہ کی روانی اور فصاحت کا بھی وہی عالم ہے، مگر ہر بند پر صاف نظر آتا ہے کہ مصنف وقت کی مصلحت اور طبیعت کے اقتضا کی کشمکش میں مبتلا ہے، اور اسی کشمکش میں اس سے جہان تک بن پڑتا ہے، وہ اپنی قوم کے دل ابھارتے، بہت بڑھانے اور ترقی کے گرتانے میں نئے نئے اسلوب پیدا کرتا ہے، اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے،

مسئس کی حیات جاوید | مسلمانوں کو سوتے سے جگانے اور ان کے ہر طبقہ کو ان کے عیب اور کمزوریوں کے سمجھانے میں ہمارے ہر رہنما نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق بہت کچھ کام کیا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مولانا حالی کی اس بروقت صدائے اس میں بڑا کام کیا ہے، ان کے نہ صرف اس مسدس کے ہر بند، بلکہ نظم کے ہر مصرع میں آج بھی وہ اثر ہے کہ سن کر دل بیتاب اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تقلید کا جوش پیدا ہو جاتا ہے،

مسدس میں جاہلیت کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ ایسا سچا ہے، کہ جب سے قلم نے اس کو کھینچا اس وقت سے آج تک وہ اس عہد کے ہر نقشہ کھینچنے والے کے لئے نمونہ کا کام دیتا ہے، پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت میں ہمارے خوش خیال شاعر و شاعرانہ نے کیا کیا کچھ نہیں کہا، اور کس کس طرح مدح و توصیف نہیں کی، مگر مسدس میں نعت کے

جو چند بند ہیں وہ اپنی واقعت اور سچائی کی بنا پر جس اثر سے مالا مال ہیں، وہ تکلف اور مبالغہ سے بھری ہوئی اکثر نعتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے، شاعروں نے اپنی نعتوں میں شاعری کے جادو سے اثر پیدا کرنا چاہا ہے، اور مولانا حالی نے سچائی اور واقعت کے اعجاز سے، اس لئے ان کی نعت کے یہ چند شعر دوسروں کے سارے دفتر سے بہتر ہیں اور بعد کو نئے شاعروں نے اسی طرز کی تقلید کی اور کامیاب رہے،

مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ اور ترقیوں کا یہ پہلا نقشہ تھا، جس کو مولانا حالی نے اپنے موقلم سے تیار کیا تھا، بڑے بڑے تاریخی واقعات اور قابلِ فخر کارناموں کو جس طرح چند مصرعوں میں کھپا کر انھوں نے بیان کر دیا، وہ آج بھی بے نظیر ہے، نظم کے ساتھ مقدمہ اور دیباچہ کی نثر بھی اپنی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے ہماری زبان کے ادب کا اتنا بلند نمونہ ہے، جتنی پیروی آج تک نہ ہو سکی،

اس مسدس کی تالیف پر نصف صدی سے زیادہ گزر چکی، مگر اس کے اثر کی تازگی کا اب بھی وہی عالم ہے، امید ہے کہ صدیوں یہ صدیاں گزرتی چلی جائیں گی لیکن ان اوراق پر سچائی اور اخلاصِ ملت کی تاثیر سے کنگی نہ آئے گی یہ خود حیات جاوید پائے گی، اور اپنے مصنف کو حیات جاوید بخشے گی، اور جیسے اس دنیائے فانی میں وہ اس کی شہرت کا سبب بنی، اس دنیا سے باقی میں اس کی مغفرت کا سامان بنی ہوگی،

خیابان

ہماری موجودہ اردو شاعری کا قافلہ ایک خاص سمت کو سفر کر رہا ہے، اس سفر کا گوشہ تا متر غزلگوئی ہے، ہمارے نوجوانوں کی شاعری کی زبان جب کھلتی ہے، تو عشق و محبت کے نامیہ پیام، اور حن و جمال کی نادیہ تصویر کشی کے سوا ان کے کلام میں کچھ نہیں ہوتا، تصوف اور فلسفہ کے دھندلے خیالات جہاں تک ان کی رسائی نہیں ان کے شعر کو گنجشک بنا اور ان کے بیان کو الجھا دیتے ہیں،

عشق و محبت کے واردات اور حن و جمال کی ادائیں حقیقت میں واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہوتی ہیں، ان واقعات میں پڑے اور ان مشاہدات کا مزہ چکھے بغیر ان کی ترجمانی بن دیکھے مقام کا حال بتانا ہے، شاعری کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ لفظوں میں شاعر کے جذبات اور تاثرات کی تصویر ہے، اور جذبات و تاثرات صرف ذاتی واردات ہو سکتے ہیں، وہ نقائی اور اخذ و سرقہ سے ادائیں ہو سکتے، یہ ہمارے موتیوں ہی سے تیار ہوتا ہے، جھوٹے موتی اس کے لئے بیکار ہیں، غزلگوئی کوئی بری چیز نہیں، لیکن اس کے لئے زخمی دل درکار ہے، اس کے

لکھنے کے لئے سیاہی بازار کی بوتلون میں نہیں ملتی، چونچکان سینوں میں پانی باقی ہے جو
دل سوختہ میر کی کامیابی کا راز نصیحت کے اس فقرہ میں ہے جو پورے باپ نے
اپنے نوجوان شاعر بیٹے کو کی تھی، ”اے پسر عشق بورز“

تقریبہ کار سعدی نے یہ بے سبب نہیں کہا تھا کہ ”تا نہ افتد نہ دانی“، داغ کے کلام
میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس میں عشق کی ایک ایک گھات، اور جن کی ایک
ایک ادا اس طرح بیان ہوئی ہے کہ جس پر بیٹی ہے اس کو ہر قدم پر اپنی بات یاد
آتی ہے، اور مزے لیتا ہے، اور جس پر نہیں بیٹی ہے اس کو اس میں وہ لطف ملتا
ہے جو تالیخ و جغرافیہ کے شائق کو کسی غیر کے سفر نامہ میں،

غرض کلام کی یہ صنف حقیقت کی طالب ہی، غیر کی کہانی اپنی زبانی ایسی
بے مزہ حکایت ہے جس میں اثر پیدا ہی نہیں ہو سکتا،

غزل کی دوسری صنف وہ ہے جو رومی و خسرو و حافظ کا سرمایہ ہے، یا جو ارد
میں منظر درد اور نیاز اور ایک معنی میں نالہ کے خزانہ میں ہے، وہ حقیقت رسی،
نکتہ دانی، اور علم اسرار کے فیوض و برکات کا عطیہ ہے، لیکن یہ سعادت زورِ بار
کی ممنون نہیں، بلکہ خداے بخشندہ کی بخشش ہے، جو ہر شخص کی قسمت میں نہیں،
یہ عجیب بد نصیبی ہے کہ ہماری شاعری کی پیدائش اس وقت ہوئی جب

قوم پر مدنی چھائی تھی، اس کی ساری قوتیں ٹھنڈی تھیں، اور یاس اور ناامیدی
اس کو ہر طرف سے گھیرے تھی، ایسی قوم کے دل و دماغ میں قوی کا اشتعال،

واقعیت کی قوت، مقصد کی بلندی اور عزم و ہمت کا جو ہر بھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا، مین سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا، اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفرین عہد پیدا نہ کرتی، تو رستم و سہراب اور کی کاوس و فراس کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑ سکتی تھی، اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نسیب تلواروں کی یہ جھنکار اور داد و شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتے تھے، سامانی، غزنوی، غوری، سلجوقی، خوارزم شاہی اور تیموری شعراء کے کلام میں یہ زوران کے زمانہ کے بادشاہوں کے فتوحات کا بخشا ہوا تھا، کشور کشا سلطان دنیا کو زیر و زبر کر کے قوم کے افراد میں زندگی پیدا کرتے تھے، اور اس کشاکش اور تصادم کی چمق سے وہ آگ پیدا ہوتی تھی، جو ہر طرف گرمی اور طاقت پیدا کرتی تھی، بادشاہ کے فتوحات اور واقعی کارناموں کی حکایت شعراء کے کلام میں صداقت کا زور اور واقعیت بیان کا جوش پیدا کرتی تھی، یہ خیر محمد شاہ اور ظفر شاہ کے عہد میں جو اردو شاعری کا دورِ کمال ہے کب ہاتھ آسکتی تھی، ذوق چاہے جتنا زور بھی لگائیں مگر وہ بات کمان سے آسکتی تھی، جو عنقریب، معترضی، خاقانی اور عینی و کلیم میں تھی، غائب جو کسی حریف کو اپنے خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ اپنے ہاتھ سے ظفر شاہ جیسے شطرنج کے بادشاہ کی مدح و ثنائیں وہ زور کمان سے لاسکتے تھے، جو محمود کے مدح، ملک شاہ سلجوقی کے ثنا خوان، شروان شاہ کے قصیدہ گو، قزل ارسلان کے مدح طراز، اور دیگر اکبر و جہانگیر و شاہجہان کے درباری شاعروں میں تھا، اور یہ کمی غالب کو خود محسوس ہوتی

شاعری کے لئے جس عشق کی ضرورت ہے اس سے مقصود صرف لیلیٰ اور مجنون جیسا عشق نہیں ہے، یہاں عشق اپنے وسیع معنوں میں بولا جا رہا ہے اس سے قلب کی واقعی کیفیت مراد ہے جو عالم اور ماورائے عالم کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا کر سکتی ہے، مناظرِ طرقت سے عشق ہو سکتا ہے، قوم اور ملک سے عشق ہو سکتا ہے کسی بلند مقصد اور اہم مصلح نظر سے عشق ہو سکتا ہے کسی مقدس ذات اور مقدس کام سے عشق ہو سکتا ہے اور اس میں سے ہر عشق شاعری کے ساز کو چھیڑ کر اس کو ذہنِ موسیقار بنا دیتا ہے، اسی طرح اہلِ سخن اور اصحابِ قلم میں جوش و خروش اور قوت و زور پیدا کرنے کے لئے خاص مطلق العنان بادشاہوں کی ضرورت نہیں وہ تو شخصی حکومتوں کا زمانہ تھا، جب ہر قسم کی طاقتیں ایک ہی شاہانہ شخصیت میں سمٹ جاتی تھیں اور ملک کے سارے جہانی و دماغی کارخانے اسی ایک انجن کی طاقت سے چلتے تھے زمانہ کے نئے انقلاب نے اب یہ طاقت جمہور کے اندر پیدا کر دی ہے، اب قوم کی سرگرمی اور ملک کی جدوجہد جمہور کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اس لئے جو کام پہلے شاہانہ کارناموں کے زور سے انجام پاتا تھا، وہ جمہور کے زور سے انجام پاتا ہے، اب سلاطین کے فتوحات کی طاقت نہیں، بلکہ قوم کی فاتحانہ اور اولوالعزمہ طاقت اہلِ سخن اور اصحابِ قلم کے سینوں میں جوش، زبانوں میں تیزی اور قلوب میں روانی پیدا کرتی ہے، اب زمانہ سلاطین کے درباری شعراء کا نہیں، بلکہ قومی اور ملی شاعروں کا ہے، جو بادشاہوں کے مدحیہ قصیدوں کی جگہ ملک و ملت کے جذبات کی ترجمانی کریں اور

اپنی رجز خوانی سے اس کے سپاہیوں کا دل بڑھائیں،

دلی کی سلطنت نخل جانے کے بعد ہمارے شاعر اور سخنور مدت تک رنج و اہم اور فوج و ماتم میں مصروف رہے، حالی نے اس دور کا آغاز کیا جب تک جیتے رہے خود روئے اور دوسروں کو رلاتے رہے، اکبر کے دور میں ذرا لبون پر مسکراہٹ آئی اور فوج و ماتم کی جگہ وطن و وطنز نے لی، شبلی نے رجز خوانی شروع کی، یہ تینوں گوبڑے چھوئے معاصر تھے، مگر ان کی اردو شاعری کا زمانہ نسبتاً ایک دوسرے کے بعد ہے، اقبالؒ تو قوم کا قافلہ سفر کو آمادہ ہو چکا تھا، اس لئے وہ بانگ درا کے ساتھ آئے، اور خود ہی اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

بڑی لڑائی کے بعد سیاسیات کے انقلاب کا رخ جب سے بدلا ہے، ہماری نئی شاعری کا رنگ بھی بدل رہا ہے، اب فوج و ماتم، وطن و وطنز اور رجز خوانی کے بدلہ انقلاب انقلاب کا نعرہ ہے، اب کچھ اور ہی چیزیں ہمارے سامنے ہیں، اور قوم و ملت کے قافلے کسی اور ہی سمت کی طرف قدم بڑھانے کے لئے سفر کا سامان باندھ رہے ہیں اس انقلاب نے ہماری زبان میں بہت سے اچھے اچھے سخنور پیدا کئے ہیں،

زمانہ حال کے ان نئے خوش فکر شاعروں میں ایک اس مجموعہ کے مصنف محمود اسرارؒ بھی ہیں جن کی نظمیں اکثر اخباروں اور رسالوں کے صفحوں کی وجہ عزت بنتی رہتی ہیں، ان کے کلام پر ایک سرسری نظریہ راز فاش کر دیتی ہے کہ وہ شبلیؒ اقبالؒ اور ظفر علی خانؒ کے اسالیب سخن سے بہرہ ور اور متاثر ہیں، وہ ایک ایسے اسلامی

شاعر ہین جو وطن کی محبت سے بھی سرشار ہیں، وہ اسلام کی محبت اور وطن کی خدمت میں تضاد اور بیرحموس نہیں کرتے، وہ قومیت اور وطنیت کے تنگ مفہوم کو مٹا کر سمجھتے ہیں، وہ یورپ کے ملع تمدن کے فریب سے آگاہ اور اس کی انسانیت کی ذہد سے واقف ہیں، اور اس کی سیاست کے بد نما چہرہ پر جو رنگین نقاب پڑی ہے اس سے ان کا تارِ نظر الجھا نہیں ہے،

غرض وہ اسلام کے ہندی شاعر، یا ہندوستان کے مسلمان شاعر ہیں اور ہندی مسلمانوں کے سامنے ملک و ملت، اور دین و سیاست کے حقیقی انوار اور واقعی اسرار آشکارا کرتے ہیں، اور ہندی مسلمانوں کو اسلامی جذبات اور وطنی خدمات کیلئے یکساں دعوت دیتے ہیں،

ان کی اخلاقی اور تاریخی شاعری میں شبلی کا تخیل ہے، ان کی سیاسی اور وطنی شاعری میں ظفر علی خان کی پرکاری ہے، ان کی حقیقت شناسی اور اتحاد اسلامی کے سازین اقبال کا ترانہ ہے،

سیرت نبوی اور ہجرت مبارکہ کے بیان میں سوانح نگاری کے ساتھ ایک شاعر کے قلم کے ساتھ ایک مسلمان کا دل بھی ہم آہنگ ہے، ان کے وطنی جذبات کی تراوش میں کوزہ کی تنگی کچے بجائے دریا کی پوری پہنائی ہے،

ان سب کے ساتھ شاعر، انقلاب کے نئے آثار اور تہجون سے بھی بے خبر نہیں، وہ غریبون، مزدوروں اور کسانوں کی تکلیفوں سے بھی رنجیدہ اور سرمایہ داروں

کی بے رحمیوں سے بھی ملول ہے، وہ عہد حاضر کے ان نوجوان شاعروں میں نہیں جو اوپر کے بہتے ہوئے خیالات کے سہارے اس لئے چلنا چاہتے ہیں، کہ وہ خس و خاشاک کی طرح آسانی سے ظاہر نغائی کی منزل کو قطع کر سکیں، جو انقلاب، مزدور کسان اور سرمایہ کے فظون سے کھیل کر اپنے کو انقلابی اور دینی و قومی جذبات کی پستی سے اپنے کو بلند ظاہر کرتے ہیں، جو کبھی پریاگ میں اجیر اور کبھی اجیر میں پریاگ بناتے ہیں۔ محمود اسمراسی صاحب کی ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ انھوں نے غزلگوئی کے پامال کو چہرہ میں قدم نہیں رکھا، اور عشق و محبت کے جھوٹے موتیوں سے اپنے جیب و دامن کو نہیں بھرا، وہ زلفِ دراز کے گرفتار، چشمِ سیاہ کے مسحور اور حنِ عاشق کے گرویدہ نہیں، ان کے سینہ میں دکھاوے کے غمِ عشق اور نمائش کی آہ و نالہ کی جگہ نہیں، گو عاشقانہ تظنون کا اس مجموعہ میں بھی ایک عنوان ہے، مگر عشق و محبت کی اس داستان میں ”آپ بیتی“ نہیں ”جگ بیتی“ ہے، اور جو کچھ ہے وہ شاعر کا داخلی نہیں خارجی رنگ ہے،

”فکات“ کے عنوان سے بھی اس میں چند نظمیں ہیں، مگر یہ بھی شاعر کا اصلی مذاق نہیں، اس لئے یہ لطیفے بون پر مسکراہٹ لائے بغیر متانت کے انداز میں سنائے گئے ہیں۔ یہ فکات اکبر کے رنگ میں نہیں، بلکہ املاکِ کلکتہ کے حضرت ”کشاف“ یعنی مولانا شبلی کے رنگ میں ہیں، جنکو فکات کے بجائے طنزیات کہنا چاہئے، سیاسیات کے عنوان سے شاعر کی فکر سامنے جو کچھ کہا ہے، وہ ستائش کا مستحق

ہے، خیالات درست، دعوت صحیح اور طرزِ ادا دلکش ہے، سیاسیات میں گو وہ کانگریس کا ہم نوا ہے، مگر اپنے قومی جذبات اور ملی ضرورتوں سے بے پروا نہیں، ملک اور دین کی خدمت میں جو تضاد بعض کم سوادوں کو نظر آتا ہے، اس کی گہری نگاہ میں وہ منطقی مغالطہ کے سوا کچھ اور نہیں، غرض اس باب میں اس کے خیالات و تعلیمات بیدِ سنجیدہ ہیں، یعنی مذہب و سیاست اور دین و وطن کے جذبات کی معتدل آمیزش، مشرق سے صحیح عقیدت، اور مغرب کی صحیح تنقید، مظاہرِ فطرت کی تصویر میں اس کے موقف کی کششِ تعریف کے قابل ہے، تصور کا اچھوتا پن، تیشیوں کی رنگینی، استعاروں کی لطافت اور طرزِ ادا کی دلکشی اس کے شاعرانہ کمال پر دلیل ہے،

شاعر کا کلام نقالی کے عشق سے بھی پاک ہے، دین و مذہب، ملک و ملت اور مناظرِ فطرت سے اس کو سچا عشق ہے، اور اسی عشق کے مظاہر اس کی نظمیں نمایاں ہیں، وہ شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب نہیں، وہ شاعرِ حقیقت ہے، اس کلام میں نادانِ نور سیدہ نوجوانوں کے خام ولولوں اور ناتمام جذبولوں کی نمائش نہیں، بلکہ نچتہ کار، دانا یاں عقل کی حقیقت ہے، اس میں کم فہم شباب کا ہنگامی جوش نہیں، بلکہ سنِ رسیدگی اور خشکی کی سمجھی بو بھی اور غور و فکر سے طے کی ہوئی مستقل رائے ہے، غرض وہ سراب نہیں، شراب نہیں، نہرِ روان اور شہدِ مصفا ہے،

دل چاہتا تھا کہ اس خیابان کی ہر روش نفی عیوب کے خس و خاشاک، اور خیر
گیری کے گرد و غبار سے بھی ہر طرح پاک ہو، مگر آجکل کے اکثر شاعر عقلت سے فن کی
باتوں پر کان کم دھرتے ہیں، اس لئے اگلے بزرگوں کے فنی رسم و رواج کی پوری
پوری نگہداشت نہ کرنے پر اکیلے اسی مجموعہ کے مصنف کا گلہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ
تہا اسی کو اصول و قواعد کی تقلید کی کڑی بیڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں، اور نہ فیض سے
فیض تر لفظ و ترکیب کا مطالبہ، اور خوشنود و اند سے پاکی کا تقاضا کیا جاسکتا ہے،

۴۴ جولائی ۱۹۳۷ء
مطابق
ربیع الاخریٰ ۱۳۵۶ھ



عطرِ سخن

مولانا محمد فاروق چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی علیہ الرحمۃ کے استاد وکل تھے اور مجھے بھی اُن سے عربی ادب و شعر اور منطق میں تلمذ کا فخر حاصل ہے۔
 گرچہ خورِ دیم بنیتے است بزرگ
 ذرۂ آفتاب تابا نسیم
 جب میں نے شروع شروع عربی میں شعر کہنا شروع کیا، اور اصلاح کی غرض سے استاد کے سامنے پیش کیا، تو فرمایا "شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے، اس لئے خود شعر کہنے سے زیادہ دوسروں کے شعر سمجھنے کی مشق پیدا کرو۔ مولانا شبلی مرحوم بھی فرماتے تھے کہ "سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے" اور اس بارہ میں مولانا حالی مرحوم کے یہ مداح تھے، ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے تھے، کہ "جب پہلے پہل جاحظ بصری (المتوفی ۵۵۷ھ) کی کتاب البیان والبتین چھپ کر مصرعے آئی تو میں نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، کتاب کا کوئی خاص موضوع سمجھ میں نہیں آیا، اس میں عرب کے مشہور فضحا و بلیغا کے کلام کے کچھ یکجا تھے، اتفاق سے رات کو مولانا حالی (جو ان دنوں علی گڑھ کالج میں رہتے تھے)

آئے اور وہ کتاب لے گئی اور صبح کو یہ لکھ کر واپس کر لیا کہ یہ نثر کا حماسہ ہے، "مولنا کہتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ سنکر میں پھڑک گیا، اور عقدہ حل ہو گیا۔" غرض یہ تھی کہ جس طرح عربی نظم میں حماسہ شعراء کے بہترین کلام کا مجموعہ ہے، اسی طرح جا حظ نے گویا عربی زبان کے خطیبوں اور انشا پردازوں کے مختلف عمدہ ترین نثروں کا یہ مجموعہ فراہم کیا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے،

حماسہ کا جامع ابو تمام ہے، جو خود ایک بڑا صاحب دیوان شاعر اور بھرتی کا متقابل تھا لیکن فن کے تمام نقادوں کا فیصلہ ہے کہ ابو تمام کی لازوال شہرت ایک دیوان کے مصنف اور شاعر ہونے کی رہن منت نہیں، بلکہ حماسہ کے مولف اور جامع ہونے کی نعمتوں ہے، گیارہ سو برس کے قریب ہوئے کہ اسی حماسہ کی بدولت ابو تمام کا نام ادبائے عرب میں سرفہرست نظر آتا ہے، اور بقول مولانا شبلیؒ اس کی یہ کتاب عربی ادب کا صحیفہ ہے،

حماسہ کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جاہلی اور ابتدائی ہجری صدیوں کے اسلامی شاعروں کے اعلیٰ نادار اور بہترین کلاموں کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ آٹھ مختلف عنوانوں میں بٹا ہے، سیکڑوں شعراء کے رطب و یابس، ہلست و پست اور اعلیٰ و ادنیٰ کلام کو پڑھنا اور اس انبار میں سے خرف ریزوں کو چھانٹ کر موتیوں کا رول لینا، ایک بڑے صاحب نظر جوہری کا کام ہے، اس حماسہ کے بعد بہت سے حماسے اور عربی شعرا کے منتخب مجموعے تیار ہوئے، مگر ابو تمام کے حماسہ کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا،

اس نئے عہد سے پہلے جب ہندوستان کی ادبی زبان فارسی تھی، ہر لکھے پڑ
 آدمی کے پاس "سفینہ یابیاض" کے نام سے کاغذوں کے چند سادہ اور ارق ہوتے
 تھے جن میں ہر صاحب ذوق اپنی پسند سے دورانِ مطالعہ یا باہم صحبتوں میں جو اچھے
 اشعار پڑھتا یا سنتا تھا، ان کو وقتاً فوقتاً قلمبند کر لیتا تھا، اور اس طرح ہر قدر شناس کے
 پاس شعراء کے اچھے اور منتخب شعروں کا ایک الگ مجموعہ تیار ہو جاتا تھا، اس قسم
 کے سفینے یا بیاض ہر پرانے علی خاندان میں اب بھی موجود ملین گے، اور اکثر مشرقی
 کتب خانوں میں اس طرح کے متعدد نادرا اور منتخب مجموعے محفوظ ہیں، استاد
 مرحوم کی زبانی سنا تھا کہ ان کو مرزا صاحب کا ایک اس قسم کا انتخاب حیدر آبادوں
 میں ملا تھا، اور وہ اس کی تعریف کرتے تھے، لیکن اس قسم کے تمام فارسی انتخابات
 میں وہ مرزا مظہر جان جاناں کے انتخاب کو جو خریطہ خواہر کے نام سے مشہور ہے
 اور چھپ بھی گیا ہے، سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے،

اس نئے دور میں جس کے تمدن کی بنیاد جلدی اور غیلت پر ہے، عمر بھر کی
 محنت میں ایک سفینہ یا بیاض تیار کرنے کا صبر آزما کام کون کر سکتا ہے؟ تاہم چونکہ
 شعروں کا چسکا ایک فطری ذوق ہے، اس لئے کسی نہ کسی حیثیت سے چند سال
 میں ایک منتخب مجموعہ تیار کر لینا مشکل نہیں، چنانچہ اردو دواوین کے مختلف انتخابات
 ملک میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں، اس قسم کا پہلا جامع
 انتخاب مولانا ابوالفضل عباسی (گورکھپور) کا "نشر سخن" ہے جو ۱۹۱۱ء میں چھپا

جس میں ہر شاعر کے کلام کا الگ الگ انتخاب درج ہے، اس کے بعد (بدلون سے) نواب مسعود جنگ کا "انتخاب زرین" شائع ہوا، جو گو مختصر ہے مگر دل پسند و سب سے مطول اور مسلسل مجموعہ جناب الیاس برنی (حیدر آباد دکن) کے مجموعے ہیں جو مختلف عنوانوں کے تحت میں متعدد جلدوں میں جذباتِ فطرت و قدرت و ملت وغیرہ ناموں سے شائع ہوئے ہیں، اور انگریزی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں، اور آخر میں پنجاب سے "لمعات نور" نام ایک مجموعہ ایک جلد میں شائع ہوا ہے، جس میں مضامین اور عنوانات کی ترتیب کے ساتھ شعراء کے مختصر سوانح اور تصویریں اضافہ کی گئی ہیں،

صوبہ ہائے متحدہ پنجاب اور حیدر آباد دکن کے بعد اب صوبہ بہار کی باری ہے، جناب ڈپٹی مولوی سید یوسف حسین صاحب ساکن چھپرہ ضلع سارن نے بڑی محنت اور جانکاهی کے ساتھ نیم سخن، غنچہ سخن، گل سخن، عطر سخن اور روح سخن کے ناموں سے اردو شعراء کے منتخب کلاموں کے پانچ تدریجی مجموعے تیار کئے ہیں جنہیں چوتھا حصہ عطر سخن اس وقت ان اوراق کے کابل میں جلد ہوا اب تک اردو میں جتنے مجموعے تیار ہوئے ہیں وہ مشرب کے اختلا کے باوجود ایک خاص مقصد میں متحد ہیں، یعنی سب عام مطالعہ کرنے والوں اور تفریح طبع کی خاطر پڑھنے والوں کے لئے لکھے گئے ہیں، اس لئے ان کی ترتیب میں سہولت اور انشکال اور تعلیم کی تدریجی ترقی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا

بنا برین وہ مجموعے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے نصاب میں کام نہیں کر سکتے
 مولف ہذا کے پیش نظر یہی تعلیمی پہلو ہے کہ اردو شعراء کے کلاموں کو مختلف
 حصوں میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر حصہ کا معیار تعلیمی منزلوں کی
 مختلف استعداد اور قابلیت کے مطابق ہو، تاکہ وہ کالج کے اعلیٰ درجہ سے
 لے کر اسکول کے درجوں تک یہ ترتیب نصاب درس میں جگہ پاسکے،
 انتخابات کے خاستان میں اصلی رہنما جامع کا ذوق سلیم ہے، مگر لوگوں
 کے ذوق اور نقطہ ہائے نظر طبعاً خود مختلف ہیں، اس بنا پر کسی مجموعہ کو تمام
 اور ہر شخص کی نگاہ میں مقبہ ہونے کی سند بہ مشکل ہاتھ آسکتی ہے، تاہم اس معیار کو
 اس حد تک متوسط کیا جاسکتا ہے کہ انتخابات کا بڑا حصہ ارباب نظر اور اصحاب
 ذوق کی ہمدردی حاصل کر سکے، اس معیار پر یہ مجموعہ پوری طرح اتر سکتا ہے
 شعروں کے انتخاب سے پہلے شاعروں کا بھی انتخاب ضروری ہے، ہم کہہ
 سکتے ہیں کہ مولف نے اس میں سخت گیری کے بجائے رواداری کی
 ہے، لیکن ان کا جواب ہے کہ یہی بے تعصبی اور وسعت انتخاب اس کتاب
 کا ہنر ہے، بہر حال یہ بھی اختلافِ ذوق ہے، بقول ذوق ”یہی نیرنگی اس
 عالم کی رونق کا آب و رنگ ہے۔“

اس مجموعہ میں مولف نے ہر دور کے شعراء کے کلام کو اسکاں و وقت
 اور سہولت کی نظر سے دیکھ کر پھر شاعر کے تخلص کی ایجادی ترتیب پر اس کو

مرتب کیا ہے، ہر چند کہ یہ ترتیب لزوم مالا یلزم ہے، مگر ہر شاعر کے کلام کی جستجو اور تلاش میں اس سے آسانی پیدا ہو گئی ہے، ہم کو امید ہے کہ ہمارے صوبہ کا محکمہ تعلیمات اس سلسلہ انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گا، اور نئے طالب العلموں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع بخشیگا،

دینہ، پٹنہ (بہار)

۱۳۴۸ھ
۱۹۲۹ء



حقیقت علمی شاعری

عظیم آباد پنہ اور اس کے اطراف میں جو مردم خیز بستیاں آباد ہیں ان میں سے ایک کا نام نگر نمسہ ہے، یہ قدیم شرفاء شیوخ اور پروردگان علم و ہنر کا مسکن ہے۔ ان اطراف میں یوں تو عموماً شیوخ صدیقی کی آبادی ہے، مگر کمین کہیں انصار کے گھرانے کے چشم و چراغ بھی چمکتے ہیں، اسلام کا یہ معجزہ بھی کیا کم ہے کہ اس کے قدم سے نہ صرف ہندوستان کا ظلمتکدہ بقعہ نور بنا، بلکہ رام و کرشن کے پہلو بہ پہلو پیش وادس و خزر ج کے نو بہل بھی جلوہ آرا ہوئے اور نسل و وطن کا اختلاف کلمہ تو کی دوستی سے وحدت کے رنگ میں نمایاں ہو گیا،

مولانا امین اللہ | نگر نمسہ میں شیوخ انصار میں سے مشہور صحابی حضرت ابو وڈا انصاری کا ایک خاندان آباد ہے، بارہویں صدی ہجری میں اس خاندان کی یادگار حضرت مولانا امین اللہ رحمہ اللہ کی ذات بابرکات تھی، اس صدی کے مجدد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کون واقف نہیں، اُن کے فیوض و برکات کے چمٹے ملک کے گوشہ گوشہ کو سیراب کر رہے تھے، حضرت مولانا امین اللہ عظیم آبادی نے بھی حضرت شاہ صاحب ہی سے فیض پایا، اور اُن کے تلمذ کی نسبت سے سر بلند حاصل کی، یہ اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے، میرزا ہد اور مسلم الثبوت پر حاشیہ لکھے، اور آیہ کریمہ فی القصاص حیوۃ کی تفسیر لکھی، اور فارسی میں قصیدہ علمی کے نام سے

ایک عجیب و غریب قصیدہ لکھا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کو ولادت سے وفات تک مع غزوات کے نظم فرمایا اور فارسی دیوان بھی الگ ترتیب دیا۔ یہ مشہور شعران ہی کے قصیدہ عظمیٰ کا ہے،

مخدرات سراپردہاے قرآنی چہ دلبند کہ دل می برند نہانی

مولنا علیم الدین حسین | اسی خانوادے کے دوسرے بزرگ مولنا علیم الدین حسین ہیں، جو مولانا امین اللہ صاحب کے بھائی کے پوتے تھے، یہ بھی مشاہیر عہد سے تھے، مفتی صدر الدین خان دہلوی مولنا نعمت اللہ صاحب لکھنوی اور مولنا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، متعدد کتب رسائل ان کی یادگار ہیں، منجملہ ان کے سلم الاخلاق اور طلاق ثلاثہ کی بحث میں فیصلہ تعلیم اور تفسیر سورہ بقرہ معروف ہیں،

مولف | مولنا علیم الدین حسین کے حقیقی بھائی مولوی واعظ الدین حسین تھے، جن کے جنازہ ہمارے مخدوم جناب نصیر الدین حسین نصیر بیہ سٹریٹ لا اس چھوٹے سے منظوم رسالہ کے مصنف ہیں، آج سے شاید پینتیس برس پہلے جب راقم کو عمر میں پہلی دفعہ دیہات (دینہ) سے نکال کر چلواری شریف میں پڑھنے کی غرض سے پٹنہ لایا گیا، تو اس وقت میرے چھوٹے چچا (مولوی سید ابوالوسف صاحب مرحوم) ان ہی کے ساتھ رہتے تھے اس تعلق سے میں بھی وہیں اترا، اس وقت شاید میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی، میں نے مولف موصوف کو اسی زمانہ میں دیکھا اور اس زمانہ سے ان کے شوق شعر و سخن اور تعلیم کیساتھ پرانے آداب اخلاق اور بزرگوں کی پرانی باتوں کے ساتھ ان کی عقیدت یاد ہو

ان کی پیدائش ۱۰۶۲ھ میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغل پورہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی مولانا عظیم الدین حسین اور فارسی علی بابا تبریزی سے پڑھی، شعر و سخن کا مذاق ان ہی بزرگوں کی صحبت میں ان کو حاصل ہوا، پہلے فارسی میں پھر اردو میں غزلیں کہیں شروع میں اردو غزلیں حکیم آغا حسن صاحب ازل لکھنوی شاگرد میر وزیر علی صاحب کو دیکھیں، اس کے بعد نواب مرزا خان داغ دہلوی سے اصلاحیں لیں،

مسلمانوں میں اس وقت انگریزی تعلیم کا آغاز تھا، اور شریف گھرانوں میں اس کا رواج بھی بہت کم تھا، تاہم انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی، اور کلکتہ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد ولایت گئے، اور وہاں سے ۱۲۹۵ھ میں بیرسٹری کی سند حاصل کی، اور واپس آکر پہلے بانی پور پٹنہ میں اور بعد ازیں دوسرے مقامات میں پریکٹس کی، ۱۹۱۶ء سے پٹنہ ہائیکورٹ میں کمشنر آف اوٹس مقرر ہوئے، اور آج تک اس خدمت پر ہیں،

ان حالات کے باوجود خاندانی مشرقی علمی ذوق، شعر و سخن کا تعلق اور مذہبی جذبات کی وارفتگی ہمیشہ قائم رہی، سب سے پہلے ۱۳۱۵ھ میں ذکر النبی کے نام سے نئے انداز میں اردو کی مجلسوں کے لئے ایک المانہ کتاب لکھی جو اس زمانہ میں بہت پسند کی گئی تھی، ان کا ایک فارسی اور ایک اردو کا دیوان مرتب اور طبع کا منتظر ہے،

لیکن ان سب سے ماورا مجھے ان کا ایک منتظر اب تک یاد ہے، اور اس کی روحانی لذت اب تک میرے دل کے کام و دہن میں ہے، ۱۲۹۵ھ میں ۱۹۱۵ء تک مدوۃ العیاد کا کامیاب اجلاس، جسٹس مولوی سید شرف الدین صاحب (بیرسٹر پٹنہ، ونچ کلکتہ ہائیکورٹ)

کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا، یہ پہلا اجلاس تھا جس میں عمامے اور ہیٹ کچا ہوئے تھے،
 مسٹر حسن امام و سید علی امام و سر شیخ عبدالقادر (لاہور) اور دوسرے ارکانِ تعلیم جدید علی
 کرام اور مشائخِ عظام کے پہلو پہ پہلو آکر بیٹھے تھے، اور ملتِ مرحوم کے چارہ کار پر غور و فکر
 کے لمحے صرف ہو رہے تھے، اس وقت مخدوم املتہ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلوار
 اطال انڈر بقاہ نے اس قدیم و جدید کی یکجائی پر یہ ترانہ شکر پڑھاتھا،

بند الخیر میان من و اوصح قناد
 حور یان رقص کنان نعومتانہ

اس آواز پر سارا مجمع مست ہو گیا تھا، میرا اس وقت آغازِ ہوش تھا، ہنوز ندوۃ اہلبا
 کی درس گاہ میں بھی نہیں گیا تھا، مگر چونکہ میرے بہت سے اعزہ اس اجلاس کی کامیابی کی کو
 میں شریک تھے، اس لئے میں بھی ایک طفلِ تماشانگہ کی حیثیت سے اس میں شریک تھا، اب
 یہ تھا کہ سامنے تقریباً ڈیڑھ دو سو علمائے ربانین اور مشائخِ مقدسین کی صفین تھیں کہ ناگاہ
 ایک کوٹ تپلون اور ہیٹ میں ملبوس پیکر اسٹیج پر آتا ہے، ابھی اسکی زبان سے چند فقرے
 نکلنے پاتے ہیں کہ مجمع وارفتہ ہو جاتا ہے، خود خطیب کے دل کا جوش و خروش تاثیر کا ایک
 عالم بن کر مجلس پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ صدر سے لیکر پائین تک آہ و شیون اور گریہ و
 کے سوا کچھ اور نہ دکھائی دیتا، نہ سائی دیتا تھا، اس فرنگی شکل کے اسلامی دل کی کیفیت
 تھی کہ خود رو رہا تھا، اور ہزاروں کورولار ہاتھ، بڑے بڑے جیہ پوشوں کی سپرد وارٹھیاں
 آنسوؤں سے تر تھیں اور ہر طرف سے احنت و آفرین کا آواز بلند تھا، خطیب مذکور
 کے وہ الفاظ آج بھی ۳۲ برس کے بعد میرے کانوں میں گونجتے ہیں اور میری آنکھوں کو آبِ

کرتے ہیں اور ابھی تک مجھے وہ اثر مین ڈوبے ہوئے فقرے یاد ہیں، علماء و مشائخ کے گروہ کی طرف اشارہ کیا کہ ”یہ ہمارے اسلاف کی مٹنے والی صورتیں ہیں، یہ ملک کے طول و عرض سے دین محمد رسول اللہ صلعم کی حفاظت کی خاطر یہاں آئے ہیں، یہ ملت کے بھکاری ہیں اور ملت کیلئے بھیگ مانگنے کو نکلے ہیں، ہم انصار ہیں اور انصار کی اولاد ہیں، کون ہی جو ہماجرین کی امداد کو اٹھاتا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت چند دن کا یہ عالم تھا کہ گویا ہر طرف سے روپیے، گھڑیاں، انگوٹھیاں، ہمارے، کپڑے اور زیور برس رہے تھے اور کسی کو لینے دینے کا ہوش نہ تھا، خود خطیب کی روتے روتے بچکیاں بندھ گئی تھیں، اور ایک قمیض اور ایک پتلون کے سوا جو کچھ تھا وہ اتار کر سامنے ڈال چکا تھا، جن آنکھوں نے وہ منظر دیکھا ہے اس پر اثر کیف کی یاد آج بھی ان کو پر غم کر دیتی ہے، آہ !

آہِ سحرِ زسیۃِ خارے اذنا لہ بوسیعہ وادہم خوشتر

یہ خطیب اسی ثنوی کے مصنف مسٹر نصیر الدین حین بیرسٹریٹ لائے، موصوف کو شعر و شاعری کا عشق ہمیشہ سے رہا، حالانکہ ان کے مشاغل کو اس فن سے ایک نوع کی بیگانگی ہوتا تھا، طبعی ذوق ماحول پر حاوی ہی پیش نظر ثنوی ۱۹۱۹ء میں انھوں نے لکھی تھی مگر اس کے بعد ان کے فرزند و بلند کی مفقود اخیر و غیرہ کے ایسے مصائب ان کو پیش آئے کہ یہ اوراق طاق نیاں پر دھرے رہے، اب دو برس ہوئے کہ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اسکو دوبارہ دیکھ کر مرتب کیا، اور اب اس سال ۱۹۵۹ء میں چھپ کر منظر عام پر آتی ہے، ثنوی آجکل جب شاعری صرف غزل گوئی کا نام رہ گیا ہے اور دوسرے اصناف سخن تقریباً

ناپید ہو چکے ہیں، یہ مثنوی اس عہد میں بالکل نئی چیز سمجھی جا چکی، شاعر نے اس میں شاعری کی حقیقت، مختلف ملکوں میں اس کے اثرات اور تاریخ، مختلف قوموں کی شاعریوں کی خصوصیات دکھائی ہیں، تفصیل کیساتھ اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے، اور ایک ایک دودو شعر میں اکابر شعراء اردو کے فضل و کمال کی داد دی ہے، اور ان کے خصوصیات بتائے ہیں، ان کو پڑھنے سے یہ معلوم ہو گا کہ ہمارے مؤلف شاعر کی نظر اردو شعراء کے کلام و خصوصیات پر کتنی عمیق ہے اور آج یہ شرفیت کا وہی جو ہر ہے جو انگریزی یونیورسٹیوں کی چار دیواریوں میں مفقود ہے، مثنوی گو دو مصرعوں میں پوری ہو جاتی ہے مگر ہر شعر میں قانون کی جو سختی ہے وہ اکثر واقعیت میں ہالچ ہوتی ہے، اس بنا پر ضرورت ہے کہ ان کی پابندی کی سختی کچھ کم کر دی جائے، اس مثنوی میں بھی ممکن ہے کہ کمین کمین اہل فن نکتہ چینی کریں، مگر یہ قدر پابندی کی عصبیت اب خود چند روز کی گمان ہے، اچھی مثنوی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ خوش سے پاک ہو اور اداسے خیال میں بھرتی کی ضرورت پیش نہ آئے، اس حیثیت سے بھی یہ مثنوی اچھی خاصی سطح رکھتی ہے، لیکن اصلی چیز مثنویت ہے، اور اس حیثیت سے یہ بے مبالغہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی اردو میں پہلی چیز ہے اور اس بنا پر شائقین ترقی اردو کی قدر دانی کی پوری مستحق ہے،

استدراک

ص ۳۱۶ شوربا کی اصل میں نے عربی شربہ ریپنے کی چیز بتائی ہے، مگر بجائے
فاضل دوست ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بڑی قابلیت سے معارف میں یہ تحقیق فرمائی
کہ شوربا فارسی لفظ ترکیبی ہے، شوربکین اور باپرائی فارسی میں کھانے کو کہتے تھے، چنانچہ اسی سے ہمارے
زبان میں شکنبہ، بادرچی، نان بائی وغیرہ لفظ ہیں جن میں باکا جزاں ہی معنوں میں ہے
ص ۳۱۹ شاگرد یعنی شاہی خدام کی اصل مولانا شروانی شاہ گرد بتاتے ہیں، یعنی
جو لوگ بادشاہ کے ارد گرد رہتے ہوں،

ص ۳۲۱ متری کے لفظ کو ڈاکٹر صاحب عربی کے بجائے پرتگالی فرماتے ہیں
اس کی اصل شکل MISTRE ہے، مگر پرتگالی میں خود بہت سے عربی لفظ ہیں
ص ۳۲۵ سطرالین لفظ اصل اور مثال کی تحقیق میں ہے کہ سرکاری کاغذات کی
اصل دفتر میں رہتی تھی اور نقل و مثال لوگوں کے پاس بھی جاتی تھی، اس کی دلیل
کے لئے اقتباسات کتاب آداب الحرب و الشجاء مبارک شاہ معروف بہ فخرند
شائع کردہ عوبک اینڈ پرنٹین سوسائٹی پنجاب ٹونیوٹری مل (غزنویوں کے عہد کی تصنیف) پیش ہے
”مثال تو قیغ برسانید مذکہ ہرچہ تبجیل تر بیاید“

۳۲۸ قلعی پھیرنا کی جگہ قلعی کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ،
 ۳۲۹ تنخواہ کے معنی "بدن کا چاہنے والا" یہ اسم فاعلی ترکیب کے معنی ہیں ، اگر ہم
 اسم مفعولی ترکیب لین تو اس کے معنی ہونگے "بدن کا چاہا ہوا" جیسے "تنخواہ" کے معنی "کا چاہا"
 ۳۸۹ کی اخیر سطر پر ایک حاشیہ تھا جو غلطی سے رہ گیا ، حاشیہ یہ ہے ،
 اقتباس مکتوب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان ثرانی
 بنام ہمدی مرحوم (دیکھو مکاتیب ہمدی ص ۲۷)

